فردوس

وحشی محمود آبادی



فردوس

وحشی محمود آبادی

قیمت

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ٹیلیفون نمبر ۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمٰن

پرنٹر:۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

انتساب

محترمی سیّد غلام عباس صاحب قبلہ کے نام

جن کی تحریک اور مشورے پر یہ ناول لکھا گیا

مصنف

احوال واقعی

نومبر ۱۹۶۵ء میں لاہور کے زمانہ قیام میں ایک روز معظمی سید غلام عباس صاحب قبلہ سے فردوسیؒ کا ذکر آ گیا۔ موصوف نے مجھ سے فردوسی کے سوانح حیات پر کوئی افسانوی کتاب لکھنے کی فرمائش کی اور اپنی تحقیق کے مطابق بہت سی باتیں نوٹ کرائیں۔ ہندوستان پہونچکر میں نے اس سلسلہ کی کئی کتب کا مطالعہ کیا اور واقعات میں راویوں کا اس قدر اختلاف پایا کہ قوت فیصلہ جواب دینے لگی۔ بالآخر علامہ شبلی کی شعر العجم کو رہبر بنانا پڑا مگر بعض مقامات پر عقل نے علامہ مرحوم کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اس لئے خود فردوسیؒ کی قیادت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور شاہنامہ کے چیدہ چیدہ اشعار سے داستان مرتب کرنا پڑی۔

جہاں تک شاہنامہ کی ابتداء کا تعلق ہے بلا شک و شبہ وہ طوس میں ہوئی۔ ایرانیوں کی وطنیت اور فردوسی کا مذاق سلیم اس کا محرک ہوا۔ آغاز تصنیف کا سال قرائن سے ۳۶۵ ہجری قرار پاتا ہے۔ کیونکہ فردوسی نے اپنے قول کے مطابق اسی سال کی عمر اور ۴۰۰ھ ہجری میں شاہنامہ مکمل کیا۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد
امیدم بیکبارہ برباد شد

فردوسی

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار
کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اور تصنیف میں پینتیس سال صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج
بسے رنج بردم بہ امید گنج

سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی ۳۸۷ھ ہجری میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس کے تخت پر بیٹھتے ہی اس قدر شہرت نہ ہوئی ہوگی کہ فردوسی غزنی کا عازم ہو جاتا دو چار سال بعد جب جود و سخا کا آوازہ گونجا تو فردوسی نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ اس لئے فردوسی کی طوس سے روانگی ۳۹۰ھ ہجری یا اس کے بعد ہوتی ہے اور شاہنامہ مکمل ہونے کے فوری بعد اس نے غزنی کو چھوڑ دیا لہٰذا اس کا زمانہ قیام دس سال سے زائد سمجھ میں نہیں آتا۔

واقعات کے بارے میں نتیجہ اخذ کر کے قلم اٹھایا تو یہ دشواری سامنے آئی کہ انسانی کردار اس انداز سے کھپائے جائیں کہ حقائق مسخ نہ ہونے پائیں۔ اس ضمن میں میں نے جتنی احتیاط کی ہے اسکا اندازہ تاریخ داں حضرات کر سکیں گے۔

وحشی محمود آبادی

باب (۱)

حکیم ابوالقاسم فردوسی

نوشابہ جوانی کی نیند سو رہی تھی مومی شمعوں کی خنک اور مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں پیشانی پر منتشر تھیں جس سے سرخ و سفید رخساروں کا نکھار دوناہو گیا تھا۔ نیند کی غفلت میں ایک بار اس نے سوتے سوتے انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر پلنگ کی پٹی پر آرہی اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹک گیا مگر وہ اسی عالم میں سوتی رہی۔

فردوسی ایک مصرعہ پر مصرعہ لگا رہا تھا۔ اس کی نظر پڑ گئی۔ سرعت کے ساتھ وہ اٹھا اور پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ نوشابہ کا چہرہ منتشر بالوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔

فردوسی حسن خوابیدہ کا یہ منظر دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور رفیقۂ حیات کے لئے اس کے دل میں محبت کا جوار بھاٹا آنے لگا۔ ایک ہاتھ سے اس نے کروٹ سے لیٹی ہوئی نوشابہ کو سیدھا کر دیا۔ لٹکے ہوئے ہاتھ کو پلنگ پر اٹھا کر رکھ دیا اور منہ پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹانے

لگا۔ نوشابہ کی آنکھ کھل گئی۔ شوہر کو دیکھ کر خمار آلود آنکھوں کو اس نے بند کر لیا اور "اونہہ" کر کے منہ تکیہ میں چھپالیا۔ فردوسی اس وقت جی بھر کر نوشابہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر اس کے منہ کو سیدھا کر دیا اور نوشابہ جمائیاں لیتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا اور نوشابہ نے فردوسی کی بیباک نگاہی پر حیا سے گردن جھکالی۔ پھر کہنے لگی۔

"نیند نہیں آئی آپ کو ـــــ؟"

"نہیں ایک غزل کہہ رہا تھا۔ اسی دھن میں جاگتا رہا۔" فردوسی نے نہیں کو گردن ہلا کر اور باقی الفاظ کو لبوں سے ادا کیا اور اسی تسلسل میں بولا۔" اس وقت کچھ سننے کو جی چاہتا ہے۔ سناؤگی ـــــ؟"

نوشابہ نے اس کا جواب آنکھوں کو گردش دے کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے کب اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی ہے فردوسی محبوب بیوی کا اثباتی جواب پا کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اور نوشابہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے کھڑی ہوگئی تاکہ طبیعت کا کسل دور کر کے شوہر کی فرمائش پوری کر سکے۔

فردوسی کا نام حکیم منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ تھا اور کنیت ابوالقاسم ہوئی۔ "طوس" کے نواح میں "شاداب" نامی موضع میں جاگیر تھی اور یہی مقام فردوسی کا مولد تھا مگر وہ زیادہ تر طوس میں رہتا۔ یہاں بھی ایک آبائی مکان موجود تھا اور ان دنوں وہ طوس ہی میں مقیم تھا۔ جس سے تھوڑے فاصلہ پر اس کا ایک باغ بھی تھا جو باغِ فردوس کہلاتا۔ فردوسی طوس کے زمانۂ قیام میں اکثر نوشابہ کے ساتھ اس باغ کی تفریح کو جاتا اور وہاں نوشابہ کا گانا سنا کرتا۔

نوشابہ فردوسی کی جواں سال رفیقۂ حیات تھی. میاں بیوی میں اتنی محبت تھی کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتا. فردوسی اگر نوشابہ کو چاہتا تو بادی النظر میں اس کا سبب یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ نوشابہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کو نہ چاہنا فردوسی کے بس کی بات نہ تھی. لیکن نوشابہ کے لئے فردوسی پر پروانہ وار فدا ہونے کی کوئی ظاہری وجہ نہ تھی. فردوسی کوئی غیر معمولی خوبصورت نہ تھا عام جوانوں کی طرح کا ایک جوان تھا لہذا نوشابہ کی محبت کو دل سے دل کو راہ ہونے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا. وجہ جو کچھ بھی ہوں مگر حقیقت یہ تھی کہ زن و شوہر ایک تمثیلی زندگی گذار رہے تھے. اور ان کے درمیان ایک جنونی محبت کا رشتہ تھا جو روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا تھا.

نوشابہ صرف خوبصورت ہی نہ تھی. فطرت سے اس نے ایک سریلا گلو بھی پایا تھا اور چنگ بجانے میں تو ایسا ملکہ رکھتی کہ سماں باندھ دیتی. فردوسی گاہے گاہے اس کے کمال سے حظ اٹھاتا اور اکثر اوقات اس کے گانے پر اس قدر بیخود ہو جاتا کہ آنکھیں نم ہو جاتیں نوشابہ کے اس وصف نے اس کو فردوسی کی نگاہ میں اور عزیز بنا دیا تھا. چنانچہ اس رات کو بھی جب رگوں میں پیار و اخلاص کی انگڑائیاں محسوس ہونے لگیں تو فردوسی نے محبوبہ سے گانے کی درخواست کر دی اور نوشابہ چنگ لے کر اس کے قریب آ بیٹھی

فردوسی ایک پیدائشی شاعر تھا. شعر و موسیقی سے اس کو فطری لگاؤ تھا چنگ کی نغمہ بار آواز کانوں میں پڑتے ہی دل کے تار بجنے لگے. اور وہ نوشابہ کے لبوں سے عشق و محبت کا کوئی راگ سننے کا منتظر ہو گیا. مگر نوشابہ نے غزل گانے کے بجائے دقیقی کے رزمیہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے.

فردوسی

اس نامور بادشاہ کا کیا کہنا
جس کی دختر کا نام ناہید تھا
— اور جس کے بطن سے دو بیٹے
چاند اور سورج کی طرح خوبصورت پیدا ہوئے
ایک ان میں کا اسفندیار نامور تھا
جو میداں کا شیر اور رزمگاہ کا شہسوار تھا
دوسرے تیغ آزما کا نام پشوتن تھا
جس کے نام کی دہشت سے فوجیں شکست کھا جاتیں
زردشت جسکی بدولت اس قدر نیک نام ہوا
اور جس نے پشوتن کا نام لے کر
بدباطن اہرمن کو قتل کر دیا

فردوسی ایک تحیر کے عالم میں تھا۔ نوشابہ لہرلے لے کر گا رہی تھی اور فردوسی کی رگوں میں تموج کی کیفیت پیدا تھی۔ نوشابہ نے ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھ کر چنگ رکھ دیا اور شوہر کا منہ تکنے لگی۔ فردوسی ایک عالم خود فراموشی میں بیٹھا ہوا تھا۔ نوشابہ نے چند منٹ ساکت رہ کر کہا "کاش آپ بھی غزل کہنے کے بجائے ایسے ہی اشعار نظم کرتے ——!"

فردوسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور نوشابہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں بہت دنوں سے ارادہ کر رہی تھی کہ آپ سے کہوں" فردوسی ہمہ تن متوجہ تھا لہٰذا نوشابہ نے بات پوری کر دی "دقیقی نے جس کام کو شروع کیا تھا۔ آپ اس کو

مکمل کر دیں۔"

فردوسی پھر بھی خاموش رہا۔ نفی یا اثبات میں کچھ کہہ نہ سکا۔ نوشابہ نے اپنی بات کا جواب طلب کیا۔

"تو بتایا نہیں آپ نے کہ میری یہ تمنا پوری ہوگی ——— ؟"

"ضرور پوری ہوگی میری نوشابہ" فردوسی نے غیرارادی طور پر کہہ دیا۔ نوشابہ کی آنکھوں میں نسائیت کا غرور پیدا ہو گیا۔ اور فردوسی نے فرطِ محبت میں نوشابہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

نوشابہ تھوڑی دیر بعد سو گئی۔ فردوسی جاگتا رہا۔ ایران کی تاریخ اور جدا تا مرگ دقیقی حافظہ میں گشت کرتا رہا۔ اور گھنٹوں کے بعد اس کو نیند آسکی۔

دقیقی کا نام منصور بن احمد تھا وہ سامانی حکومت کے پایہ تخت بخارا کا رہنے والا تھا اور فرمانروائے بخارا کا درباری شاعر تھا جہاں تک خاندان سامانیہ کا تعلق ہے۔ ان کا عروج ایک سو تیس برس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مگر اس مختصر سے وقفہ میں ایرانی ادب اور تمدن پر وہ اس قدر احسانات کر گئے جن کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ——— سامانی خاندان کی بنیاد خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں پڑی۔ احمد بن سامان کو مامون کے تقرب کی عزت حاصل ہوگئی۔ اور اس کے لڑکے اطراف و جوانب میں عاملوں کے عہدوں پر مقرر کر دئیے گئے۔ جن کا سلسلہ چلتا رہا اور ۲۶۱ھ ہجری میں نصر بن احمد بن نوح بن اسد کے انتقال پر اس کے بھائی اسمٰعیل نے ایک مستقل سلطنت کی داغ بیل ڈال دی جو اولی العزم حکمرانوں کی فیاضیوں سے پھولتی پھلتی رہی۔ اسمٰعیل کی نسل میں نوح بن منصور سامانی چھٹا تاجدار تھا۔ جس نے دقیقی کو ایران کی تاریخ نظم کرنے پر مامور کیا تھا۔

دقیقی یا فردوسی کے زمانے میں ایران کی حالت اور ایرانیوں کے رجحانات کے بارے میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت دقیقی کے متعلق لکھنا ہے کہ اس نے فرمانروائے بخارا کی فرمائش پر ایک تاریخی نظم لکھنا شروع کی تھی جس کا نام "شاہنامہ" تھا اور جس کی ابتداء ۳۶۵ھ ہجری میں ہوئی تھی مگر وہ ایکہزار شعر کہہ سکا ہوگا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں عین عالم شباب میں قتل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ گیا تھا اس کی مقبولیت اس کی زندگی ہی میں کچھ کم نہیں ہوئی۔ اور مرنے کے بعد تو یہ عالم تھا کہ نوشابہ نے جان بوجھ کر اس کے اشعار چنگ پر فردوسی کو سنائے تھے تاکہ نامراد شباب دقیقی کے ادھورے کام کو پورا کرنے کے لئے شوہر کو مجبور کر سکے۔

فردوسی کو تمام حالات کا علم تھا۔ نوشابہ کے توجہ دلانے پر یاد تازہ ہوگئی اور وہ صحیفہ ماضی کی ورق گردانی کرنے لگا۔ گھنٹوں خیالات میں مستغرق رہا اور سویا تو وہی مناظر خواب میں دکھائی دئے۔ دقیقی عالم رویا میں نظر آیا۔ اس نے بھی نوشابہ کے الفاظ کا اعادہ کیا اور وعدہ لیا کہ وہ اس کی خدمات کو پس پشت پڑنے نہ دے گا۔ فردوسی اس سے کچھ تفصیل پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر دقیقی یکایک نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور فردوسی اس کو پکارتا ہوا اسی طرف دوڑنے لگا۔ جس سمت کو دقیقی گیا تھا۔ لیکن دقیقی تو ہاتھ نہ آیا۔ البتہ فردوسی کی آنکھ کھل گئی۔ اسی واقعہ کو اس نے شاعرانہ انداز میں شاہنامہ میں بیان کیا ہے

فردوسی خواب سے بیدار ہوا تو مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ نوشابہ اس کا شانہ پکڑ کر بیدار کر رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ اس کو کیا ہو گیا؟ فردوسی نے خواب کی کیفیت بیان کر دی۔ نوشابہ کے چہرے پر ایک حسین مسکراہٹ کھیلنے لگی وہ مسرور ہو گئی کہ جس بات کی خواہش اس نے اپنے طور پر کی تھی۔ خود دقیقی نے اسکی

تائید کردی. نوشابہ کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا منشاء پورا ہو جائے گا. زوجیت کے فخر کے ساتھ اس نے فردوسی پر ایک نظر ڈالی اور خراماں چلی گئی

فردوسی پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور نوشابہ و دقیقی کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

باب (۲)

شاہنامہ کا سنگ بنیاد

اسلامی اقتدار کے بعد سے ایران کی قسمت مسلمانوں کے عروج و زوال سے وابستہ ہو گئی۔ اور عرب و عراق میں جتنے انقلابات آئے۔ ایران پر ان سب کا اثر پڑا۔ بغداد کی عباسی خلافت جب کچھ کمزور پڑ گئی تو ایران کے حصے بخرے ہو گئے اور صوبہ خراساں سامانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۳۶۵ھ ہجری میں جب نوح بن منصور نے دقیقی کو شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا تو ابوالحسن بن ابراہیم سمجوری خراساں کا گورنر اور منصور بن محمد المعروف بہ محمد شکری عامل طوس تھا۔

آتش کدہ ایران گل ہو چکا تھا۔ ملک کا گوشہ گوشہ اسلام کی ضیا باری سے روشن تھا باشندوں کی اکثریت گو کہ تاجدار کی حلقہ بگوش تھی مگر ایرانی نسل کا ہر متنفس بلا استثنائے مذہب و ملت اپنے تمدن کو عزیز سمجھ رہا تھا۔ اس خیال میں گبر و یہود۔ کافراد مسلمان ایک سطح پر تھے اور اسلاف کے کارناموں کے تجسس و تحقیق میں یکساں غور و فکر کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ بخارا کے سامانی حکمراں بھی اس جذبے سے خالی نہ تھے۔ ایک طرف تو ان کی داد و دہش سے فارسی شاعری پروان چڑھ رہی تھی۔ نصر بن احمد کے دور میں تیسری صدی ہجری کے آخری ایام میں نابینا شاعر جعفر رودکی ملک الشعراء کا تاج پہن چکا تھا اور اولیت کا شہرہ حاصل کر کے فارسی کا باوا آدم بن چکا تھا۔ اس کے بعد اس کے

جانشینوں کے زمانے میں اسی طرح ادب نوازی ہوتی رہی۔ دوسری طرف ملک کی تاریخ کی ترتیب پر توجہ دی جارہی تھی ـــــــ نوشیرواں نے اپنے زمانے میں اطراف و دیار میں قاصد بھیجکر وہ تاریخی ذخیرے جمع کرائے تھے جنھیں یزدگرد نے مدائن کے ایک عالم و فاضل رئیس، دانشور دہقان سے ترتیب دلایا تھا جو پہلوی زبان میں تھا۔ جس کو فراہم کرکے ابو منصور بن عبدالرزاق عامل خراساں نے ۳۴۶ ہجری میں بزبان فارسی ترجمہ کرایا۔ اور یہی نسخہ دقیقی کو نظم کرنے کے لئے دیا گیا۔ اس کے مترجم تاج بن خراسانی ہروی، یزداں داد شاپور سیستانی ماہوی بن خورشید نیشاپوری اور سلیمان طوسی تھے اور اس میں کیومرث سے لے کر خسرو پرویز تک کے حالات درج تھے۔

دقیقی کے قتل کے بعد نوشابہ کی تحریک پر فردوسی نے جب شاہنامہ کی تکمیل کا ارادہ کیا تو اس کو معتبر اور قابل یقین تاریخ کی فکر ہوئی فردوسی ایک معتبر خاندان کا فرد اور باعزت جاگیردار تھا۔ اس کے سوا ایک اہل علم اور شاعر کی حیثیت سے معروف بھی عوام و خواص اس کے شناسا اور مرتبہ داں تھے اور محمد لشکری تو ان لوگوں میں تھا جس سے اس کے خصوصی تعلقات تھے اپنے اس عزم کا اظہار اس نے سب سے پہلے محمد لشکری سے کیا۔ محمد لشکری نے ابو منصور کے ترجمہ کی ایک نقل اس کو فراہم کرادی مگر اس سے فردوسی کا اطمینان نہ ہوسکا اور وہ مزید جستجو کرتا رہا۔

نوشابہ ایک ساسانی نسل کی عورت تھی جس کے خاندان کی ایک شاخ اب تک آتش پرستی کے مسلک پر قائم تھی وہ ان لوگوں سے ملی اور انھوں نے سام نریمان کی اولاد میں ایک بوڑھے کا نام لیا کہ اس کو روایتی طور پر بہت سے واقعات معلوم ہیں۔ مگر اس کا مسکن ہرات میں بتایا گیا۔ فردوسی کو مشاہیر فارس کے کارناموں کی تحقیق کا جنون سوار

ہوچکا تھا۔ زادِ راہ کے لئے اس نے جائداد کا ایک حصہ فروخت کیا اور نوشابہ کو طوس میں اپنی پہلی بیوی کے لڑکے قاسم پر چھوڑ کر عازم سفر ہوگیا۔

تاریخی تحقیق کے سودائی نے صرف ہرات و بلخ پر اکتفا نہ کی بلکہ جہاں جہاں کچھ معلومات ہو جانے کا پتہ چلا وہاں پہنچ گیا اور سال ڈیڑھ سال کے بعد طوس کو واپس ہوا تو اس کے پاس شاہنامے کا پورا مواد یکجا ہوچکا تھا۔

نوشابہ کو بہت مسرت تھی اس کا محبوب شوہر اس مہتم بالشان کام کو شروع کرنے جارہا تھا جس سے نہ صرف شہرت عام حاصل ہونے کی توقع تھی بلکہ ملک و قوم کو بقائے دوام ملنے کا امکان بھی تھا۔

دور دراز سفر کے مصارف نے فردوسی کو مقروض کردیا تھا۔ اس لئے اس نے جاگیر کا ایک حصہ اور بیع کر ڈالا۔ قرض ادا کرکے جو رقم بچی اس کو گھریلو مصارف کے لئے نوشابہ کے سپرد کر دیا اور شاہنامے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

فردوسی ایک کامیاب غزل گو تھا اس کا سن پینتالیس سال کے اوپر تھا اور عمر کا ایک بیش قیمت حصہ حصول علم اور مشق سخن میں صرف کرچکا تھا۔ شاعری کا آوازہ طوس اور خراساں سے گذر کر وسط ایشیا تک پہنچ چکا تھا اور مقامی طور پر اس کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا۔ بہت سے امیرزادے اس کے مربی اور مخلص دوست تھے۔ جن میں حسین قتیبہ، علی دیلم اور بودلف کے نام پیش پیش ہیں ان سب نے اس کار عظیم کے لئے فردوسی کی ہمت بندھائی۔ اور غالباً ۳۶۵ء تا ۳۷۰ء ہجری میں فردوسی نے شاہنامہ کا آغاز کر دیا جبکہ الپتگین کا غلام سبکتگین غزنی میں استعداد کے جوہر دکھا رہا تھا اور اس کے نامور فرزند محمود کی اٹھتی جوانی تھی مگر بچے کے پیر پالنے میں دیکھے جاتے ہیں۔ سامانی تاجدار

نوح بن منصور نے اس کی شجاعت سے متاثر ہو کر سیف الدولہ کا خطاب عطا کر دیا تھا۔

فردوسی کی ساری توجہ بزم سے رزم کی طرف منتقل ہو گئی۔ چند ہی روز میں اسکو محسوس ہونے لگا کہ وہ رزمیہ شاعری ہی کے لئے پیدا ہوا تھا اور پچھلی عمر اس نے ایک کار بے سود میں گنوائی تھی۔ دن بھر میں وہ جتنے شعر کہتا، شب میں نوشابہ سے چنگ پر سنتا اور اس میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو جاتا۔ شب در روز میں کسی وقت اس کے مقربین یکجا ہو جاتے اور وہ تازہ کہے ہوئے اشعار ان کو سنا دیتا۔ علی ویلم کو خوشنویسی میں مہارت تامہ حاصل تھی اس نے شاہنامہ کو صاف کرنے کا کام اپنے ذمے لیا اور اس کو کتابی صورت میں ترتیب دینے لگا۔ بودلف ایک رئیس تھا مگر فردوسی کا بہت عقیدتمند وہ فردوسی کے اشعار سنکر فی الفور یاد کر لیتا اور اپنے مقام پر پہنچکر حاشیہ نشینوں کو سناتا جن کے ذریعہ طوس کے گلی کوچوں میں ان کی اشاعت ہو جاتی اس طرح فردوسی جتنے شعر نظم کرتا وہ اس کی زبان پر جاری ہوتے ہی چھپ جاتے اور تحسین و آفریں کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگتیں جو اسپ تازی پر تازیانے کا کام دیتیں، اور اس کا جذبہ قدم قدم پر بڑھتا جاتا۔

نوشابہ کی ہمت افزائی بھی فردوسی کے لئے بڑا سہارا تھی۔ فرض شناس رفیقۂ حیات ملک و قوم کی خدمت میں مخل نہ ہوتی بلکہ اگر کسی وقت فردوسی خود بلا کر بٹھاتا تو وہ جنسی اور جذباتی باتوں کے بجائے حیرت انگیز موضوع چھیڑ دیتی اور گھریلو ماحول بھی شاہنامہ کے لئے سازگار ہو جاتا۔

اُسی زمانے میں نوشابہ کو اپنے جسم میں ایک تغیر کا احساس ہوا، اور تجربہ کار خود تو نے اس کا باؤں بھاری بتایا۔ تنہائی کی ایک نشست میں نوشابہ نے لٹائیت کہا

کے ساتھ فردوسی سے ذکر کیا۔ فردوسی کے لئے یہ خبر انتہائی مسرت بخش تھی۔ اس کا دل کھل اٹھا۔ شریک زندگی کو اس نے مبارک باد دی اور تھوڑی دیر کے لئے اس کو نوشابہ اور اس کی محبت کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔

شاہنامہ پر فردوسی کا شغف روز افزوں تھا۔ نوشابہ کے ہاں بچہ ہونے کے دن قریب تھے۔ فردوسی کا مکان صرف چار نفوس سے آباد تھا۔ نوشابہ اس کی کنیز نجود فردوسی اور اس کا جوان بیٹا قاسم۔ ان میں فردوسی کا وجود شمار کئے جانے کے لائق نہ تھا وہ شاہنامہ کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ بہت کم باہر نکلتا۔ گھر میں بھی بات چیت میں زیادہ وقت برباد نہ کرتا۔ باغ فردوس کی تفریح بھی قریب قریب ترک ہو گئی تھی صرف ملنے جلنے کے لئے آنے جانے والوں میں جو ساعتیں صرف ہوتیں ان سے تو وہ مجبور تھا۔ باقی وقت شاہنامہ کے مصنف نے اپنی قومی نظم کو دے رکھا تھا۔ گھریلو ذمہ داری کلیۃً نوشابہ کے سر تھی جس وقت تک اس کو بالکل معذوری نہ ہوگئی اس نے فردوسی کو تکلیف نہ دی۔ لیکن جب نوشابہ کی گود ننھے منے بچے سے پُر ہوگئی، تو چند روز کے لئے فردوسی پر خانہ داری کا بوجھ آپڑا۔ لیکن وہ ایک شاعر کا مکمل کردار بن چکا تھا۔ اس نے اپنے فرائض کنیز پر ڈال دیئے اور شعر گوئی کے معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ قاسم زیادہ تر شاداب میں رہتا کیونکہ فردوسی نے جاگیر کی ذمہ داری اسی کے سر ڈال دی تھی۔

نوشابہ کے خوبصورت بچے نے ابو القاسم فردوسی کے گھر کی رونق بڑھا دی تھی خاموش اور ساکت فضا میں معصوم بچے کی کلکاریاں فردوسی کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کر لیتیں اور محبت پدری رگوں میں انگڑائیاں لینے لگتی۔ لیکن وہ لمحات سے زیادہ وقفہ کے لئے اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ اور پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔

فردوسی نے ورثہ میں اچھی خاصی جاگیر پائی تھی مگر اس کا بڑا حصہ تاریخی تحقیق اور گھریلو مصارف کی نذر ہو چکا تھا۔ نوشابہ شوہر کی مجبوری کو جانتی لیکن وہ عورت ذات تھی معاشی مشکلات کا علاج کیا کرتی؟ پھر بھی جہاں تک ہو سکتا فردوسی کو متفکر نہ ہونے دیتی اور جب کوئی چارہ کار نہ رہتا تو اس انداز سے ذکر کرتی کہ فردوسی زیادہ پریشان نہ ہو۔ فردوسی کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہوتا خیالات کی روانی رک جاتی مگر اس مسئلہ میں بھی وہ زیادہ دیر نہ الجھتا۔ نوشابہ کو کچھ نہ کچھ کہہ کر ٹال دیتا۔ آخر ایک روز اس نے باقی جائداد کو بھی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا حسین قتیب کو اطلاع ہو گئی۔ اس نے فردوسی کو آکر روکا اور فی الفور جو کچھ ممکن تھا حاضر کر دیا۔ آہستہ آہستہ محمد لشکری علی دیلم اور بودلف اس کے تمام ہمدرد اقتصادی کمزوری سے واقف ہو گئے۔ اور ہر شخص بقدر استطاعت پیش کش کرنے لگا۔ مگر یہ اعانت فردوسی کا افلاس دور کرنے کے انداز پر نہ ہوتی بلکہ صاحبان ثروت کی طرف سے ایک کامل فن کی خدمت میں پر خلوص نذرانہ ہوتا۔ فردوسی کے لئے اس کی قبولیت میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

نوشابہ کی گود کئی بار بھری اور خالی ہو گئی۔ اور بیٹا کبھی کئی برس کا ہو کر ضائع ہو گیا۔ آخری ولادت نرگس کی ہوئی جو بالکل نوشابہ کی ہمشکل تھی۔ فردوسی نے کسی بچہ کی طرف کوئی خاص اعتنا نہ کی تھی مگر نرگس اس کو اس قدر بھلی لگی کہ اس نے دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیا اور چند روز کی جان باپ کے ہاتھوں پر مسکرانے لگی:-

قاسم نرگس سے بہت بڑا تھا اور جوان تھا اسی لئے فردوسی کو زیادہ عزیز ہونا

چاہیے تھا مگر وہ اس کے برعکس فرنگیس کو اور نوشابہ قاسم کو چاہتی کیونکہ فردوسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھا اس لئے نوشابہ دل رکھنے کے لئے اس کا زیادہ خیال کرتی اور فرنگیس نوشابہ کی لڑکی تھی اس لئے ماں کا لحاظ کرکے فردوسی اس کا لاڈ اور پیار کرتا۔ لیکن فردوسی کو شاہنامہ سے اتنی فرصت ہی کب تھی کہ نھی فرنگیس کی طرف توجہ کرتا۔ اگر کسی وقت دماغ فکر کرتے کرتے تھک جاتا تو حسین بیٹی کو آغوش میں لے لیتا اور چوم چاٹ کر چھوڑ دیتا۔ فرنگیس بچپن ہی سے متحمل مزاج اور قانع تھی وہ اسی میں خوش ہو جاتی اور آغوش پدر میں بار بار جانے کی ضد نہ کرتی۔

زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی آفتاب کے گرد دائرے بناتی رہی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا سال پورا ہو گیا حتیٰ کہ فردوسی کو شاہنامہ لکھتے ہوئے پانچ سال گذر گئے۔ قاسم بیس بائیس برس کا اور فرنگیس دو سال کی ہو گئی۔ نوشابہ کی عمر چھبیس سال کی تھی اور وہ کئی بچوں کی ماں بن چکی تھی لیکن فردوسی کی نگاہ میں اس کا نکھار بڑھتا جا رہا تھا اس کا دل نوشابہ کو داد حسن دینے کے لئے بیقرار رہتا مگر وہ اس کے لئے وقت نکال نہ پاتا۔ رات کی تنہائی میں جب نوشابہ خود آ کر بیٹھ جاتی اور اس سے شعر سنانے کی فرمائش کرتی تو چند لمحات محبت کے ضرور آ جاتے۔ فردوسی کی آنکھیں حسین محبوبہ کی آنکھوں سے ٹکرا کر جھپکنے لگتیں۔ جذباتی ماحول پیدا ہو جاتا لیکن فردوسی کو فی الفور وقت کی قیمت کا خیال آ جاتا وہ نوشابہ کی طرف اشعار کا پرچہ بڑھا کر اسے پڑھنے کی فرمائش کر دیتا۔ نوشابہ کرسی کی طرح کھنکنے لگتی اور بیت میں دھڑکنے والے دل ایران کی تاریخ میں کھو جاتے۔

افلاس سے فردوسی کا چولی دامن کا ساتھ رہا تھا اور وہ روز بروز مہربان ہوتا جارہا تھا۔ قاسم کے جوان ہونے کے بعد سے ایک فکر اس کی شادی کی لگ گئی تھی۔ اس دشواری کو بھی اس کے قدردان احباب نے حل کیا اور فردوسی نے قاسم کی شادی کرکے جاگیر اس کے حوالہ کردی جو اس کی بسراوقات کے لئے کافی تھی۔ قاسم باپ سے الگ ہوکر رہنا نہ چاہتا تھا۔ مگر فردوسی کی ضد نے مجبور کردیا وہ شاداب میں اور فردوسی طوس میں رہنے لگا۔

باب ۳

حرماں نصیب محبوبہ

طوس اور خراساں کے در و دیوار سے شاہنامے کی آوازیں آرہی تھیں۔ فردوسی کے اشعار بچے بچے کی زبان پر تھے اور وطن پرست ایرانیوں کے دل فردوسی کے سامنے جھک رہے تھے۔ ابن الاثیر نے شاہنامے کو قرآن العجم لکھا ہے مگر اہل اسلام قرآن کی تلاوت مقررہ اوقات پر کرتے ہیں۔ فردوسی کے اشعار سوتے جاگتے سفر حضر ہر موقع پر پڑھے جاتے۔ بچوں سے بوڑھوں تک سب اس میں یکساں دلچسپی لیتے اس کی کتاب نزول کے ابتدائی ایام سے بلا تخصیص مذہب و ملت ہر ایک کے لئے قابل قبول تھی اور سرزمین فارس کا ہر متنفس بلاتشبیہہ کسی صحیفۂ آسمانی کی طرح اس کی تلاوت کو اپنا فرض سمجھتا رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمانہ آگیا کہ خراساں کا صوبہ شاہنامہ کی شہرت کے لئے تنگ ہوگیا اور عراق، وسط ایشیا میں اس کا آوازہ گونجنے لگا۔ ہندوستان میں صرف میر تقی میر کو یہ شرف ملا کہ جب کوئی شخص دلی سے واپس ہوتا تو اہل وطن کے لئے میر کی غزلیں تحفے کے طور پر لاتا مگر فارس میں میر سے قبل فردوسی کا کلام اس کی نظیر پیش کر چکا تھا۔ شاہنامہ کے اشعار طوس والوں کا طرۂ امتیاز تھے جن کو وہ اپنے بیرونی اعزا اور احباب کو نوادرجان کر بھیجتے اور یا ہر کے لوگ اہالیان

طوس سے اس کی فرمائش بھی کرتے۔

فردوسی شاہنامہ کے دس ہزار شعر نظم کر چکا تھا اور اس کو وہ منزلت حاصل ہو چکی تھی نجیب الدین معبتر نے اس کے باپ کے خواب کی تعبیر میں، جس کی پیشین گوئی کی تھی۔۔۔۔۔

فردوسی کی پیدائش کے بعد ایک شب اس کے باپ فخر الدین احمد نے خواب میں دیکھا کہ ان کا لڑکا منصور کوٹھے پر چڑھا اور فضا میں بلند ہو کر نعرہ زن ہوا۔ اس کے نعرے پر چہار جانب سے لبیک کی صدائیں آنے لگیں۔ باپ ایک جذبے سے بیٹے کو پکارنے لگے اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کی تعبیر معبتر نے یہ دی کہ منصور صاحب کمال ہوگا اور اس کا شہرہ چار دانگ عالم میں گونجے گا۔ منصور فردوسی کا نام اختیار کر کے باپ کے خواب کی تعبیر بن چکا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت خود اس کے لئے منفعت بخش نہ تھی۔ اقتصادی مشکلات چین سے بیٹھنے نہ دیتیں اور شاعر کا دل و دماغ خانگی امور میں الجھنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔

مشرق کے ہر باکمال ادیب اور شاعر کو کسی نہ کسی فرمانروا کے دامن میں پناہ ملتی رہی ہے اور آسائش کی زندگی میسر آئی ہے۔ جس میں اس کو اپنے فن کے جوہر دکھانے کا موقع ملا ہے مگر فردوسی نے قسام ازل سے اتنا کھوٹا مقدر پایا تھا کہ اس کے دور میں کوئی صاحب جود ایسا موجود نہ تھا جو اس کے دامن مراد کو بھر کر کشمکش روزگار سے مستغنی کر دیتا اور شاہنامہ کو وجود میں آنے کے لئے مطمئن دل و دماغ اور آسودہ حال خالق مل جاتا۔ یوں تو کہنے کے لئے بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں لیکن فردوسی کی نگاہ کسی پر نہ جمتی اور وہ کسی دربار میں ایک سائل کی حیثیت سے جانے کو بھی باعث ننگ قرار دیتا۔ قہستان اور طبرستان اور ہرات وغیرہ کے سوا بغداد کا رخ کیا جا سکتا۔ بخارا کا عزم ہو سکتا مگر عباسی خلافت کے بگڑے ہوئے حالات فردوسی کی امید نہ بندھاتے۔ آل سامان کی ادب پروری کی بہار

بن سکتی تھی لیکن سامانی حکومت بھی اپنے آخری دن دیکھ رہی تھی اور اس کے بجائے غزنی میں سبکتگین ایک نئی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر رہا تھا مگر فردوسی کو امور سلطنت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کسی کا بھی زوال ہوتا کوئی بھی عروج پر پہونچتا۔ اس کے لئے یکساں تھا وہ نہ تاج کا خواہاں تھا۔ نہ تخت کا طلبگار اس کو تو اپنے کلام کی قدردانی اور شاہنامہ کی تکمیل کے لئے صرف اطمینان کے دن چاہیئے تھے۔ جن میں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکے۔

فردوسی کے طوس نہ چھوڑنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کو وطن اور اہل وطن سے بہت محبت تھی اور اس کے وطن میں چند شخصیتیں تھیں بھی ایسی جن کا خلوص اس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ وہ دامے درمے سخنے۔ قدمے ہر طرح اس کی شریک تھیں اور انھیں کی بدولت فردوسی کو اب تک کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی تھی۔ لیکن ابھی شاہنامے کے مصنف کو بڑی بڑی آزمائشوں سے گذرنا تھا طوس میں اس کا سب سے بڑا مربی حاکم طوس منصور بن محمد تھا۔ وہ اچانک بیمار ہوا۔ اور چند روز صاحب فراش رہ کر انتقال کر گیا فردوسی کو اس کی موت کا بہت قلق ہوا اتنا قلق کر کئی۔ روز کے لئے شاہنامہ کی تصنیف رک گئی۔ اور فردوسی اس کا مرثیہ نظم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

حسین قتیب اور علی دیلم نے فردوسی کے تاثرات کو محسوس کیا اور یہ رائے قائم کی کہ وہ اس کے اٹھ جانے سے اپنے لئے پریشان ہے انھوں نے اس کو تسلی دی کہ وہ منصور کی کمی کا احساس نہ ہونے دیں گے۔ فردوسی کو ان لوگوں کی یہ بات قطعاً پسند نہ آئی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ منصور کے اخلاص و محبت کے تحت رنجیدہ تھا۔ حسین قتیب کو بات کہنے کے بعد ہی اس کی اہمیت کا احساس ہوا اور وہ فردوسی سے معذرت کرنے

رکا. فردوسی کو اس سے صدمہ پہونچا. مگر اس کا دل آئینہ کی طرح صاف تھا. دوستوں میں اسی وقت صفائی ہوگئی اور مرحوم منصور کی خوبیوں کا ذکر کیا جانے لگا.

طوس چند روز تک بغیر کسی عامل کے رہا. پھر اتفاق سے حسین قتیب کی کوششیں بار آور ہوگئیں اور وہ مقامی حاکم بنا دیا گیا. فردوسی کو اس سے بہت مسرت ہوئی. حسین قتیب پر اس کو منصور سے کم بھروسا نہ تھا. اس نے اپنے کو اس اعتماد کا اہل بھی ثابت کیا اور عامل کے منصب پر فائز ہوتے ہی فردوسی کی مابقی جائداد کی مالگذاری معاف کر دی حسین قتیب کے تقرر نے منصور کی موت کی تلافی کر دی اور فطرت انسانی کا خاصہ بھی ہے کہ زمانے کا بُعد بڑے سے بڑے غم کو غلط کر دیتا ہے. فردوسی کی طبیعت پر بھی منصور کی دائمی مفارقت کے اثرات کم ہوتے رہے. اور وہ پھر پہلے کی طرح شاہنامے میں لگ گیا.

نرگیس نوشابہ کے سایہ عاطفت میں بچپن کی فردوس زندگی گذار رہی تھی ماں اپنی بچی کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی اور حور شمائل نوشابہ کے لئے واقعی مسرت کا موقع بھی تھا اور سب سے زائد خوشی اس بات کی تھی کہ شوہر اسلاف کے کارناموں کو زندہ کرنے کے لئے تن من کی بازی لگائے تھا. دھن جو کچھ تھا وہ پہلے ہی اس کی نذر ہو چکا تھا گنجائش اور ضرورت ہوتی تو اب بھی عذر نہ کرتا اور اسی نے نوشابہ کے لئے ملی فکر پیدا کر دیے تھے مگر وہ ایک باحمیت اور غیور خاتون تھی. زبان سے کبھی کچھ نہ کہتی دل ہی دل میں کڑھا کرتی. اس کے لئے کہنے کا محل بھی نہ تھا. فردوسی اسی کی فرمائش پر شاہنامہ لکھ رہا تھا اور اس کا استغراق نوشابہ کے لئے باعث فخر تھا تاہم وہ ایک عورت کا دل کس طرح اپنے پہلو سے نکال کر پھینک دیتی؟ اس نے دقیقی کے کام کو پورا کرنے کے لئے

کہا تھا یہ تو نہ کہا تھا کہ خانگی فرائض اور دنیا کو تج کر شاہنامے کا ہو رہے مگر اللہ ری ایرانی عورت کی وطنیت! اس نے کسی وقت اپنی تحریک پر تاسف نہ کیا اور نہ شوہر کو اس کار عظیم سے غفلت برتنے پر آمادہ کیا بلکہ جو کچھ گذرا خود جھیلتی رہی اور فردوسی کو گھریلو پریشانیوں سے بچائے رکھا۔

جاگیر کے محاصل کل کے کل قاسم اور اس کی رفیقۂ حیات کے لئے مختص تھے جیسن جیب علی دیتم اور بودلف کے نذرانوں پر نوشابہ کی گذر بسر کا انحصار تھا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس کے لئے سوچنے کی گنجائش تھی۔ لیکن اس نے کبھی حرف شکایت زبان پر آنے نہ دیا اس کے گھر کی آمدنی مقابلتہً زیادہ ہو گئی تھی مگر اتنی کبھی نہیں کہ تمام اخراجات کی کفیل ہو جاتی۔ نوشابہ جب تک تنہا تھی اس وقت اگر کھانے پینے کی تکلیف ہوتی تو اس کے چہرے پر شکن نہ آتی لیکن اب اس کی زندگی میں فرنگیس داخل ہو چکی تھی وہ ایک ذی عزت جاگیردار کی بچی تھی اس کا باپ حکیم ابو القاسم المنصور الفردوسی وقت کا افضل ترین شاعر تھا۔ امراء اور روساکے گھروں سے نوشابہ کے سادیانہ تعلقات تھے مگر اس کی بچی کی پوشش اور رہن سہن دوسروں کے مقابلہ میں حقیر تھا۔ یہ بات غیرت دار نوشابہ کو برداشت نہ ہوتی وہ فردوسی کو کسی دربار سے رجوع کرنے کو کہتی لیکن خلوص کی زمین فردوسی کے قدم پکڑ رہی تھی اس کا دل کہیں جانے کو نہ اٹھتا وہ نوشابہ کو ٹال دیتا اور نوشابہ اس کا منہ دیکھ کر رہ جاتی۔

شاہنامہ کی ضخامت جس قدر بڑھتی فردوسی کے انہماک میں اور اضافہ ہوتا اور دوسری باتوں کی طرف سے توجہ ہٹتی جاتی۔ نوشابہ اس کا اندازہ کر رہی تھی۔ اسی لئے فکر معاش کے لئے دو چار بار کہہ کر اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ مگر اس سے اس کے

تفکرات کم نہ ہوئے بلکہ دل پر ایک مستقل بوجھ رہنے لگا۔ اور اس کی تندرستی متاثر ہونے لگی۔

فردوسی نے دو تین ہزار شعر اور کہہ ڈالے اور نوشابہ حسب معمول شب میں ان کو سنتی سناتی رہی۔ ایک رات نوشابہ فردوسی کے تازہ کلام کو پڑھ رہی تھی۔ فردوسی یک تاثر میں سن رہا تھا۔ سنتے سنتے وہ چونک سا پڑا اور نوشابہ کی ٹھوڑی میں ہاتھ لگا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ نوشابہ نے اس کو اظہار محبت پر محمول کیا اور اس کو حیا کا احساس ہونے لگا۔ مگر فردوسی کی آنکھیں دیکھتے دیکھتے ڈبڈبا آئیں اور نوشابہ بےچین ہو کر پوچھنے لگی۔

"کیوں۔ کیا ہوا میرے سرتاج ——— ؟"

فردوسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اس دوقفہ میں اس کے آنسو آنکھوں سے گذر کر رخساروں پر آگئے۔ اور نوشابہ کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس نے باہیں فردوسی کے گلے میں ڈال دیں اور پیار کے لہجہ میں استفسار کرنے لگی۔

"بتاتے کیوں نہیں آخر ——— ؟"

بے گناہ مقتول ایک مجنون قاتل سے قتل کرنے کا سبب پوچھتا ہے۔ قاتل کیا بتائے اس کو ——— " فردوسی نے زیر لب کہا۔ نوشابہ ایک باکمال شاعر کی رفیقۂ حیات تھی۔ اس کے کنایہ کو سمجھ گئی۔ مگر انجان بن کر متفسر ہوئی۔ "میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب؟"

"تمھاری اسی روش نے میرے دامن پر یہ دھبہ لگایا ہے" اس نے ایک دلدوز آہ کی اور نوشابہ کے رخساروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "پھولوں کی شادابی باغبان کی بے توجہی سے جاتی رہی۔" نوشابہ کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔ فردوسی نے ہاتھ سے

اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا اور بولا "تمھاری آنکھوں کے حلقے میری سرد مہری پر نالاں ہیں۔ میں تم سے شرمسار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ تمھاری طرف سے اتنی غفلت نہ کروں گا۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے آپ نے کیا تکلیف دی ہے جو عذر خواہی کر رہے ہیں۔" نوشابہ نے نسائیت کے غرور کے ساتھ فردوسی سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا اور فردوسی نے اپنے کو اس کے فریب تسلی سے بچانے کے لئے تردید کی۔

"میں نے تم کو اتنے انکار میں مبتلا کر دیا کہ اس کا اثر تمھاری صحت پر پڑا۔"

"میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور آپ جن ظاہری تغیرات کو کہہ رہے ہیں وہ سن کے تقاضے سے ہونا چاہیئے۔ اس نے شوہر کی بات پوری ہونے سے قبل اطمینان دلانے کی کوشش کی مگر فردوسی نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور بولا۔

"تمھارا سن ابھی ایسا نہیں ہے کہ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔"

"آپ تو چاہتے ہیں کہ میں ویسی کی ویسی بنی رہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" نوشابہ نے اس کی دلدہی کے لئے آخری سعی کی لیکن اس سے فردوسی کا احساس پشیمانی کم نہ ہو سکا آنکھوں سے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ایک جذبۂ محبت نے لے لی تھی۔ فردوسی نے نوشابہ کا سر اپنے سینے پر جھکا لیا۔ اور بالوں میں انگلیاں ڈال کر کھیلنے لگا۔ نوشابہ نے ایک کیف میں آنکھیں بند کر لیں اس کے نزدیک فردوسی نے برسوں کے جمود کی تلافی کر دی تھی اسے کوئی شکوے کا محل باقی نہ رہا تھا۔ اور فردوسی نے تو واقعی طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے وہ کچھ وقت نوشابہ کے لئے بھی نکالے گا۔ اور کوئی ذریعہ معاش پیدا کرنے کی سعی کرے گا۔

دوسرے دن جب حسین قتیب اور بودلف ایک ساتھ ملنے کے لئے آئے تو فردوسی نے نوشابہ کی کیفیت اور اپنا عزم بیان کیا اور اُن سے رائے لی۔ حسین قتیب نے سوچ سمجھ کر مشورہ دینے کا وعدہ کیا۔ بودلف خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بیٹھکر دونوں چلے گئے اور فردوسی اپنے کام میں لگ گیا۔

حسین قتیب نے طوس کے مشہور طبیب کو نوشابہ کے علاج کے لئے بھیج دیا اور اس سے کہہ دیا کہ دوا کے تمام مصارف فردوسی کے بجائے اس سے لئے جائیں۔ بودلف دوسرے وقت آکر ایک رقم چپکے سے فردوسی کی نذر کر گیا۔ جو کئی مہینے کی کفیل ہو سکتی فردوسی کو پھر ایک اطمینان سا ہو گیا۔ نوشابہ کے متعلق کچھ دن تو اس نے اپنا عہد یاد رکھا دن میں کئی کئی بار اس کو بلا کر یا خود اس کے پاس جا کر ہمکلام رہتا۔ نوشابہ کی آنکھیں شوہر کے اس التفات پر چمکنے لگتیں۔ جس کے نتیجہ اس کی صحت عود کرنے لگی۔ طبیب کی دی ہوئی مقوی ادویہ نے بھی کچھ کام کیا اور چہرے کی گئی ہوئی رونق واپس آگئی مگر ایک فن کار زیادہ دن غیر فنی التزامات کا پابند نہیں رہ سکا۔ نوشابہ کے لئے فردوسی کی توجہ میں آہستہ آہستہ فرق آنے لگا۔ اور جلد ہی وہ منزل آگئی کہ شاہنامے نے اپنے سوا تمام باتیں پھر فراموش کرا دیں۔

نیک نفس نوشابہ خود شوہر کا وقت لینا نہ چاہتی وہ فردوسی کے کام کی اہمیت کو سمجھتی تھی اور جانتی تھی کہ وہ دن ضرور آئے گا جب اس کے شوہر کا کارنامہ سراہا جائیگا حسین قتیب اور بودلف کی عنایتوں سے کچھ دنوں کے لئے معاشی دشواریوں سے نجات مل گئی تھی۔ اس لئے وہ ہر طرح شاد و خرم تھی لیکن اس کی شادمانی کو بقا حاصل نہ ہو سکی۔ زمین کی گردش یا آسمان کی کجروی نے اس کو پھر صبر آزما حالات میں لا ڈالا

اور فردوسی کے خیال کی بلند پروازی اور نوشابہ کے خون جگر سے شاہنامہ میں اشعار کا اضافہ ہونے لگا۔

فردوسی نے ڈیڑھ دو سال کے بعد پھر کروٹ لی مگر صنف نازک کا نحیف جثہ مصائب کا پہاڑ اٹھاتے اٹھاتے اتنا کمزور بن چکا تھا کہ اس میں بیماریوں کے حملے برداشت کرنے کی قوت نہ رہی تھی فردوسی نے شاہنامہ کو چھوڑ کر دوڑ دھوپ شروع کی اس کے ہر بہی خواہ نے ہاتھ بٹایا۔ لیکن نوشابہ پلنگ لگ کر اٹھنے کے قابل نہ ہوسکی بلکہ جس قدر علاج کیا گیا اس کی علالت بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ خود اس کو زندگی سے یاس ہو گئی ایک رات فردوسی شمع جلائے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ چند آنسو خودبخود پلکوں سے ٹپک پڑے اور نوشابہ کے چہرے پر گر پڑے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور نقیہہ آواز میں بولی،

"روئیے نہیں سرتاج! آپ ہی روئیں گے تو میری بچی کو کون تسلی دے گا؟" اس نے سوتی ہوئی فرنگیس کی طرف اشارہ کیا۔ پھر رازدارانہ انداز میں کہنے لگی۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ـــــ"

فردوسی نے ہمہ تن متوجہ ہو کر کان اس کے قریب کر دیے۔ اور اس نے ایک ہلکی سی سانس لے کر کہا۔

"میری موت کا زیادہ غم نہ کیجئے گا ـــــ"

"تم آتنا ہے آس کیوں ہو علاج ہو رہا ہے۔ اچھی ہو جاؤ گی" فردوسی نے اس کا جملہ پورا ہوتے ہی تسلی دی اور وہ ہاتھ سے اس کو روک کر کہنے لگی

"سن لیجئے جو کچھ میں کہتی ہوں ممکن ہے پھر وقت نہ ملے۔

فردوسی خاموش ہو گیا۔ اس نے قدرے توقف کر کے کانپتی ہوئی آواز پر قابو حاصل کیا اور بولی۔

"شاہنامہ کا لکھنا بند نہ کیجئے گا۔ اس سے میری روح کو تسکین ہو گی۔ لیکن میری نرگس کے لئے کچھ وقت ضرور نکالیں گا۔"

فردوسی ان جملوں پر ضبط نہ کر سکا اور اس کے اشک بہنے لگے۔ نوشابہ نے روٹھنے کی ادا سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ روتے ہیں، میں کچھ نہ کہوں گی ——"

فردوسی کی رقت اس جملے پر کچھ تیز ہو گئی۔ مگر اس نے آنسو پونچھ لئے اور گلوگیر لہجہ میں اس کا نام لیا۔

"نوشابہ ——!"

اس نے آنکھیں کھول دیں تو فردوسی نے کہا۔

"کہو، کیا کہتی ہو۔ میں اب نہیں روؤں گا۔"

نوشابہ نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹوں کو حرکت دے کر دیکھا۔ اور کہنے لگی۔ "ذرا میری بچی کو جگا لایئے۔ جی چاہتا ہے دیکھنے کو۔"

فردوسی نے نرگس کو بیدار کیا۔ نیند کی ماتی بچی بیٹھ کر اونگھنے لگی فردوسی نے کنیز کو اشارہ کیا کہ منہ ہاتھ دھلا لاؤ۔ اس عرصہ میں نوشابہ نے قاسم کو بھی جگا لینے کے لئے کہہ دیا۔ وہ نوشابہ کی علالت کی خبر پا کر معہ بیوی کے آ گیا تھا۔ فردوسی نے اس کو بیدار کر دیا۔ اور وہ آنکھیں ملتا ہوا پلنگ کے قریب آ گیا۔ آتے ہی اس نے نوشابہ سے مزاج کی کیفیت پوچھی۔ اور چند روز کی مہمان ماں نے مسکرا کر اسے چھے

ہو جانے کا اطمینان دلا دیا۔ نرگیس بہت چھوٹی تھی وہ سامنے پہونچتے ہی ماں کے پاس لیٹنے کی ضد کرنے لگی۔ فردوسی نے اس کو نوشابہ کے پہلو میں جگہ کر کے بٹھا دیا۔ اور ممتا کی ماری نوشابہ نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

دوا دینے کا وقت آ گیا تھا۔ کنیز اس کی اجازت لینے کے لئے آ کر کھڑی ہو گئی اور فردوسی نے اس سے دوا لے آنے کو کہدیا۔ نوشابہ اپنی اندرونی کیفیات کو سمجھ رہی تھی اور دوا پینا فضول قرار دیتی تھی اس نے انکار کیا۔ مگر فردوسی نے ضد کی تو اس کی خوشی کرنے کو تیار ہو گئی۔ نرگیس اس کی جگہ پر پہنچا دی گئی۔ قاسم نے اپنے ہاتھ سے دوا کے قطرے ماں کے حلق میں ٹپکا دیئے۔ اور نوشابہ کو نیند آنے لگی۔

اس واقعہ کے بعد دو روز تک وہ ٹھیک رہی۔ تیسرے دن دوپہر سے حالت بگڑ گئی۔ اور آدھی رات سے سانس رکھی جانے لگی۔ آخر وہ منحوس گھڑیاں آ گئیں جب آسمان سے ایک روشن ستارہ ٹوٹ کر گرا اور شاہنامہ کا خالق زندگی کے سفر میں اکیلا رہ گیا۔ آخری ہچکی لینے سے قبل نوشابہ نے ایک بار آنکھیں کھولیں فردوسی کو دیکھا مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکرا نہ سکی۔

نوشابہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ فردوسی کی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ اور تصور میں وہ منظر پھر رہا تھا۔ جب حجلۂ فردوسی میں اس نے نوشابہ کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ آج کی نوشابہ میں اور اس نوشابہ میں کتنا فرق تھا! ایک ہی انسانی ڈھانچہ وہی ناک نقشہ کوئی عضو بدلا ہوا نہیں۔ مگر حیات کا رشتہ ٹوٹ جانے سے ہر شے میں تضاد ہو گیا تھا۔ نوشابہ کے وہ عنابی رخسار بہاریں جن سے شگفتگی لے کر مسکراتیں۔ موت کے

جھونکے سے مرجھا چکے تھے۔ اس کی نشیلی اور چمکدار آنکھیں، کائنات جن کی گردش پر رقص کرتی، بے نور بن کر ساکت ہو چکی تھیں۔ فردوسی ایک ایک عضو کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور کہیں پر اس کو ماضی اور حال میں مماثلت نہ ملتی۔ اک زندگی کی نگاہ پھرتے ہی ہر چیز نے منہ موڑ لیا تھا۔ پاس وفا فردوسی کو مجبور کرنے لگا کہ ایسے نازک وقت میں رفیقہ کا ساتھ نہ چھوڑے مگر نوشابہ اس پر ایک امانت اور ایک فرض کی ذمہ داری ڈال گئی تھی۔ امانت کو تو حسین تقیت، علی وسلیم اور ربوذنف کے بھی سپرد کیا جا سکتا۔ لیکن فرض کی ادائی کے قابل کوئی نظر نہ آتا۔ صبح کا تارہ چمکنے سے طلوع آفتاب تک وہ ایک مقام پر کھڑا یہی سوچتا رہا کہ شریک حیات کا ساتھ دے یا شاہنامے کی تکمیل کے لئے زندہ رہے۔ آخری فیصلہ زندگی کے حق میں ہوا اور فردوسی نوشابہ کی میت کاندھے پہ لیکر قبرستان کی طرف چل پڑا۔

ہر ذی روح کے انجام کی طرح نوشابہ کا بھی انجام ہوا۔ اس کا نازک اور نفیس پیکر مٹی کے انبار کے نیچے دبا دیا گیا۔ فردوسی آنکھیں اشکباری کرتے کرتے خشک ہو چکی تھیں۔ مگر نوشابہ کو خاک کے ڈھیر میں روپوش ہوتے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر وہ بلک پڑا۔ علی دیلم اس کا شانہ پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے سمجھایا۔ سمجھانے کا اثر تو فردوسی پر کیا ہوتا؟ ان آنسوؤں نے نکل کر تسکین کی صورت پیدا کر دی اور نوشابہ کے الفاظ اس کو یاد آگئے کہ "میری موت کا زیادہ غم نہ کیجئے گا۔"

فردوسی کو اس کی موت کا غم نہ تھا۔ اپنی بے حسی کا رونا تھا کہ اس کے تغافل نے نوشابہ کی جان لے لی۔ لیکن اب پچھتانے سے حاصل ہی کیا تھا؟ فردوسی کو نوشابہ کے بجائے اس کی نشانی کی نگہداشت کرنا تھی۔ جس کے لئے اس نے عزم مصمم کر لیا

تھا کہ شاہنامہ خواہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے مگر وہ فرنگیس کی طرف سے غافل نہ ہوگا۔

مکان پر پہونچکر اس نے بچی کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ قاسم ایک ذکی الحس نوجوان تھا۔ اس کو نوشابہ کی موت کا بہت غم تھا۔ صبح کو جس وقت سے سو کر اٹھا تھا برابر رو رہا تھا۔ خادمہ تسکین دیتی اس کو تسکین نہ ہوتی۔ باپ کی حالت دیکھ کر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ فردوسی کو بھی دل پر قابو نہ رہا مگر قاسم کی خاطر صبر کیا۔ فرنگیس تین سال کی بچی تھی۔ کنیز نے اس کو بتا دیا کہ نوشابہ جہاں گئی ہے اس کو یقین ہوگیا وہ کھیلنے لگی اور قاسم کو روتے دیکھ کر بھی چپکا ہو گئی لیکن کچھ سمجھ نہ سکی۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ مرنا کیا ہوتا ہے۔

مقامی رؤسا اور امیروں کے گھروں کی عورتیں فردوسی کے عالی شان مکان میں بھری ہوئی تھیں۔ فردوسی کی شخصیت کے واسطے سے الگ نوشابہ کے لئے ان کے دلوں میں جگہ تھی اور وہ اس کی روح کو خلوص کے موتی نچھاور کر رہی تھیں۔ بودلف کی بیوی صف ماتم کی منتظم تھی۔ فردوسی کے اعزا اقربا اور بہو موجود تھی۔ قرابت دار خواتین کی بڑی تعداد نوشابہ کے غم میں سوگوار تھی مگر فردوسی کی نگاہ میں اس کے احباب عزت داروں سے زیادہ قیمت رکھتے۔ نوشابہ کے بعد جب اس کا گھر سونا ہو گیا تو اس نے بہو کے ساتھ بودلف کی بیوی کو ذمہ دار بنا دیا جو چند کنیزوں کے ساتھ نوشابہ کی تیمارداری کو آئی تھی۔ فردوسی کی کنیز کو فرنگیس سے فرصت نہ تھی اس لئے گھر کے اندر بودلف کی رفیقہ زندگی اور باہر علی دیلم تعزیت کے لئے آنے والوں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

فردوسی ایک نامراد شاعر تھا جس کی قسمت میں اندوہ پر اندوہ اور غم پر غم لکھا تھا لیکن دوستوں کے معاملہ میں وہ خوش نصیب تھا۔ نوشابہ کی جانکاہ موت پر اسکا توازن عقل و ہوش باقی نہ تھا تاہم تجہیز و تکفین کا بند و بست، بچوں کو سنبھالنا آنے جانے والوں کو برتنا، بہت سے کام تھے جن کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی لیکن اس کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون سا کام کیونکر انجام پایا؟ اور مصارف کہاں سے پورے ہوئے؟ وہ مکان کے مردانہ حصہ میں بیٹھا رہا۔ طوس کے عوام و خواص کا تانتا بندھا رہا اور ہر فرض بحسن و خوبی ادا ہو گیا۔

زنانخانہ تو اسی دن خالی ہو گیا۔ صرف بودلف کے بیوی بچے اور کنیزیں رہ گئیں۔ فردوسی کی دلجوئی کے لئے بودلف نے ان کو کچھ دنوں کے لئے مستقلاً وہیں رہنے کی ہدایت کر دی تھی مردانہ مکان میں بودلف خود علی دیلم کے ساتھ ٹھہر گیا تاکہ تنہائی میں فردوسی نوشابہ کی یاد میں پریشان نہ ہو۔ یہ عمل کئی روز تک جاری رہا۔ اور فردوسی کو خود بخود صبر آنے لگا۔

بودلف کی بیوی بعد عشرہ قیام کر کے چلی گئی۔ اور زنانخانہ صرف قاسم اسکی بیوی نرگیس اور نوشابہ کی کنیز کے لئے رہ گیا تو فردوسی بھی زنانخانے میں منتقل ہو گیا تاکہ اس کے وجود سے بچوں کا جی بہلا رہے حسین قتیب کو منصبی مشغولیت تھی اسلئے وہ صرف شب میں مزاج پرسی کے لئے آتا۔ بودلف اور علی دیلم دن رات رہتے مگر فردوسی نے جب زنانخانے میں اقامت اختیار کر لی تو وہ لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تاہم ہر روز دو دو تین تین مرتبہ آتے اور گھنٹوں بیٹھ کر جاتے۔

وقت بڑے بڑے صدمہ کو بھلا دیتا ہے مگر فردوسی نوشابہ کو بھلا نہ سکا البتہ

طبیعت اس کی مفارقت کی عادی ہوگئی اور غم کا بوجھ خون بن جانے کے بعد ہلکا محسوس ہونے لگا۔ لیکن اتنا ہلکا بھی نہیں کہ وہ شاہنامہ لکھنے کے قابل ہوسکتا۔

نوشابہ فردوسی کی ہمسفر زندگی ہی نہ تھی۔ محبوبہ تھی۔ اس کے جیتے جی فردوسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ نوشابہ کو کتنا چاہتا تھا۔ محبت کا صحیح علم اس وقت ہوا جب دائمی جدائی درمیان میں حائل ہوگئی۔ فردوسی نوشابہ کے نبیؔ کی خاطر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ شاہنامہ کی تکمیل کے لئے ہوش و حواس مجتمع کرنے میں ساعی ہوتا۔ لیکن ایسی جد و جہد قلب کی ٹیسوں میں اضافہ کا باعث بن جاتی۔ فردوسی فرنگیس کے خیال سے آنسو نہ بہا سکتا۔ آنکھیں ڈبڈبا آتیں ہونٹ کانپنے لگتے اور وہ منہ پھیر کر باہر نکل جاتا۔ شاہنامے کے اوراق پریشاں ایک الماری میں پڑے ہوئے اپنے خالق کی نظر اعتنا کے امیدوار تھے اور اس کا خالق ایک نئے صحیفۂ اندوہ الم کی ترتیب دے رہا تھا۔

باب ۴

زندگی کا مد و جزر

فردوسی اپنے وقت کا عالم متبحر اور فلسفی تھا۔ نوشابہ کا غم عقل کی میزان پر بے سود اترتا تو وہ اپنے کو سنبھالنے میں کوشاں ہوتا اور کسی حد تک ارادے میں کامیابی بھی حاصل کر لیتا مگر بعض لمحات میں چوٹ کھایا ہوا دل صبر و ضبط کی قوتوں پر حاوی ہو جاتا اور فردوسی کا سا دانشمند جذبات میں بہنے لگتا۔ نوشابہ تصور میں ایک طرف سے دوسری طرف جاتے محسوس ہوتی۔ وہ اس کو پکارنے کا ارادہ کرتا۔ پھر اپنی خام خیالی پر چونک پڑتا اور اپنی حالت پر ہنسی آنے کے بجائے آنسو بہنے لگتے۔

نرگیس کے خیال سے وہ زنانہ مکان میں اقامت پذیر ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ اس کے تحمل کا بڑا امتحان تھا۔ در و دیوار ہمہ وقت نوشابہ کی یاد دلاتے رہتے۔ فردوسی کی نگاہیں انھیں کے درمیان اس کو دیکھنے کی عادی تھیں۔ خیال ظرف کو خالی پا کر مظروف کو ڈھونڈھنے لگتا۔ ایک اطاعت شعار بیوی کا شائبہ نوشابہ کی شکل اختیار کر کے فردوسی کے ذہن میں منڈلانے لگتا۔ فردوسی نرگیس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اس سے جی بہلنے کا ایک پہلو نکل آتا۔ مگر دل کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھتی۔

نرگیس اس کا مرکز محبت بن چکی تھی۔ نوشابہ کا غم غلط کرنے کے لیے جس کو وہ غنیمت سمجھتا مزاج میں یکسوئی پیدا ہوتی جا رہی تھی مگر وہ شاہنامہ لکھنے کے قابل نہ تھا اور نہ طبیعت

کے انداز سے اس کی توقع تھی کہ مستقبل قریب میں اتنا یارا ہو سکے گا کہ حاضر دماغی سے اس کام کو شروع کر سکے۔ ایک روز دوپہر کو قیلولہ کرنے کے لئے لیٹا تو غنودگی سی آنے لگی اور اسکے کان بجنے لگے۔ نوشابہ کے لہجہ میں کوئی کہہ رہا تھا ——— "آپ نے میری وصیت کو فراموش کر دیا۔ شاہنامہ لکھنا چھوڑ دیا۔" فردوسی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ سائیں گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نرگس ایک کمرے میں کنیز کے پاس تھی۔ قاسم بیوی کے ساتھ دوسرے کمرے میں فردوسی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ نوشابہ ادھر ادھر موجود ہونے کے بجائے تصور کے پردوں پر ابھر رہی تھی۔ اور انہیں الفاظ کو دہرا رہی تھی جو ابھی فردوسی نے سنے تھے۔ وفا کیش محبوبہ کا خیال اس کا مقصد زندگی بن چکا تھا۔ اسی کی فرمائش پر اس نے دقیقی کا ادھورا کام پورا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہی اس کی تکمیل پر توجہ دلا رہی تھی ایک لمبی آہ فردوسی کے منہ سے نکل گئی۔ اور اس نے شاہنامہ لکھنے کا عزم کر لیا۔

دو چار روز تک تو اس کا یہ عالم رہا کہ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ ایران کے تاریخی مناظر کے بجائے حسن و شباب کا ایک شاہکار نگاہوں میں گردش کرنے لگتا اور فردوسی اس کی رعنائیوں میں کھو جاتا۔ یہی مکان تھا جس میں نوشابہ بیاہ کر لائی گئی تھی۔ اسی کے صحن میں کتنی ہی چاندنی راتیں عیش و محبت کے نغمے الاپ کر گزری تھیں۔ فردوسی کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس کے باپ کی زندگی میں نوشابہ کا ڈولا ڈیوڑھی میں لا کر رکھا گیا تھا اور وہ گھڑیاں تو مدت العمر فراموش نہ ہو سکیں۔ جب وہ یاس و حرماں کے جھرمٹ میں اس کے جنازے کو لے کر نکلا تھا۔ شاعر کو احساسات میں طوفانوں کے جھکوڑے محسوس ہونے لگتے۔ کلیجہ منہ کو آجاتا اور وہ ایک تسلسل سے آہیں بھرنے لگتا۔ شاہنامہ کی کسی واقعہ نگاری کے بجائے قلم کی نوک ایک نقطہ پر ٹھہر جاتی۔ اور وہ دیوانگی کے سے عالم میں بیٹھا رہ جاتا

ہفتوں تک یہی کیفیت رہی پھر کچھ نہ کچھ کام ہونے لگا۔ اور دھیرے دھیرے شعر گوئی کی ایک رفتار قائم ہوگئی۔ مگر نوشابہ کی بابت سوچنا ترک نہ ہوا۔ وہ اسی طرح ذہن و خیال پر چھائی رہی لیکن فردوسی اس کے تصور کو تخریب کے بجائے تعمیر کے تصرف میں لانے لگا اور شاہنامے کو نوشابہ کا عاید کیا ہوا ایک فرض قرار دے کر لکھنے لگا۔ اس طرح اس کا اضمحلال ایک چستی میں بدل گیا۔ اور قوت ارادی میں جان پڑ گئی۔

فرنگیس کی دیکھ بھال میں وہ نوشابہ سے برتی ہوئی بے توجہی کی تلافی کر رہا تھا کھانا اسکے ساتھ کھاتا اور کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے پاس بٹھا کر دلجوئی کرتا مگر یہ وقفہ طولانی نہ ہوتا اس کا زیادہ وقت شاہنامے ہی میں صرف ہوا کرتا اور چند ساعتیں دوست احباب کے ساتھ گذر جاتیں۔

فردوسی کی زندگی ایک اعتدال پر آ گئی۔ اور قرآن العجم کے صفحات تیزی سے بڑھنے لگے۔ کئی سال کا عرصہ گذر گیا اور فرنگیس بے شعوری کے دور کو طے کر گئی۔ نوشابہ ابھی طرح فردوسی کے حافظے میں موجود تھی۔ لیکن وقت کے فصل نے تڑپ میں کمی کر دی تھی اور جذبات کے بہاؤ کی جگہ ایک ٹھہراؤ نے لے لی تھی۔ وہ نوشابہ کے بدلے نوشابہ کے خیال کے لئے زندہ تھا اور جس کے لئے بجز اس کے جینے میں کوئی دلچسپی بھی نہ تھی کہ محبوبہ کی روح کی تسکین کیلئے اسلاف کی تاریخ کا تکملہ کر دے۔

دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلنے لگے۔ فردوسی بغیر نوشابہ کے زندگی کے دن پورے کرنے کا خوگر ہوتا گیا۔ شاہنامے کے دامن میں بیس ہزار اشعار کا ذخیرہ ہو گیا۔ اور طبیعت بیقراری کی اتنی خوگر ہو گئی کہ درد نے سکون کی صورت اختیار کر لی۔ مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ بدنصیب شاعر کو ایک ایسی منزل سے گزرنا تھا جس پر ابیاد

اور اولیا کے قدم بھی ڈگمگا گئے۔ فردوسی کی امیدوں کا سہارا قاسم اچانک بیمار ہوگیا۔ فردوسی نے اس کی طرف سے غفلت نہ کی۔ ایک چوٹ کھائے بیٹھا ہی تھا۔ اول روز سے قاسم کا علاج معالجہ شروع کر دیا۔ لیکن مشیت پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ اطبا مرض کو سمجھ نہ سکے دواؤں نے اپنے اثرات بدل دئے اور مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی۔ قاسم چند روز علیل رہ کر چل بسا اور موضع "شاداب" کے جاگیردار کے گھر سے نوشابہ کی موت کے بعد ایک بار پھر شور ماتم بلند ہوگیا۔ ضعیف باپ کا عصائے پیری عین اس وقت چھوٹ گیا جب ابوالقاسم کی عمر پینسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور قوی جواب دینے لگے تھے فردوسی کو اس کمزوری کی فکر نہ ہوتی۔ بشرطیکہ جوان بیٹا بازو تھامنے کو موجود رہتا۔ لیکن قسمت نے اس آسرے کو برقرار نہ رہنے دیا اور بیٹے نے باپ کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ دیا۔

قاسم کی موت فردوسی کی قوت برداشت پر ایسی ضرب تھی وہ جس کی تاب نہ لا سکا۔ کڑیل جوان کی میت اٹھانا تو بڑا کام ہے۔ آخری ہچکی آتے ہی وہ پچھاڑ کھا کر گر پڑا آڑے وقت پر کام آنے والے احباب موجود تھے۔ انھوں نے بڑھ کر سنبھال لیا اور حسین قتیب اس کو اور نرگس کو لے کر اپنے وہاں چلا گیا۔ علی دیلم اور بودلف نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ لاش قبرستان میں پہنچا دی گئی۔ اور حسین قتیب کو اطلاع کر دی گئی۔ وہ فردوسی کو لے کر آگیا۔ باپ نے بیٹے کا آخری نظارہ کیا۔ اور قاسم جوان ماں کی تاریکی میں سپرد لحد کر دیا گیا

جوان بیٹے کا مرنا یوں بھی کوئی معمولی سانحہ نہیں ہوتا اور قاسم تو صرف بیٹا ہی نہ تھا۔ عصائے پیری بھی تھا۔ فردوسی جس کو آڑے وقت پر کام آنے کے لئے کلیجے سے لگائے تھا۔ اس کی موت پر وہ محض اس لئے نہیں رویا کہ اس کا دل پدری جذبے سے

بیقرار تھا۔ بلکہ اس لئے اور بھی رونا آرہا تھا کہ نوشابہ کا غم غلط کرنے والا اٹھ گیا تھا۔ اُونٹ کے سناٹوں میں اٹھ اٹھ کر اس نے رفیقۂ حیات کو آواز دی۔ اور تنہائی میں زندگی وبال جان ہو جانے کا بیان کیا۔ اس کا کوئی صاف اور صریحی جواب تو نہ ملا۔ لیکن نوشابہ کی روح مسکراتے محسوس ہوئی اور عالم خیال میں کہنے لگی۔ ـــــــ "آپ اتنی اتنی باتوں پر متاثر ہوتے ہیں ایسے کھیل تو زندگی میں بنتے بگڑتے ہی رہتے ہیں۔ حقیقتاً مقاصد حیات سے جن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور آپ کی زندگی کا مقصد تو ان سطحی باتوں سے بلند ہے۔ آپ قوم اور ملک کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں اپنا فرض پورا کیجئے۔ اور میری نشانی سے جی بہلانا ہے تو فرنگیس موجود ہے جو ہو بہو مجھ سے مشابہ ہے" فردوسی کے آنسو خود بخود خشک ہو گئے۔ اور عزم و استقلال کا ایک پہاڑ بن کر وہ کھڑا ہو گیا۔

حسین قتیب نے اس کے رہنے کا انتظام اپنی خوابگاہ میں کیا تھا اور تھوڑے فاصلے سے خود بھی سو رہا تھا۔ اس کی آنکھ اتفاقیہ کھل گئی۔ فردوسی کو ایک مقام پر ساکت و صامت دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ فردوسی نے اس کو جاگتے پاکر خود سبقت کی اور کہنے لگا۔ ـــــــ "میں صبح کو اپنے مکان چلا جاؤں گا۔ مجھے جلد سے جلد شاہنامہ کو مکمل کرنا ہے۔" حسین قتیب کو اس کی صحت دماغ پر شک ہونے لگا۔ اس نے ہاں میں ہاں ملا دی اور سو رہنے کی تلقین کی۔ فردوسی نے بھی زیادہ گفتگو نہ کی اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ مگر اس کو نیند نہ آسکی۔ نیند تو اس دن سے بہت کم آئی تھی۔ جس دن سے قاسم نے دعوتِ اجل کو لبیک کہا تھا

صبح کو حسین قتیب نے اس کو فرنگیس، اور اس کی کنیز کے ساتھ اس کے مکان بھجوا دیا۔ لیکن علی دیلم اور بودلف کو خاص طور پر ہدایت کر دی کہ اس کی طرف سے غافل نہ ہوں

وہ دونوں دو تین راتوں تک اس کے ساتھ مقیم رہے۔ پھر ان کو اطمینان ہو گیا اور واقعی فردوسی غیر معمولی استقلال کا مظاہرہ کر رہا تھا اور ضبط و تحمل کا کردار عظیم بن کر سامنے آ رہا تھا۔

قاسم نے عین عالم شباب میں داغِ جدائی دیا تھا۔ جوان موت والدین کو کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ فردوسی کو بھی وہ بہت یاد آیا لیکن وہ لوگ جنہوں نے نوشابہ کے لئے اسکی تڑپ کا مشاہدہ کیا تھا دیکھ رہے تھے کہ جوان بیٹا شاعر کے دل کو اتنا متاثر نہ کر سکا، ماں جس کی نظیر پیش کی تھی۔ تاہم اولاد کا غم خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ فردوسی شعر لکھتے لکھتے چونک پڑتا۔ اسکو دونوں پہلو جلتے دکھاتی دیتے اور دل کی تپش پانی بن کر آنکھوں سے نکلنے لگتی۔ نوشابہ نے زندگی کے طولانی سفر میں ساتھ چھوڑتے وقت فردوسی کے دونوں ہاتھ دو تا تھا سونا کے ہاتھوں میں دئے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود موت سے مجبور ہو گئی تو اس کی نشانیاں ماں کا فرض پورا کر دیں گی۔ اور فردوسی کا بیڑا پار لگا دیں گی۔ ان میں کا ایک منزل پر پہنچنے سے قبل منہ موڑ گیا تھا۔ توانا و تندرست قاسم قابلِ اعتبار ثابت نہ ہوا تو کمزور اور نازک نرگیس پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا لیکن فردوسی کے لئے بجز اس کے چارہ بھی نہ تھا کہ نرگیس کو بڑھاپے کا سہارا بنائے اور اس کو دیکھ دیکھ کر جیتا رہے۔

یہ کی اکلوتی بیٹی ماں اور بھائی کی نمائندگی کرنے لگی۔ اور بچپن اور جوانی کی سرحد پر فردوسی کا دل سمجھنے لگی مگر در اصل اس کو نرگیس کیا دنیا ہی سے نفرت ہو گئی تھی وہ کسی نہ کسی طرح شاہنامہ کو پورا کر کے مرجانا چاہتا تھا اور اسی لئے لکھنے کی رفتار کچھ تیز کر دی تھی نرگیس سے اگر اس کو محبت تھی تو صرف اس لئے کہ وہ نوشابہ کی ہمشکل اور اس کی امانت تھی۔ ورنہ وہ زندگی سے زیادہ موت کو عزیز سمجھ رہا تھا کہ دائمی سکون حاصل کر کے ہمیشہ

کے لئے نوشابہ سے مل جائے۔

فردوسی کو شاہنامہ لکھتے ہوئے بیس سال گذر چکے تھے۔ اکیسویں سال سے اس کی رفتار مقابلتاً دوگنی اور تین گنی ہوگئی۔ وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا اور قاسم کی موت کو جس قدر زمانہ گذرتا گیا۔ فردوسی کا انہماک اور شعر گوئی بڑھتی رہی۔

قاسم کے اٹھ جانے سے فردوسی کا سونا گھر اور سونا ہوگیا۔ مگر فردوسی کو چہل پہل کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ ایک رو میں گذارا کر رہا تھا اور فارس کے افق ماضی سے خیال کی ممکن رسائی تک اس کی رہگذر تھی جس میں دھندلے دھندلے سے خاکے نظر آرہے تھے۔ فردوسی انھیں خاکوں میں قلم کی موشگافیاں دکھا رہا تھا اور انتہائی مدھم نقوش میں رنگ گہرا اتنا روشن بنا رہا تھا کہ نگاہیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں اور دیکھنے والوں کو قدرت یا سحر پر شک ہو رہا تھا۔ راستہ پر پیچ اور ناہموار تھا لیکن طوس کا فنکار تخیل میں ہزاروں بار اس پر گذر رہا تھا۔ اس لئے اجنبی نہ رہا تھا ایک ارادے میں ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جاتا اور کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔ نوشابہ کا تصور کسی کسی وقت لمحات کے لئے روک لیتا مگر اس کے بعد وہ آگے بڑھتا تو رفتار میں تیزی اور عزم میں استقامت ہوتی۔ شعر گوئی کا شغف اور شوق سخن عروج پر تھی۔ شاہنامہ کی زمین بن چکی تھی ایک ہموار اور سیدھی راہ نکل آئی تھی۔ فردوسی تیزی کے ساتھ اس پر گذرنے لگا اور قریب دس ہزار کے اضافے سے اشعار کی تعداد تیس ہزار پہنچ گئی۔

جوانی فرنگیس کی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو چکی تھی۔ نوشابہ کی کنیز گھر کا کام کاج کرتی مگر فردوسی کی ذاتی ضروریات فرنگیس نے اپنے ذمے لے لی تھیں اور بڈھے باپ کی خدمت کرکے وہ ایک طمانیت قلب محسوس کرتی۔ فردوسی کو بیٹی کے جوان ہو جانے کی خبر نہ تھی۔ وہ

تو شاہنامہ کا نکھار دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ فرنگیس سے اس کو بات کرنے کا محل پیدا ہوتا اور دن میں کئی کئی بار تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے وہ اس سے ہمکلام ہوتا مگر اس وقت بھی دماغ میں شاہنامہ کے مناظر موجود رہتے اور بیٹی سے مخاطبت کے ہنگام بھی اس کا ذہن اپنا کام کرتا رہتا۔ اس نے برسوں سے کسی شے کو نگاہ جما کر نہ دیکھا تھا۔ اس کے حافظہ میں صرف ملک و قوم کی تاریخ تھی جو ہمہ وقت پیش نظر رہتی۔

قاسم کی موت کے بعد کئی سال پلک جھپکاتے میں گذر گئے۔ اور ایران و عراق میں ایک نئے انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ غزنی میں سلطان محمود کی تخت نشینی نے سارے وسط ایشیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مگر فردوسی اپنے شغل میں اس قدر مستغرق تھا کہ اس کو کسی تغیر و تبدل کی نہ فکر تھی نہ پرواہ۔ وہ رات دن شاہنامہ میں اضافہ کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ خراساں پر محمود کے قبضہ کا غلغلہ ہوا اور حسین قتیب کے بجائے حکومت غزنی کی طرف سے سلان خاں عامل طوس مقرر ہو گیا۔

حسین قتیب ایک خاندانی رئیس تھا اس کو اس عہدہ سے برطرفی کا زیادہ قلق نہ ہوا مگر فردوسی پر اس کا بہت اثر پڑا حسین قتیب اس کا سب سے بڑا مربی تھا۔ مالی منفعت کے علاوہ ہر قسم کی سہولت اس کی ذات سے حاصل تھی۔ حسین قتیب نے فردوسی کے خیالات کا اندازہ کیا اور اسے تسلی دی کہ وہ مطلق ہراساں نہ ہو۔ اس کی طرف سے جو مراعات ہوتی رہی ہیں۔ وہ جاری رہیں گی۔ فردوسی کو وقتی طور پر اطمینان ہو گیا اور حسین قتیب نے جیسا کہا تھا کیا بھی۔ ویسا ہی فردوسی کو جو نذرانہ پیش کرتا تھا پیش کرتا رہا۔ لیکن حکومت کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ فردوسی کے گھر پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا۔

ایک روز سہ پہر کو فردوسی شاہنامہ لکھنے میں مصروف تھا کہ اس کو پیاس کا احساس

ہوا۔ کنیز کو اس نے آواز دے کر پانی دے جانے کو کہا۔ مگر کنیز کے بجائے فرنگیس پانی لے کر آگئی کٹورہ ہاتھ میں لیتے وقت فردوسی کی نگاہ فرنگیس کے چہرہ پر پڑ گئی۔ وہ ہوبہو نوشابہ کی نقل تھی۔ فردوسی کو نوشابہ کی اٹھتی جوانی یاد آ گئی۔ اور بیٹی کے بالغ ہو جانے کا خیال دماغ میں پیدا ہو گیا۔ پہلی بار اس نے سر سے پیر تک فرنگیس کو دیکھا۔ اور فرنگیس اپنے جسم کو سمیٹنے لگی۔ نوشابہ کی نشانی رنگ و روپ اور قد و قامت میں ماں کے برابر پہنچ چکی تھی۔ فردوسی کو ایک باپ کے فرض کا احساس ہوا۔ قلم اس نے رکھ دیا اور فرنگیس کو اپنے قریب بٹھا لیا محبت پدری رگ رگ میں جوش زن ہو گئی۔ شفقت سے اس نے بیٹی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جانے کی اجازت دیدی۔

مدتوں کے بعد فردوسی نے نوشابہ کو اُن احساسات کے ساتھ یاد کیا جنھوں نے بارہا جینے سے دل سیر کر دیا تھا۔ ابتدا ر شباب سے اس وقت تک کا ایک ایک واقعہ حافظہ میں تازہ ہو گیا اور غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے شاہنامہ کے اوراق کی طرف اٹھ گئیں۔ اس شاہنامہ کے لیے اس کو کتنا تحمل کرنا پڑا! اور کیا کیا قربانی نہ دینا پڑی؟ ذکی الحس رفیقۂ حیات کے جذبات کا احترام نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ کڑھ کڑھ کر مر گئی۔ چھتیس سال کے بیٹے نے آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔ اور وہ اس کی میت سے دامن جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دل پر آرے چلتے رہے۔ مگر اس نے شاہنامہ لکھنا بند نہ کیا پچیس سال اس شغل میں گذر چکے تھے اور وہ ساٹھ ہزار شعر نظم کر چکا تھا لیکن تسکین قلب کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔ مقامی امراء نے اس کے فن کی قدر دانی کی تھی۔ منصور بن محمد، حسین قتیب، علی دیلم اور بو دلف نے اپنی حیثیتوں سے زیادہ مراعات کی تھیں مگر بے مائگی اور تنگدستی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ نوشابہ کی موت جس کا بھی نتیجہ ہو گئی آپ

فرنگیس اس کی تمام متاع ہستی کیا اس کی جوانی بھی افلاس کی نذر ہو جائے گی۔ یہ ایک سوال خود بخود فردوسی کے سامنے آ گیا۔ اور اس کو تاب ضبط نہ رہی۔ ——— فردوسی ایک شاعر ہی نہ تھا۔ انسانیت کی انتہائی بلندی پر بھی فائز تھا اور سخت سے سخت امتحان سے گذر جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جوان بیٹی کی پریشان حالی اس کے تحمل پر ضرب نہ لگا سکتی مگر وہ صرف بیٹی ہی نہ تھی نوشابہ کی امانت بھی تھی۔ فردوسی بدنصیب محبوبہ کی نامرادی سے متاثر تھا اور آخر کو ایک انسان تھا۔ بیٹی کو ان حالات سے گذرتے دیکھ نہ سکا اور فرنگیس کو شاہنامہ پر ترجیح دینے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے جس قدر حالات پر غور کیا مایوسیاں بڑھتی گئیں۔ حسین قتیب طوس کا عامل بھی نہ رہا تھا۔ ورنہ فرنگیس کی شادی کے لئے وہی کوئی سبیل نکال دیتا۔ علی دیلم اور بودلف سے مالی امداد کی توقع تھی۔ لیکن فردوسی نوشابہ کی بیٹی کو اس طرح بیاہنا چاہتا تھا کہ محبوبہ کی روح سے سرخروئی حاصل ہو سکتی جس نے زندگی کی ہر صعوبت برداشت کی تھی اور طوس کو چھوڑنے کا خیال نہ کیا تھا۔ مگر فرنگیس کے مستقبل کے لئے ضعیفی میں پردیس کا ارادہ کرنا پڑا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ جائے تو کہاں جائے؟

فردوسی کے لئے ایک رکاوٹ قاسم کی بیوہ بھی ہوتی مگر اس نے چند ماہ قبل عقد ثانی کر لیا تھا۔ اور قاسم سے اس کی کوئی اولاد بقید حیات نہ تھی اس لئے اُدھر سے فردوسی کو اطمینان تھا۔ فردوسی کے لئے صرف فرنگیس کا سوال تھا اور اسی کی خاطر وہ تمام منصوبے بنا رہا تھا۔

باب ۵

سلاطین غزنویہ

بخارا کی سامانی حکومت کا ضمنی تذکرہ کسی مقام پر آ چکا ہے۔ اسی اولوالعزم خاندان کے ایک فرمانروا عبدالملک بن نوح کا ایک غلام تھا جس کا نام الپتگین تھا۔ نیک خو آقا نے ہونہار غلام میں جوہر قابل دیکھ کر امارت کے عہدہ پر فائز کر دیا اور خراسان کا حاکم بنا دیا۔ ۳۵۰ھ ہجری میں عبدالملک کی وفات پر جب منصور بن عبدالملک تاج و تخت کا مالک ہوا تو الپتگین غزنی کو منتقل ہو گیا اور سولہ سال حکومت کر کے ۳۶۶ھ ہجری میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ پر ابواسحٰق بن الپتگین کو ملی مگر وہ چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکا اور عنان حکومت الپتگین کے لائق اور مدبر غلام سبکتگین کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو الپتگین کا داماد بھی تھا۔

سبکتگین پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا اور جیپال کو بار بار شکستیں دیں۔ ان کارگزاریوں کے صلہ میں نوح سامانی کے دربار سے اس کو ناصرالدین اور اس کے نامور فرزند محمود کو سیف الدولہ کے خطابات ملے۔ سبکتگین اٹھارہ سال کی باجبروت حکومت کر کے ۳۸۷ھ ہجری میں دارالبقا کی طرف چل بسا اور اسمٰعیل بن سبکتگین جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا۔ بلخ میں اس کا جانشین ہوا۔ محمود بن سبکتگین غزنی میں تھا اور باپ کی زندگی ہی سے امور سلطنت میں دخیل

رہا تھا۔ اسنے اسمٰعیل سے بلخ اور غزنی کی الگ الگ حکومتوں پر سمجھوتہ کرنا چاہا۔ اسمٰعیل نے اس مداخلت کو برداشت نہ کیا اور نوبت میدان داری کی آئی۔ محمود نے اکثر معرکوں میں سبکتگین کے دوش بدوش داد شجاعت دی تھی اور کمسن سال سبکتگین سے رموز جنگ سیکھے تھے اسمٰعیل اس سے بازی نہ لے جا سکا۔ اور فتح محمود کی ہوئی۔ محمود نے بھائی کے ساتھ اور کوئی بدسلوکی تو نہ کی مگر مفاد سلطنت کی خاطر تامدت العمر نظر بند رکھا۔ اور خود تخت حکومت پر جلوہ فگن ہو گیا۔

محمود کی شاندار فتوحات اور معرکہ آرائیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آرہی ہے مگر وہ صرف ایک اہل سیف اور جرنیل ہی نہ تھا۔ صاحب قلم اور ادب نواز بھی تھا۔ اس نے دولت کو جس شان سے حاصل کیا۔ اسی طرح صرف بھی کیا۔ غزنی کو اس نے ایک جھونپڑوں کا مجموعہ پایا تھا۔ لیکن اکتیس سالہ حکومت ختم ہونے سے بہت پہلے ایک خوبصورت شہر بنا دیا اور ایک عظیم الشان عجائب خانہ اور مدرسہ قائم کیا۔ جس میں دنیا کے نوادر ملک کے مشاہیر فن کو مجتمع کر دیا۔

سلطان محمود کا دور ۳۸۷ھ ہجری سے شروع ہوتا ہے مگر اس کی داد دہش تخت نشین ہونے سے قبل جاری ہو چکی تھی اور علما و فضلا اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے باضابطہ حکومت ہاتھ میں آتے ہی آنے والوں کا سلسلہ بندھ گیا اور زینتی، عنصری، فرخی، عسجدی، منیچہک، چنگ زن، خرمی، ابوبکر، اسکاف اور ترمذی کتنے ہی شاعر غزنی کے دارالامارہ میں دکھائی دینے لگے۔ اہل علم کی ایک بڑی تعداد یکجا ہو گئی۔ جن میں ابوریحان بیرونی بھی تھے جو متعدد فنون میں حکیم بوعلی سینا کے ہمسر و ہم پلہ تھے۔ بوعلی سینا

کو بھی محمود نے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی مگر ان کو اس کی طرف سے کچھ سوءِ ظن تھا۔ اس لئے انھوں نے قبول نہ کیا۔

محمود کے دربار میں ایک ہی وقت میں اتنے فنکاروں کے سمٹ آنے کے بہت سے اسباب تھے پہلی بات تو یہ تھی کہ اُس زمانے میں ایران، عراق و شام ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ عباسی خلافت اپنا عروج ختم کر چکی تھی، آلِ سامان کی حکومت آخری ہچکیاں لینے کی تیاری کر رہی تھی، سبکتگین کے وقت تک تو غزنی بخارا سے متعلق رہا۔ لیکن محمود نے سریرآرائے سلطنت ہوتے ہی ایک کمزور کی افضلیت کو برداشت نہ کیا اور بغداد سے برائے نام الحاق کر لیا۔ دربارِ خلافت سے اس کو یمین الدولہ کے لقب سے نوازا گیا اور غزنی ایشیا کا واحد اسلامی مرکز بن گیا جہاں کسی اہلِ فن کو اہلیت کی داد مل سکتی۔ دوسرے محمود کی ذاتی جود و سخا علما و شعرا کی ہمت افزائی کا موجب بن گئی اور وہ غزنی کا شہرہ سن سن کر آنے لگے۔ محمود میں خود باکمالوں کو جمع کرنے کا جذبہ تھا اس نے بعض لوگوں کو اپنے طور پر دعوت دے کر بلایا اور غزنی ہندو مسلمان، عیسائی اور یہود ہر مذہب و ملت کے فن کاروں کا اکھاڑہ بن گیا۔

محمود کے اندازِ معاشرت اور اسلوبِ حکومت کے بارے میں علما اور فقہا کے درمیان کافی اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کے طرزِ عمل کو قطعاً غیر اسلامی قرار دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محمود خود ایک عالم فقیہ اور صوفی منش تھا اس نے حنفی فقہ میں ایک مبسوط تصنیف چھوڑی ہے اہلِ علم ہونے کے علاوہ اس کی زندگی ایک طرح پر زاہدانہ تھی مگر اسی کے ساتھ ساتھ بعض لغزشوں میں اس کا دامن آلودہ دکھائی دیتا ہے۔ منجملہ ان کے شرابخوری بھی ہے جس کا رواج سلاطین میں عموماً پایا جاتا تھا اور محمود بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تخلیہ کی نشستوں میں بلاناغہ ساغروں کی کھنکار سنائی دیتی مگر محمود نے پینے میں کبھی اعتدال سے

سے تجاوز نہیں کیا۔

اس نے اپنے اہل خاندان کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا اور بھائی بندوں پر جود و کرم کی بارش کرتا رہا۔ ایاز اس کا محبوب غلام تھا۔ اس کے متعلق کتنی ہی روایتیں زبان زد ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمود اس سے بہت مانوس تھا۔ لیکن ایاز کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جن کا وہ خیال کرتا۔ ان میں امیر نصر بن سبکتگین، فضل بن احمد اسفرائنی، بدیع الدین، ابو سہل دبیر اور خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔ یہ لوگ وہ تھے جن پر محمود کو اعتماد تھا اور جن کو سلطنت غزنی کا وفادار کہا جا سکتا۔

سلطان محمود میں قدرت نے بیک وقت بہت سے کردار جمع کر دئیے تھے۔ میدان جنگ میں اگر وہ ایک شیر غضبناک کا مثالیہ تھا تو علماء کی محفل میں علم کا سمندر اور تخت سلطنت پر بیٹھ کر نوشیرواں اور حاتم کی نظیریں پیش کرتا۔ حجرۂ عبادت میں اس کا رجوع قلب کسی عابد صد سالہ کا ہم ردیف ہوتا اور نجی صحبتوں میں حسین و جمیل رقاصاؤں کے ہاتھوں چھلکتے ہوئے جاموں کی گردش اہل نظر کو یقین کرنے نہ دیتی کہ یہ وہی محمود ہے۔ شمشیر جس کی کنیز، علم جس پر نازاں اور زہد جس کی خو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اس کی بابت متضاد رائیں لکھی ہیں۔

ان اوصاف کے علاوہ محمود ایک منتظم اور مصلح بھی تھا۔ اس نے فلاح عامہ کے بہت سے کام کئے اور غزنی کی تعمیر تو سال جلوس کے آغاز ہی سے شروع کرا دی۔ الپتگین نے جب کہسار کی نئی حکومت قائم کی تو غزنی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سولہ برس میں اس نے اس کو ترقی دے کر ایک بڑا گاؤں بنا دیا جو سبکتگین کے اٹھارہ سالہ دور میں کسی شہر کی تعریف میں آگیا اور محمود کا زمانہ تو اس کے لئے انتہائی عروج کا پیغام بن کر آیا۔ سال

ہی دو سال کے اندر نقشہ بدل گیا۔ نئی نئی عمارتیں بن گئیں۔ سبکتگین کا قلعہ اک حصن حصین بنا دیا گیا امرا اور روسا کے مکانات درست ہو گئے۔ غزنی کے ملحق ایک بڑا باغ تھا۔ اس کو قسم قسم کے پودوں سے آراستہ کیا گیا۔ نہریں نکالی گئیں۔ روشیں کاٹی گئیں۔ چمن بنائے گئے۔ اور غزنی کی بہترین تفریح گاہ تیار ہو گئی۔ جہاں سہ پہر کو مقربین سلطانی اور کبھی خود سلطان تفریح کو آتا اور اس کے کسی گوشہ میں محفلِ عیش و طرب گرم ہوتی۔

تخت سلطنت پر قابض ہونے کے دوسرے سال جب سلطان نے خراسان فتح کیا تو غزنی میں بہت خوشی منائی گئی۔ سلطان ہر مہم کی کامیابی پر ایک جشن کا التزام کرتا جس میں شعرا تہنیتی قصائد پڑھتے اور مستحقین کو انعامات دئے جاتے۔ خراسان کی شمولیت پر بھی ایسی ہی مسرت کا مظاہرہ کیا گیا۔ شاعروں نے دربارِ عام میں قصیدے پڑھے اور نوازش سلطانی سے سرفراز ہوئے۔

رات کی نشست میں شرابِ ارغوانی کا دور چلا اور محمود ایاز کی طرف دیکھ کر جھومنے لگا۔ فضل اسفرائنی وزیر اعظم۔ امیر نصر۔ خواجہ بزرگ احمد اور دیگر امرا اور روسا حسب مراتب فروکش تھے اور خراسان کی ایک رقاصہ تھرک رہی تھی۔ ابو سہل دبیر خاص بھی ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر بذلہ سنج ندیم۔ رایک رقاصہ کی سمت نگاہیں جمائے تھا۔ محمود نے اس کے رقص پر اظہار پسندیدگی کیا۔ اور خلعت عطا کرنے کا حکم دیا۔ رقاصہ آدابِ شاہی بجا لا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مگر قبل اس کے کہ اس کی جگہ پر کوئی دوسری رقاصہ آ کر حاضرین کو محظوظ کرے ابو سہل سلطان سے کچھ عرض کرنے کے لئے اجازت خواہ ہو گیا۔ محمود نے سر کی جنبش سے اجازت دے دی اور ابو سہل نے کہا کہ ہرات کی ایک آتش پرست لڑکی زیبا رخ سلطان کی فیاضی کا شہرہ سن کر غزنی آئی ہے۔ رقص اور موسیقی میں کمال رکھتی ہے

سلطان اس کو بھی ایک موقع عنایت فرمائیں۔ ابوسہل کی چڑھی بارگاہ تھی۔ محمود نے دوسری مغنیہ اور رقص کرنے والیوں کو روک کر زیبا رخ کو حاضر کرنے کا اشارہ کر دیا اور دو حسین دوشیزائیں سامنے آکر سلام کے لئے جھک گئیں۔

محمود کے ساتھ گرد و پیش بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں۔ دو تابناک چہرے اپنی چھوٹے کمرے کو جگمگا رہے تھے۔ جن کی گردنیں نسائی وقار کے ساتھ جھکی ہوئی تھیں محمود پر بھی ان کی ملاحت افروز جوانیوں نے اثر کیا اور ایک لمحے کے لئے وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ پھر اس نے "ہوں" کہہ کر سر کو اوپر کی طرف حرکت دی اور چنگ کے مدھم سُر چھڑ گئے۔

زیبا رُخ اور ماہ رُخ ہرات کی ناچنے والیاں تھیں۔ دونوں بہنیں اپنے بوڑھے غلام قابوس کے ہمراہ پچھلے چند روز قبل غزنی میں وارد ہوئی تھیں اور کسی کی زبانی ابوسہل کا نام سُن کر محمود کے حضور میں باریابی کے لئے اس کے پاس گئی تھیں۔ طامع دبیر پر انکے بیش قیمت تحائف نے اثر کیا اور اس سے زیادہ ان کے ملائک فریب حُسن نے حرف انکار زبان پر آنے نہ دیا اور اس نے کہہ دیا کہ وہ جشن کے دن ان کے لئے موقع نکال دے گا۔ ابوسہل کو مزاج سلطانی میں دخیل ہونے کا غرہ تھا اور اسی تقریب پر اس نے زیبا رُخ اور ماہ رُخ کو قبل سے بارگاہ کے متصل ایک مقام پر بٹھا دیا تھا جہاں سے وہ طلبی کی اطلاع پاتے ہی آگئیں اور چنگ کے تاروں پر حاضرین کے دلوں کو لہرانے لگیں۔

زیبا رُخ کا سن کم و بیش اٹھارہ سال اور ماہ رُخ بارہ سال کی ہوگی ان کی صورتوں میں بلا کی مشابہت تھی اور دونوں اپنے اپنے مقام پر صناع فطرت کا شاہکار تھیں مگر زیبا رُخ کی صورت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ نگاہ اک بار اس پر جم کر ہٹنے کا نام نہ لیتی اور تبسم تو اس غضب

کا تھا کہ اہل نظر کا از خود رفتہ نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ ماہ رُخ بھی بلا شک وشبہ خوبصورت تھی مگر وہ زیبا کی سی بات کہاں؟ پھر بھی اس کو بڑی بہن سے الگ کرکے دیکھا جاتا تو شباب مسحور کن اور ادائیں جان لیوا ہوتیں۔

دونوں بہنیں ایک ساتھ رہتیں۔ ایک ساتھ اٹھتیں بیٹھتیں۔ ایک ساتھ رقص کرتیں غرضیکہ کسی وقت جُدا نہ ہوتیں۔ محمود کے دربار میں بھی وہ آگے پیچھے آئیں اور برابر برابر کھڑی ہو گئیں چنگ ماہ رخ کے ہاتھ میں تھا۔ محمود نے جیسے ہی اجازت دی زیبا نے چنگ لے لیا اور اسکی انگلیاں تاروں پر دوڑنے لگیں

چند منٹ میں ایک سماں بندھ گیا۔ اونچے نیچے سروں کے تناسب اور امتزاج نے سننے والوں کو مدہوش کر دیا۔ لیکن زیبا نے اس میں زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ ماہ رخ کو اشارہ کیا وہ کمر کو ہلکا سا لوچ دے کر بیچ محفل میں آگئی اور تاروں کی کیف پرور آواز پر قدم اٹھانے لگی ایک سرے سے دوسرے سرے پر جا کر پلٹی تو سُر لانبا ہو چکا تھا۔ ماہ رُخ نے بھی رفتار بدل دی اور جتنی جلد جلد چنگ کے تاروں نے آواز میں تبدیلی کی اُسی سرعت سے ماہ رُخ کے قدموں میں تغیر پیدا ہوتا رہا اور ایک منزل ایسی بھی آگئی۔ جب اس نے فنی مہارت سے کانوں اور نگاہوں کو ہم آہنگ بنا دیا اور ایک تسلسل سے چند منٹ تک رقص کرکے ہٹ گئی۔

حاضرین کے منہ سے احسنت اور آفریں کی آوازیں نکل گئیں زیبا نے چنگ ماہ رُخ کو دیدیا۔ وہ بلا کسی درمیانی وقفہ کے اس کو بجانے لگی ایک تازہ فضا پیدا ہونے لگی زیبا نے جلد ہی ماہ رُخ کی جگہ لے لی۔ اس کے قدموں میں چھوٹی بہن سے زیادہ صفائی اور ان میں برق کی سی سرعت تھی۔ رقص کے ہنگام اپنے نازک پیکر کو خم کرکے وہ اکدم یوں سیدھی ہو جاتی کہ ناظرین کے جسم غیر ارادی طور پر اُسی کے مانند متحرک ہو جاتے۔ اک بار کئی منٹ

تک مسلسل وہ رقص کرتی رہی اور دیکھنے والوں کو اتنا مستغرق کر لیا کہ وہ اس کے سوا ہر بات کو بھول بیٹھے رقص کرتے کرتے ایک مقام پر قدم کو تھپکی دے کر اس طرح ٹھہری۔ جیسے اس کے ساتھ گھومتے ہوئے در و دیوار ٹھہر گئے ہوں۔ حاضرین اس کی رو میں بہہ رہے تھے۔ یہ اچانک ٹھہراؤ پران کو ایک لطیف دھچکا سا لگا۔ حتیٰ کہ خود سلطان پر ایسا ہی کچھ اثر پڑا اور اس کی زبان سے تعریفی کلمات نکل گئے۔ زیبا سلام کر کے پھر رقص شروع کر چکی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے کی ہر شے اس کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ سلطان اور اس کے مقربین آقا اور غلام سب کا ایک عالم تھا۔ زیبا پسینے میں شرابور ہو رہی تھی مگر جس قدر وقت گزرتا جاتا اس کے فنی مظاہرہ کا جذب بڑھتا جاتا۔ اس نے ماہ رخ سے دو ناوقت لیا اور جب رقص ختم کر کے اپنی جگہ پر جا کر کھڑی ہوئی تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اور کمرے میں اتنی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کے تنفس کی آواز بھی نہ آتی

کئی لمحات کے بعد سلطان نے انتہائی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ زیبا تھک کر چور ہو چکی تھی مگر سلطان کے التفات کو دیکھ کر اس نے چنگ سنبھال لیا اور ایک نئے انداز سے اس کی انگلیاں حرکت کرنے لگیں۔ ماہ رخ شانہ سے شانہ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور زیبا کی نغمہ بار آواز آہستہ آہستہ نکلنے لگی۔

دقیقی کا ایک مصرعہ اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس نے ادا کیا۔ پھر ماہ رخ سے مل کر اس کو دہرایا اور پہلا مصرعہ ختم ہوتے ہی دوسرا شروع کر دیا۔ شعر پورا ہونے سے قبل رنگ محفل بدلنے لگا۔ اور وہ مشکل سے تین شعر پڑھ سکی ہو گی کہ حاضرین ایک ولولہ کے ساتھ جھومنے لگے۔ محمود نے بارہا دقیقی کا کلام سنا تھا مگر اس وقت وہ جتنا موثر ثابت ہو رہا تھا اس کا تجربہ اس سے قبل نہ ہوا تھا۔ زیبا نے سلطان کی فرمائش پر ایک ایک شعر کئی کئی بار

پڑھا اور ایک سلسلہ کے پندرہ بیس شعر پڑھ کر خاموش ہوگئی۔ سلطان پر وجدان کی کیفیت طاری تھی۔ زیبا کے خاموش ہو جانے پر بھی ایک لحظہ تک وہ جھومتا رہا۔ پھر اس کا دامن اشرفیوں سے بھر دینے کا حکم دے دیا۔ زیبا اور ماہ رُخ اظہار تشکر میں جھک گئیں۔ اور محمود نے علی قریب حاجب خاص کو ان کے قیام وطعام کا انتظام کر دینے کو کہہ دیا۔

ہرات کی ماہ پارائیں بارگاہ کے باہر آگئیں۔ غلام انتظار میں موجود تھا۔ حاجب نے دو سپاہی ساتھ کر کے ان کو مہمان خانے میں پہونچا دیا۔ جہاں سے دوسرے دن وہ ایک عالیشان مکان میں منتقل ہوگئیں جو سلطان نے ان کو عطا کیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد سلطان نے ابوسہل سے ان کی بابت تفصیلات دریافت کیں اس کو عمومی باتوں کے علاوہ کچھ معلوم نہ تھا وہی اس نے بتا دیں اور ابوسہل پر کیا موقوف کوئی بھی ان کے متعلق کچھ نہ جانتا۔ ہرات میں بھی لوگ اسی قدر واقف تھے کہ ان کے نام زیبا رخ اور ماہ رخ ہیں اور وہ وقت کی بہترین رقاصائیں اور گانے والیاں ہیں۔ محمود کا التفات عام سطح سے بلند تھا اور کوئی اجنبی اس کو دیکھ کر یہی سمجھتا کہ زیبا حرم سلطانی میں داخل کرلی جائے گی۔ لیکن مزاج داں لوگ جانتے تھے کہ سلطان کو اپنے نفس پر قابو ہے۔ وہ حسن کو دیکھنے پر اکتفا کرے گا۔ چھونے کو روا نہ رکھے گا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ ہی دوسرے دن پھر ان کو مجرے کا موقع دیا گیا اور وہ دامنوں کو بھر کر قیام گاہ کو واپس ہوئیں۔

محمود کی نگاہ میں زیبا ہر اعتبار سے اس نوازش کی مستحق تھی۔ ایک تو وہ اس قدر حسین تھی کہ اس پر مہربان نہ ہونا محمود کیا کسی اہل دل کے بس کی بات نہ تھی۔ دوسرے وہ اپنے فن میں ماہر تھی۔ اور اس کا شمار کاملین میں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ وہ گلوکار

بھی اپنی جگہ پر ایسا وصف تھا کہ جب وہ کسی شعر کو پپیہے کی کوک میں ادا کر دیتی تو اس کی آواز قلوب کی گہرائی میں اتر جاتی اور سننے والے سحر زدہ ہو کر رہ جاتے۔

محمود ہنرمندوں اور فنکاروں کا قدردان تھا۔ جہاں اس کے دربار سے چار سو شاعر اور کتنے ہی عالم و فاضل فیضیاب ہوتے وہاں زیبا اور ماہ رُخ پر بھی ابرِ کرم کی بارش ہوئی۔ اور ہرات کی رقاصائیں قابلِ رشک زندگیاں گذارنے لگیں۔

باب (۶)
طوس کا مسافر

فردوسی گھنٹوں ایک عالم میں بیٹھا رہا۔ اور کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ عراق، ایران اور شام کے تمام چھوٹے بڑے فرمانرواں کے نام حافظے میں آتے رہے مگر نگاہ کسی پر نہ ٹھہری سامانی تاجدار علم و ادب کے پر در دگار تھے وہ مر چکے تھے اور بخارا اپنے آخری دن دیکھ رہا تھا۔ فردوسی کا خیال تھوڑی دیر کے لئے دلیمیوں پر جمتا اور وہ ہرات کی سمت جانے کو تیار ہو جاتا لیکن ان کی بابت یقین واثق نہ تھا کہ وہ اس کو اپنے دامن میں جگہ دیں گے۔ اس لئے ہمت پست ہو جاتی اور وہ پھر غور و فکر کرنے لگتا۔

اسی اثنا میں حسین قتیب کے آنے کی خبر ملی اور وہ زنانخانے سے باہر آ گیا۔ حسین قتیب کے ساتھ علی دیلم بھی تھا۔ انھوں نے اس کے چہرے سے کسی تفکر کا اندازہ کر لیا اور اس کا سبب پوچھنے لگے۔ فردوسی نے پہلے تو ٹال دینا چاہا لیکن جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہہ دیا کہ فرنگیس کی بابت سوچ رہا ہے۔ وہ جوان ہو گئی ہے اس کی شادی کا وقت آ گیا ہے۔ دونوں امیرزادوں نے یک زبان ہو کر اطمینان دلایا کہ اس میں پریشان ہونے کی بات کیا ہے؟ انتظام ہو جائے گا۔ فردوسی ان کی تسکین دہانی پر آبدیدہ ہو گیا۔ منہ سے ایک آہ نکل گئی اور کہنے لگا ــــــ "

"میں تم لوگوں کے خلوص پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ بھتا راہی سہارا تھا۔ جس نے مجھ کو ہر حال میں خوش رکھا۔ اور شاہنامے کے اڑتالیس ہزار شعر لکھوا دئے۔ نوشابہ میرے تغافل اور افلاس کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی۔ اور میں نے معمول میں فرق آنے نہ دیا۔ کڑیل جوان قاسم کمر کو خم کر گیا۔ مگر میرے قدموں کو لغزش نہ ہوئی۔ اب فرنگیس کی باری ہے اور میرا بھی آخر وقت آ پہونچا ہے۔ مانا کہ تم لوگ اور بودلف مل جل کر اس فرض سے چھٹکارا دلا دوگے۔ مگر میں نوشابہ سے سرخرو نہ ہو سکوں گا۔ میری وفا شعار رفیقہ حیات زندگی کی تلخیوں کا شکار ہوگئی۔ اس کی تلافی اگر میں بیٹی کے ساتھ نہ کرسکا تو پیچھے قبر میں تنگ لگے گی۔" فردوسی ایک لمبی آہ کھینچ کر خاموش ہوگیا۔ اور حسین قتیب اور علی دیلم سر جھکا کر سوچنے لگے۔

فردوسی جو کچھ چاہتا تھا۔ وہ ان کے امکان کی بات نہ تھی۔ اپنی حیثیتوں سے زیادہ وہ اس کے ساتھ سلوک ہوتے رہے تھے۔ فرنگیس کی شادی میں بھی حتی المقدور کوتاہی نہ کرتے۔ مگر کسی تاجدار کی سی مراعات۔ کہاں سے ممکن ہوتیں؟ اس کے علاوہ فردوسی کے لئے حسین قتیب خود ایک تجویز ذہن میں رکھتا تھا۔ لہذا موقع آجانے پر بلا، تردد فوراً اس نے کہہ دیا کہ وہ غزنی کو چلا جائے۔ محمود کی فیاضیوں کا شہرہ طوس تک پہنچ چکا تھا فردوسی کے کان بھی اس سے آشنا تھے۔ لیکن غزنی ایک نئی حکومت تھی اور محمود کو تخت نشین ہوئے دو ڈھائی سال ہوئے تھے۔ اس لئے وہ وہاں سے زیادہ توقعات نہ کرتا۔ حسین قتیب کی تجویز کے جواب میں اس نے ایسی ہی باتیں پیش کردیں۔ حسین قتیب صحیح حالات سے باخبر تھا اس نے امید دلائی کہ وہ خدا کا نام لیکر ہمت کرے۔ غزنی سے انشا اللہ اس کی مراد بر آئے گی فردوسی نے فرنگیس کی نگرانی اور

رہنے سہنے کا سوال اٹھایا اور حسین قتیب نے اس کا ذمہ بھی لے لیا۔

اسی درمیان میں بودلف بھی آ گیا۔ علی ویلم نے اس کو صورت حال سے باخبر کیا۔ بودلف کو بھی فردوسی سے بہت انس تھا۔ اس کی جدائی کے خیال سے وہ مضمحل ہو گیا۔ لیکن فردوسی ایک ایسی مہم پر جا رہا تھا۔ جس سے اس کا اور اس کی چہیتی بیٹی کا مستقبل وابستہ تھا۔ اس لئے اس نے اختلاف نہ کیا۔ علی ویلم اور بودلف نے زادراہ کا انتظام کیا۔ فرنگیس اور نوشابہ کی کنیز کا حسین قتیب کے سپرد ہو جانا طے ہو گیا۔ اور فردوسی اہتمام میں سفر میں لگ گیا۔

شاہنامہ کے اوراق یکجا کر کے باندھ لئے گئے۔ اور باپ بیٹی ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر سامان درست کرنے لگے۔ فردوسی کی عمر انہتر ستر سال کی ہو چکی تھی چالیس بیالیس سال کے سن میں نوشابہ کا ساتھ ہوا تھا۔ کم و بیش پندرہ سال وہ زندہ رہی اور اتنی ہی مدت اس کے انتقال کو گذر چکی تھی۔ فردوسی نے ہر گرم و سرد برداشت کیا تھا مگر گھر چھوڑنے کا نام نہ لیا تھا۔ فرنگیس کی خاطر جاتی کا کام بڑھاپے میں کرنے جا رہا تھا اور اس کا دل خود بخود امنڈا آ رہا تھا۔ لیکن فرنگیس کے خیال سے ابرو پر شکن نہ آنے دیتا۔ اس نے جس وقت سے سنا تھا یوں ہی پھول سا چہرہ کھلا گیا تھا۔ باپ کو روتے دیکھتی تو پچھاڑیں کھانے لگتی۔

فردوسی کی ابتدائی عمر شاداب میں کٹی تھی مگر ماں باپ کے انتقال کے بعد سے وہ مستقلاً طوس کا ساکن ہو گیا تھا اور اسی مکان میں عمر کا بیش قیمت حصہ گذرا تھا اس کے ذرے ذرے سے اس کو مناسبت تھی۔ مگر فرض بہر حال فرض ہوتا ہے۔ فردوسی نے دل پر پتھر رکھ لیا اور حصول مقصد کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے پر تیار ہو گیا۔

روانگی کے لئے تین چار روز بعد کی تاریخ مقرر ہوئی تھی لیکن ابھی سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک ایک چیز کو وہ یاس بھری نگاہ سے دیکھتا۔ فرنگیس پر نظر ڈالتا اور آہ بھر کر سر جھکا لیتا۔ ایک روز فرنگیس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ وہ اس کے بغیر رہ نہ سکے گی۔ بیٹی کا ساتھ جانے کا مطالبہ بے جا نہ تھا لیکن فردوسی پردیس میں اس کو کس طرح لے جاتا؟ نوشابہ کی نشانی کو پیشانی کا بوسہ کر اس نے جدا کیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر گلوگیر لہجہ میں سمجھایا کہ دل برداشتہ نہ ہو۔ جلد ہی وہ اس کو بلالے گا یا خود آجائے گا۔ فرنگیس نوشابہ کی بیٹی تھی۔ بات کا محل سمجھتی تھی۔ اس نے ضبط سے کام لیا اور آنکھیں پونچھ لیں۔

درمیانی دن اور راتیں ایک کرب میں کٹتی رہیں۔ فردوسی نے شاہنامہ کو باندھ کر رکھ دیا تھا اور جذباتی ماحول میں بسر کر رہا تھا۔ نوشابہ قدم قدم پر یاد آرہی تھی اور وہ بار بار اس کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا کہ اب تو شاید وہ اس سے ناراض نہ ہو کیونکہ فرنگیس کے لئے وہ طوس کو چھوڑ رہا تھا۔ اس طوس کو جس کو حسین بیوی کی محبت اور جوان بیٹے کا غم بھی چھڑا نہ سکا۔ فردوسی کو اپنے تخاطب کا کوئی جواب نہ ملتا تاہم محسوس ہوتا کہ نوشابہ خوشنودی کا اظہار کرتی جس کے نتیجہ میں فردوسی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ کھیل جاتی۔

آخر وہ رقت انگیز ساعتیں بھی آگئیں۔ جب فردوسی نے اپنے گھر میں تالے ڈال کر فرنگیس اور بوڑھی کنیز کو حسین قتیب کے مکان کا ساکن بنا دیا اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی بیٹی کو آغوش میں لے لیا۔ رومال سے اس کے اشک پاک کئے۔ حسین قتیب کو تاکید کی کہ اس کو باپ کی جگہ پر سمجھے جس کے کہنے سے سرتابی نہ کرے

اوراس کی عدم موجودگی میں رو رو کر پریشان نہ ہو غمخوار بیٹی کے اشک اُبلے پڑ رہے تھے۔ لیکن وہ فردوسی اور نوشابہ کی لڑکی تھی آنسوؤں کو پی گئی۔

فردوسی نے فرنگیس کے بعد کنیز سے مخاطبت کی وہ بھی زار و قطار رو رہی تھی اس نے اسکو بھی تسلی دی اور اس کا فرض یاد دلایا کہ نوشابہ فرنگیس کو اس کے سپرد کر گئی تھی وہ اس کو فراموش نہ ہونے دے اور ایک ماں کے فریضہ کا احساس کرتی رہے۔ کنیز نے غفلت نہ برتنے کا وعدہ کیا اور فردوسی دونوں کو گریاں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

شہر کے باہر ایک گھوڑا گاڑی لگی ہوئی تھی جس پر فردوسی کا سامان رکھا جا چکا تھا طوس کے باشندوں کا ہجوم گاڑی کو گھیرے ہوئے تھا۔ فردوسی حسین قتیب کے ساتھ پہنچا تو وہ سب آبدیدہ ہو گئے۔ فردوسی ان کا ہم وطن ہی نہ تھا وطن کی آبرو بڑھانے والا بھی ان کے دلوں میں اس کے لئے محبت اور عقیدت کا جذبہ تھا۔ فردوسی ایک ایک آدمی سے خلوص کے ساتھ گلے ملا اور آخر میں صرف اس کے مخصوصین رہ گئے۔ ان سب کے اشک بہہ رہے تھے فردوسی باری باری بو دلف علی دیلم اور حسین قتیب سے بغلگیر ہوا اور بقیہ زندگی پھر ملنے کی امید پر گھوڑا گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ کوچبان نے راس سنبھال لی۔ فردوسی نے سر نکال کر اپنے عقیدتمندوں کو دیکھا ان کی نگاہیں گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ تحمل فردوسی کو دشوار ہو گیا۔ مگر اس نے سر اندر کر لیا اور کوچبان نے راس ڈھیلی کر دی۔

ایک فرلانگ نکل کر اس نے پھر جھانک کر دیکھا۔ کچھ لوگ واپس ہو رہے تھے مگر اکثریت جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔ فردوسی کئی روز سے مسلسل روتا رہا تھا۔ لیکن اس وقت جس تڑپ کے ساتھ رویا۔ اس طرح بہت کم رویا ہو گا۔ پھر بھی زیادہ دیر اس کی یہ کیفیت نہ رہی دل کو آپ سے آپ ایک تسلی ہونے لگی اور وہ نوشابہ کے خیال سے سرخرو ہونے کا

احساس کرنے لگا۔

طوس سے غزنی کا سفر ایک طولانی سفر تھا مگر فردوسی کو اس میں زیادہ طوالت نہ ہوئی کیونکہ اس سے قبل اس کا کلام گردونواح کے ہر مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جس کسی کو اس کی بابت معلوم ہوا کہ وہ شاہنامہ کا مصنف ہے اس نے اس کی آؤ بھگت کی۔ لیکن فردوسی راہ میں کسی منزل پر دو تین روز سے زیادہ نہ ٹھہرا۔ اس لئے عام لوگوں سے اس کا تعارف نہ ہو سکا۔ سفر خرچ کے لئے کافی رقم ساتھ تھی ہر مقام پر وہ چوبیس گھنٹے یا چھتیس گھنٹے آرام کرکے گاڑی کا انتظام کرتا اور آگے کو بڑھ جاتا۔ اس طرح مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ہرات پہونچ گیا۔

نوشابہ کی زندگی میں تاریخی واقعات کی تحقیق میں وہ اسی راستہ پر گذرا تھا۔ اس لئے تھوڑی بہت واقفیت تھی مگر اُس وقت اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اس لئے گھومتا پھرتا ہوا ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچا تھا۔ ابکی اس کو جلد سے جلد سلطان محمود کے دربار میں باریابی حاصل کرنا تھی۔ لہٰذا روا روی کرتا ہوا جا رہا تھا۔ ہرات میں بھی زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر ہرات و بلخ میں بہت سے لوگوں سے اس کے تعلقات ہوگئے تھے۔ اس لئے ہرات میں کئی روز قیام کا منصوبہ بنایا اور ایک سرائے میں جا کر ٹھہر گیا۔

فردوسی کو اس بوڑھے آتش پرست سے خاص طور پر ملنا تھا جس سے اس نے تاریخ فارس کے بہت سے واقعات معلوم کئے تھے۔ لیکن اس مقصد میں اس کو ناکامی ہوئی بوڑھا زردشتی اس کے پہلے سفر کے چند برس بعد ہی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔ فردوسی کو اس کے مرجانے کا رنج ہوا اور اس نے اس کے کسی وارث کی بابت

دریافت کیا۔ اہل محلہ میں ایک شخص نے بتایا کہ وہ ہرات میں نووارد تھا۔ اور غالباً بلخ کا رہنے والا تھا۔ ایک غلام کے سوا اس کا کوئی نہ تھا۔ جو بوڑھے دستگیر کے مرنے کے بعد کہیں چلا گیا۔ کافی عرصہ بعد وہ خوبصورت رقاصاؤں کے ساتھ آیا۔ کئی برس اسی مکان میں رہا۔ پھر یکایک غائب ہو گیا۔ فردوسی وہاں سے دوسرے ملاقاتیوں کی طرف چل دیا ان لوگوں کے لئے وہ ایک احسان کا جذبہ رکھتا تھا۔ پچھلے سفر میں انھوں نے اس کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ کیا تھا۔ اس لئے فردوسی ان سے مل کر دوبارہ ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

ہرات میں فردوسی کا نام غیر معروف نہ تھا مگر شاہنامہ کی اتنی شہرت نہ تھی جتنی ہونا چاہیئے تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسافت بعید کے باعث فردوسی کے اشعار بمشکل وہاں پہونچتے۔ پھر بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کو بکثرت اشعار یاد تھے۔ وہ دوسروں کو سناتے اور خاص خاص محفلوں میں فردوسی کا تذکرہ ہوتا۔

فردوسی کے شناسا اس کی شخصیت سے واقف ہو چکے تھے انھوں نے اس کا پرزور خیر مقدم کیا۔ اور ہر شخص اپنا مہمان بنانے پر مصر ہو گیا۔ فردوسی نے دوستوں کے خلوص کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور یکے بعد دیگرے ایک ایک دو دو دن ہر ایک کے وہاں ٹھہرا اسی زمانے میں اس کی ملاقات ہرات کے ایک رئیس اسمٰعیل وراق سے ہوئی۔ اس کو شاہنامہ سے بہت دلچسپی تھی اور کافی تعداد میں اس کے اشعار یاد تھے۔ فردوسی نے دیرینہ شناساؤں کے بعد اسمٰعیل کے عالی شان مکان پر قیام کیا۔ اسمٰعیل ایک صاحب ذوق اور ادب پرور رئیس تھا۔ اس نے فردوسی کو اس وقت تک جانے نہ دیا۔ جب تک از اوّل تا آخر انتالیس ہزار شعر سن نہ لئے اس کے بعد بھی وہ اس کو روکنا چاہتا۔ مگر فردوسی چونکہ ایسے دربار کا

عازم تھا. جہاں سے اس کو گرانقدر عطایے کی امید تھی. اس لئے اس نے زادراہ دیکر رخصت کر دیا اور غزنی میں اپنے بعض جاننے والوں کو خطوط بھی لکھ دیئے. جن میں ایک خوا[illegible]س اسفرائنی وزیر اعظم کے نام بھی تھا.

فردوسی ہرات میں دو ماہ قیام کرکے غزنی کی طرف روانہ ہوا تو اس کی توقعات بڑھ چکی تھیں اور وہ اس کو فرنگیس کا مقدر سمجھ رہا تھا.

باب (۷)

فردوسی کی منزل

ہرات سے غزنی کا سفر فردوسی کے لئے ایک یادگار سفر تھا۔ ایسے پیچیدہ اور ناہموار پہاڑی راستوں میں کاہے کو اس کا گذر رہا ہوگا۔ مگر مشکل اس کے لئے کوئی مشکل نہ رہی تھی ضعیف قویٰ کو قوت ارادی نے توانا کر دیا تھا۔ دشوار اور تکلیف دہ سفر کو راحت کے لمحات کی طرح وہ طے کرتے گیا اور غزنی کی عمارتوں کی چوٹیاں دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا یہی اس کی منزل تھی۔ جہاں وہ ناخوشگوار ماضی کی تلافی اور بیٹی کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے آیا تھا۔

بن جانا بوجھا مقام۔ اجنبی لوگ۔ کسی کی صورت سے بھی آشنا نہیں۔ شہر پناہ میں داخل ہونے کے بعد سے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اس کو ٹھہرنا کہاں ہے؟ مسافر کی قیام گاہ سرائے ہوتی ہے۔ فردوسی نے بھی ایک شخص سے پوچھکر ادھر ہی کا رُخ کر دیا اور ہرات کے ایک مسافر کی حیثیت سے جاکر مقیم ہو گیا۔

شام کے جھٹپٹے میں وہ غزنی میں وارد ہوا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرنے ٹھہرانے میں لگا۔ اس عرصہ میں اندھیرا ہو گیا۔ اور ایک پردیسی کے لئے کہیں آنے جانے کا امکان نہ رہا۔ رات اس نے سفر کا تکان دور کرنے میں کاٹ دی۔ صبح کو نہا دھو کر ناشتہ کیا اور کپڑے پہن کر قیام گاہ سے باہر نکل آیا۔

اسمٰعیل وراق کے تین خط اس کے ساتھ تھے۔ ان کے پتے سرائے میں معلوم کر چکا تھا صبح سے دوپہر تک دو شخصوں سے ملا۔ وہ اخلاق کے ساتھ پیش آئے فردوسی کا نام ان کے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سوا اسمٰعیل اس کا سفارشی تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ امیر نصر بن سبکتگین کے ذریعہ کوشش کریں گے۔ اور اگلے دن انھوں نے فردوسی کو امیر نصر سے ملانے کے لئے وقت دے دیا۔ فردوسی وہاں سے فضل اسفرائنی کے مکان پر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دربار کو جا چکا۔ اور اس سے دوسرے دن صبح سے قبل ملاقات نہ ہو سکے گی۔ فضل کے مکان سے فردوسی پھر سرائے کو واپس ہو گیا۔ اور کھانا کھا کر قیلولہ کے لئے لیٹ گیا۔

تین چار گھنٹے میں وہ غزنی کی کئی سڑکوں پر گذر چکا تھا اور اچھی اچھی عمارتیں نظر پڑی تھیں۔ سرائے میں ایک شخص نے سلطان کے لگائے ہوئے باغ کی بہت تعریف کی تھی سہ پہر کو فردوسی کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ سرائے سے نکلا تو باغ کی سمت قدم اٹھ گئے۔ جہاں سے اس کا فاصلہ میل ڈیڑھ میل تھا۔ مگر فردوسی ٹہلتا ہوا چل پڑا اور پوچھتا ہوا پہنچ گیا۔

پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ باغ کیا تھا؟ باغِ فردوس کا ایک نمونہ تھا۔ چہار اطراف میں پھاٹک نصب تھے۔ اور ایک پھاٹک کو دوسرے سے ملانے کے لئے چوڑی سڑکیں بنی تھیں۔ جھنڈ رمنے پودے باغ کو کئی حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔ ہر حصہ چھوٹے چھوٹے چمنوں پر مشتمل تھا اور ہر چمن کو الگ کرنے کے لئے پتلی پتلی روشیں کٹی ہوئی تھیں۔ پانی کی ایک نہر قلب باغ میں جاری تھی۔ جس سے چھوٹی چھوٹی نالیاں درختوں اور پودوں کو سیراب کرنے کے لئے نکالی گئی تھیں۔ فردوسی نے تھوڑی دیر

گھوم پھر کر لطف اٹھایا، پھر ایک مقام پر تھک کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔اس کے قویٰ اگرچہ ابھی کمزور نہ تھے۔ پھر بھی سرائے سے باغ کی ڈیڑھ میل کی مسافت اور باغ میں نصف گھنٹہ کی چہل قدمی تھکا دینے کو کافی تھی۔ تاہم اس نے زیادہ وقت نہ لیا اور چند منٹ دم لیکر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ نہر میں وضو کر کے عصر کی نماز ادا کر ڈالے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا نہر تک آیا اور کنارے پر بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔

نہر شمال و جنوب لمبائی میں تھی۔ فردوسی جس مقام پر بیٹھا تھا مشرقی و مغربی پھاٹک کو جانے والا ایک راستہ اس کے قریب تھا۔ وضو کر کے وہ اٹھا تو اس راستہ پر دو گھوڑوں کی ایک گاڑی جاتے دکھائی دی جس پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک عورت کا چہرہ اس کو صاف نظر آیا اور وہ "نوشابہ" کہکر چلا اٹھا۔ اس کے قدم خود بخود گاڑی کی طرف اٹھ گئے اور وارفتگی میں وہ اس طرف کو دوڑنے لگا۔ مگر گاڑی ایک رفتار سے جا رہی تھی وہ نکل گئی۔ اور فردوسی سے زیادہ دوڑا بھی نہ گیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے تھکا ہوا تھا تھوڑی ہی دور پر اس کا دم پھولنے لگا۔ اور وہ رک گیا۔ گاڑی پر بیٹھی ہوئی عورتوں نے اس کی آواز سنی ضرور تھی کیونکہ جب اس نے بار بار نوشابہ کہا تو ایک عورت نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تھا اور فردوسی نے پوری آواز سے "نوشابہ" کہکر اس کو مخاطب کیا تھا۔ لیکن شاید اس نے فردوسی کو فاتر العقل سمجھا۔ جبھی تو گاڑی نہیں رکی۔ وہ "نوشابہ" "نوشابہ" چلاتا رہا اور گاڑی نکل ہوئی چلی گئی۔

فردوسی کے پاؤں جواب دے چکے تھے۔ پھر بھی ایک بار اس نے گاڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش کی اور چند ہی قدم پر لڑکھڑا کر گر پڑا مگر اس نے وقت ضائع نہیں کیا جھاڑ پونچھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اور وہ بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھ

رہا تھا۔

گاڑی کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی ایک دلدوز آہ کر کے وہ بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ چند لمحات تک تو کچھ سوچ سکنے کے قابل ہی نہ رہا۔ پھر اضطراب میں کچھ کمی ہوئی تو نوشابہ کے غزنی میں موجود ہونے کے امکان پر غور کرنے لگا۔ اس کو مرے ہوئے برسیں گذر گئی تھیں اور کوئی مر کر زندہ نہیں ہوتا۔ بساط ارض پر اس کے وجود کا سوال ہی کیا تھا؟ لیکن فردوسی اپنی نگاہوں کو بھی جھٹلا نہ سکتا تھا۔ اس نے ثبات عقل و ہوش میں نوشابہ کو دیکھا تھا۔ عینی مشاہدے کو فریب خیال کہہ کر وہ دل کو تسلی دے لیتا۔ مگر گھوڑا گاڑی کی شہادت سے کیونکر انکار کرتا؟ اس کی عقل دنگ تھی اور معمہ سمجھ میں نہ آتا۔ آخر اس کو یہی رائے قائم کرنا پڑی کہ نگاہوں کو دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور عورت تھی جس کو اس نے نوشابہ قرار دیا۔ کیونکہ نوشابہ سے وہ اس کج خلق کی امید نہ کر سکتا کہ وہ پکارتا رہتا اور نوشابہ چلی جاتی۔

سورج مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ عصر کا وقت تنگ رہ گیا تھا۔ فردوسی آسمان کی طرف دیکھ کر ایک کراہ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہر کے کنارے رومال بچھا کر خالق کائنات کے سجدے کے لئے جھک گیا۔

یہ وقت غزنی کے امراء اور رؤسا کی تفریح کا تھا۔ وہ باغ کے مختلف گوشوں میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اتفاق سے محمود کے درباری شاعر۔ عنصری۔ فرخی اور عسجدی بادہ ناب کا ایک دور چلا کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے اٹھے۔ ان کی نگاہ فردوسی پر پڑ گئی۔ اور وہ اس کی بد مذاقی کا مضحکہ کرنے لگے کہ ایسے سہانے موسم اور کیف آور فضا میں اتنا غیر شاعرانہ کام کر رہا ہے۔

فردوسی

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی یہ جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انھوں نے ایک غلام کو بھیج کر اس کا نام دریافت کرایا۔ فردوسی نماز ختم کر چکا تھا اس نے بتا دیا۔ اور تینوں شاعر نام سنتے ہی چونکنا ہو گئے۔ فرخی اور عسجدی تو اس کو مخل صحبت سمجھ کر دھکا دینا چاہتے۔ عنصری نے یہ فعل تہذیب اور آدمیت کے خلاف ٹھہرایا اور تجویز یہ کی کہ رباعی کا ایک ایک مصرعہ تینوں آدمی کہیں اور چوتھا مصرعہ اس کے لئے چھوڑ دیں۔ اگر وہ مصرعہ نہ لگا سکے گا۔ تو خود شرمندہ ہو کر چلا جائے گا۔۔۔۔

عنصری دربار غزنی کا ملک الشعرا تھا۔ فردوسی کے وہاں پہونچ جانے سے اس کے اقتدار کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے رباعی کے لئے ایسا قافیہ منتخب کیا جس میں چوتھا قافیہ نکل نہ سکے اور فردوسی مصرعہ لگانے سے عاجز ہو جائے۔ اس طرح اس نے ایک تیر میں دو شکار کرنا چاہے اس وقت کی صحبت سے اس کو دور کر دینا بھی اور دربار محمود تک رسائی سے پہلے بیخ کنی کے اسباب کی فراہمی بھی۔ اگر فردوسی مصرعہ پہ مصرعہ نہ لگا سکتا تو عنصری اسی شب سلطان محمود کے سامنے اس کا مذاق اڑاتا کہ فردوسی نام کا ایک شاعر طوس سے آیا ہے وہ مصرعہ پہ مصرعہ نہ لگا سکا۔ لیکن خدا جس کو عزت دے اس کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ جیسے ہی عسجدی۔ فرخی اور عنصری غلامان زریں پوش کو جلو میں لئے ہوئے فردوسی کے نزدیک آئے اور عنصری نے منصوبے کے مطابق ابتدا کی

چوں عارض تو ماہ نباشد روشن — چاند تیرے رخسار سے زیادہ روشن نہ ہوگا

فرخی نے دوسرا مصرعہ لگا!

مانند رخت گل نبود در گلشن — تیری صورت کا سا کوئی پھول باغ میں نہ ہوگا

عسجدی نے تیسرا مصرعہ کہا۔

مژگانت ہمی گزر کند از جوشن — تیری پلکیں جوشن کو توڑ کر اندر گھس سکتی ہیں

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہ تھا لیکن فردوسی ہوش سنبھالنے کے بعد سے ستر سال کی عمر تک قافیہ پیمائی کرتا آیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے غور کیا۔ شاہنامہ کے اوراق سامنے کھل گئے اور فی البدیہہ وہ کہہ گذرا۔

مانند سنان گیو در جنگ پشن — جس طرح کہ گیو کے نیزے نے پشن کی جنگ میں زرہ کو توڑ دیا تھا۔

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی اور فردوسی نے تاریخ فارس الٹنا شروع کر دی۔ شعراء کی زبانیں بند ہو گئیں۔ لیکن رشک وحسد ان کے دلوں سے جا نہ سکا بلکہ اس کی ہمہ دانی اور قادر الکلامی سے وہ اور خائف ہو گئے کہ اگر فردوسی دربار تک پہنچ گیا تو ان کی قیمتیں گھٹ جائیں گی۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گئے مگر دلوں میں طے کر لیا کہ اسکو سلطان تک پہونچنے نہ دیں گے۔

اسی اثناء میں ندیم سلطانی ماہک اس طرف کو آنکلا اور شعرائے کرام کو یکجا دیکھ کر ماجرا دریافت کیا۔ فردوسی نے مختصراً بیان کر دیا۔ ماہک فردوسی کی بابت قبل سے سن چکا تھا اور اس وقت بھی اس کی شیریں بیانی اور قابلیت سے متاثر ہوا شعراء تو چلے گئے۔ ماہک نے فردوسی کو اپنے مکان چلنے کی دعوت دی مگر فردوسی کی طبیعت میں غیرت حد اعتدال سے زیادہ تھی وہ ہر کس وناکس کا ممنون احسان ہونا گوارا نہ کرتا۔ اسی افتاد مزاج کے باعث تمام عمر مصائب جھیلتا رہا۔ لیکن قدم

طوس سے باہر نکالا اور غزنی پہنچ کر بھی سرائے میں مقیم ہوگیا۔ اسمٰعیل وراق نے جن لوگوں کو تعارفی خطوط لکھ دیئے تھے انھوں نے اپنے وہاں ٹھہرنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر وہ خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال گیا۔ اور ماہک کو بھی ایسا ہی کچھ جواب دیا! البتہ اس سے یہ استدعا کی کہ سلطان تک اس کی رسائی کی سبیل پیدا کردے۔ ماہک نے اس کا وعدہ کرلیا اپنے مکان پر قیام کرنے کے لئے مصر رہا۔ فردوسی نے جب اس سے پیچھا چھوٹتے نہ دیکھا تو رضامند ہوگیا۔ ماہک کے ساتھ سرائے میں آیا اور سامان لے کر اس کے گھر پہنچ گیا

ماہک فردوسی کا مخلص میزبان ثابت ہوا۔ اس نے اس کی آسائش کا ہر سامان فراہم کردیا۔ اور رات کا کھانا اول شب میں کھلا کر دربارداری کے لئے چلا گیا۔

فردوسی نے بستر پر دراز ہو کر باغ میں پیش آنے والے تمام واقعات کا جائزہ لیا۔ عنصری، عسجدی اور فرخی کے دلوں کا حال سمجھنے میں اس کو دقت نہ ہوئی اور رب العزت کا شکر ادا کیا کہ وہ ان کے مقابلہ پر عاجز نہ رہا۔ فردوسی کو مشرقی درباروں کی سیاست کا کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ وہ اس کو پسند کرتا۔ لیکن شعراء کے رویہ سے ایک اندازہ ضرور ہوگیا کہ اس کو کن حالات سے گذرنا پڑے گا؟ وہ اس کے لئے موزوں دل و دماغ نہ رکھتا مگر کیا کیا جاتا! کہ مقدرات نے ایسے ہی ماحول میں لا ڈالا تھا۔ بہرحال بادا باد کہہ کر مستقبل کو خدا کے سپرد کردیا اور اس عورت کے متعلق سوچنے لگا۔ جس پر اس کو نوشابہ کا شبہ ہوا تھا۔

یہ بات تو تقریباً مسلم ہوچکی تھی کہ نوشابہ سے مشابہ کوئی خاتون غزنی میں تھی جس کو دیکھ کر فردوسی کی نگاہ نے دھوکہ کھایا تھا۔ مگر وہ تھی کون؟ فردوسی

اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے مضطرب تھا۔ ماہک سے ابھی تھوڑی دیر کے تعلقات تھے۔ اس سے پوچھ نہ سکا حالانکہ بار بار جی چاہتا تھا کہ کچھ اور نہیں تو اسکی بات دو چار باتیں ہی کر لیتا۔ مانا کہ وہ نوشابہ نہ تھی۔ مگر اس کی ہم شبیہ تو تھی اور اس مناسبت سے فردوسی کو اس سے قلبی لگاؤ ہو گیا تھا۔

باب (۸)

غزنی کا دربار

اگلے روز فردوسی نے فضل اسفرائنی سے ملاقات کی اور شعیبی وراق کا خط پیش کیا۔ فضل کو علم و ادب میں زیادہ دخل نہ تھا وہ ایک جہاندیدہ مدبر اور مہمات ملکی کا ماہر تھا۔ ابتداً وہ آل سامان کا نائب میر منشی تھا وہاں سے غزنی چلا آیا اور سبکتگین کے دور میں وزارت کے عہدے تک ترقی کر لی۔ سبکتگین سے سامانیوں کے تعلقات خوشگوار رہنے میں فضل کا بھی بہت کچھ ہاتھ تھا۔ محمود نے اپنے زمانے میں اس کی خدمات کا لحاظ رکھا اور وزارت عظمیٰ کے منصب سے برطرف نہ کیا۔ پہلے سے فضل کے خاندانی تعلقات تھے۔ اور اس سے ہٹ کر بھی ایک باکمال کی حیثیت سے فردوسی اس کے نزدیک قابل اعانت تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا اور فردوسی شاد و خرم دوسرے لوگوں سے ملنے کے لئے اٹھ آیا۔

پروگرام کے موجب میمندی سے بھی اس کی ملاقات ہو گئی وہ ایک ادب نواز اور ادیب پرور شخص تھا فردوسی سے فرمائش کر کے کچھ کلام بھی سنا بس سنا اور ہر طرح اطمینان دلایا۔ فردوسی وہاں سے قیام گاہ کو واپس ہوا تاکہ دربار کا منتظر رہا۔ آتے ہی اس نے اپنے میزبان سے دریافت کیا کہ اس نے سلطنت کا

ذکر کیا؟ ماہک نے موقع نہ ملنے کا عذر پیش کیا اور واقعی اس کو موقع نہ ملا تھا۔ سلطان کو اس روز اتنی مشغولیت رہی کہ ایک منٹ کے لئے بھی خالی نہ بیٹھ سکا جو ماہک فردوسی کا ذکر چھیڑ سکتا فردوسی اس کے جواب سے دل برداشتہ ہو گیا۔ ماہک نے اطمینان دلایا کہ آنے والی شب میں وہ ضرور اس کا تذکرہ کرے گا۔ اور ہو سکا تو اسی وقت طلب کرا کے پیش کر دے گا۔ فردوسی اس کے الفاظ سے مطمئن ہو گیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

نامراد دقیقی کا شاہنامہ اور سامانیوں کی جد و جہد تمام مشرقی درباروں کی طرح غزنی میں بھی بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ سلطان محمود دربار اس کا ذکر کر چکا تھا اور جس دن سے زیبا کی زبانی دقیقی کا کلام سنا تھا۔ اس دن سے تو اس کو دھن لگی تھی کہ شاہنامہ کی تکمیل کے لئے کسی کو منتخب کرے۔ ایک روز عنصری نے اپنے طور پر رستم و سہراب کی داستان نظم کی اور شب کی نشست میں سلطان محمود کو پڑھ کر سنائی۔ دو شعروں کو حاضرین اور سلطان نے بہت پسند کیا اور عنصری کو شاہنامہ نظم کرنے کا حکم مل گیا۔

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں	بپالودی ایں خنجر آب گوں
جس وقت کہ تجھے پیاس لگتی ہے تو تو	اس آبدار خنجر کو خون میں ڈبو دیتا ہے
زمانہ بخون تو تشنہ شود	بر اندام تو موئے دشنہ شود
زمانہ تیرے خون کا پیاسا ہو جائے گا	حتی کہ تیرے جسم کے رونگٹے خنجر بن جائیں گے

ماہک کو موقع مل گیا اس نے محمود سے عرض کر دیا کہ طوس کے ایک شاعر فردوسی نے بھی شاہنامہ نظم کیا ہے اور سلطان کی حضوری کا آرزو مند ہے۔ امیر نصر اور فضل اسفرائنی نے بھی بعد دیگرے تائید کر دی۔ عنصری اور اس کے ساتھی کے شعراء کو یہ تعارف ناگوار گزرا اور اگر صرف ماہک محرک ہوا ہوتا تو فی الفور کاٹ کر دیتے لیکن امیر نصر اور فضل کی

سی شخصیتیں موجود تھیں۔ اس لئے انھوں نے زبانیں بند رکھیں اور محمود نے فردوسی کو حاضر کرنے کی اجازت دے دی۔ ماہک خود اٹھ کر آیا اور فردوسی کو لیکر پہنچ گیا۔

سلطان نے رسمی طور پر فردوسی کے حالات پوچھے۔ فردوسی نے مختصراً بتا دیئے اور اپنا کچھ کلام گوش گذار کرنے کے لئے اجازت خواہ ہوگیا۔ ایک مشرقی دربار میں کسی شاعر کا فریضہ اولین یہ ہوتا ہے کہ فرمانروائے وقت کی شان میں کوئی قصیدہ پیش کرے، مگر ماہک فردوسی کو صورت حالات سے آگاہ کر چکا تھا اور سلطان سے فردوسی نے شاہنامہ کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ اس لئے اس نے قصیدے کے بجائے رستم و سہراب کی داستان پڑھنا شروع کر دی۔

کنوں خورد باید مئے خوشگوار — کہ می بوئے مشک آرد از جویبار
اب شراب پینا چاہیے کیونکہ نہر سے — مشک کی سی خوشبو آ رہی ہے
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش — خنک آنکہ دلشاد دارد بہ نوش
ہوا میں تیزی ہے اور زمین جوش سے پر ہے — اور اتنی ٹھنڈک ہے کہ دل خوش ہو اور پینے کو جی چاہتا ہے۔

ہمہ بوستاں زیر برگ گل است — ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل است
سارا باغ پھولوں سے ڈھکا ہے — سارا پہاڑ لالہ و سنبل سے بھرا ہے

حاضرین پر وجد طاری ہوگیا اور محمود کیف میں جھومنے لگا۔ شعراء نے جب کوئی زور چلتے نہ دیکھا تو تحسین و آفریں کی صدا بلند کر دی اور عنصری نے فردوسی کے خاموش ہوتے ہی بڑھ کر ہاتھ چوم لیے۔ محمود نے خلعت عطا کر کے بطور امتحان ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں کچھ کہنے کی فرمائش کر دی اور فردوسی نے برجستہ دو شعر

سنا دیئے۔

مست است بتا! چشم تو و تیر بدست بس کس کہ زتیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ، عذرش است کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

یعنی محبوب کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں۔ ان تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں۔ اس لئے ان سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے۔ خط کو زرہ سے تشبیہ دے کر لفظ مست سے استفادہ کیا ہے اور کہتا ہے کہ مست سے سب ہی ڈرتے ہیں خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب اس کے ہاتھوں میں تیر ہوں۔

محمود اس بدیہہ گوئی سے بہت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف عنصری کے بجائے فردوسی کے سپرد کر دی۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے۔ جو تمام ضروری سازوسامان سے آراستہ ہو آلات جنگ اور اسلحہ حرب قرینے سے سج دیئے جائیں اور دیواروں پر شاہان عجم اور بہادران فارس کے مرقع اس انداز سے آویزاں ہوں کہ دیکھنے والے پر اس کا فوری اثر پڑے۔ فردوسی اس نوازش اور التزام سے بہت خوش ہوا اور باادب ہو کر عرض کیا کہ وہ ایک فلاکت زدہ شاعر ہے اور طوس سے دامنِ مراد بھرنے کے لئے نکلا ہے۔ محمود نے فی شعر ایک دینار صلہ مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ ہر ہزار شعر پر ایک ہزار دینار وصول کر سکتا ہے فردوسی نے متفرق رقم لینے کے بجائے شاہنامہ مکمل ہو جانے پر کل اشعار کا معاوضہ یکمشت لینے کی خواہش کی۔ محمود نے جس کی اجازت دے دی اور فردوسی مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا دربار سے نکل آیا۔

غزنی کے ادبی حلقے میں ایک انقلاب آگیا۔ محمود کے دربار میں شاہنامہ کا آوازہ

گو بخنے لگا۔ دقیقی کی روح اور فردوسی کے نام کو خراج عقیدت دیا جانے لگا۔ شاہنامہ کے انتالیس ہزار شعر فردوسی طوس میں کہہ چکا تھا۔ محمود نے ان اشعار کو بھی صلہ میں شامل کر لیا۔ گویا پہلے ہی دن وہ انتالیس ہزار دینار کا مستحق ہو گیا۔ اور اس کو وہ سب کچھ مل گیا۔ زائد سے زائد اس نے جس کی توقع کی ہو گی۔ ماہک کے مکان پر اپنی قیام گاہ میں پہنچکر فردوسی نے نوشابہ کو یاد کیا اور عالم خیال میں بیٹی کے شاندار مستقبل کے اسباب فراہم ہوجانے پر اس کو مبارک باد دی۔ نوشابہ کے تصور کے ساتھ وہ عورت بھی ذہن میں آ گئی جس کو اس نے باغ میں دیکھا تھا۔ ماہک سے وہ کسی حد تک بے تکلف ہو چکا تھا اس لئے صبح کو اس سے پوچھنے کا ارادہ کر لیا۔ بستر پر لیٹ کر وطن میں منتظر بیٹی کا خیال کرنے لگا۔ اور خیال کرتے کرتے سو گیا۔

دوسرے دن سلطان کی ہدایت کے بموجب فردوسی کے لئے ایک مکان مزین کر دیا گیا۔ اور دو غلام خدمت کے لئے معین ہو گئے۔ سہ پہر کے وقت فردوسی کو یہ مکان دکھایا گیا۔ اور غلام اپنے نئے آقا کے سپرد کر دیے گئے۔ فردوسی اپنے میزبان ماہک کا بہت شکر گذار تھا اس کے ساتھ وہ مکان دیکھنے کے لئے آیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ غلام ماہک کے مکان سے سامان اٹھا لائے۔ اور فردوسی ماہک سے درباری حالات پر گفتگو کرنے لگا۔

شعراء کے ذکر پر فردوسی کو باغ کا واقعہ یاد آ گیا اور اسی کے ساتھ نوشابہ کی ہم شبیہ کا نقشہ نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے ماہک کو تفصیل بتا کر دریافت کیا کہ وہ کون ہے ؟ مگر ماہک شباہت سے کچھ سمجھ نہ سکا۔ باغ میں اس قسم کی کوئی عورت اس نے نہ دیکھی تھی۔ فردوسی نام بتا سکتا تو سمجھ لیتا۔ مگر فردوسی کو نام کیا ناک نقشہ کی تفصیل کا بھی علم نہ تھا۔ لہٰذا فردوسی کا استفسار نامکمل رہ گیا۔ اور ماہک دوسرے دن ملنے

کے وعدہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

بعد مغرب فردوسی امیر نصر کا شکریہ ادا کرنے کے لئے گیا۔ نصر نے عزت کے ساتھ بٹھایا اور اس سے اظہار تشکر کے جواب میں شاہنامہ کی کوئی داستان سنانے کی فرمائش کر دی۔ فردوسی سخن فہم امیر کا کہنا ٹال نہ سکا۔ اور طوس کی گلیوں میں گشت کرنے والے اشعار ابن سبکتگین کے محل میں گونجنے لگے۔

شاعری کو پھولنے پھلنے کے لئے شاعر کا سوز دروں دل و دماغ اور راحت افزا ماحول درکار ہوتا ہے۔ شاہنامہ کو غزنی میں یہ سب کچھ میسر آگیا تھا۔ فردوسی کے حوصلے بڑھ چکے تھے اور داد و ستائش کی فضا اس کی زبان کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے پہلی ہی رات میں شاہنامہ کے صفحات میں کئی سو شعروں کا اضافہ ہو گیا اور دوسرے دن اس کے بعض بعض اجزاء سے سلطان کو محظوظ کیا گیا۔ اس کے بعد سے یہ معمول ہو گیا کہ فردوسی شب و روز شعر گوئی میں لگا رہتا معینہ وقت پر دربار میں حاضری دیتا جس روز سلطان کی طبیعت مائل ہوتی وہ فردوسی سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتا اور فردوسی کو اس کی کاوش فکر و قلم کا اجر مل جاتا

فضل اسفرائنی۔ امیر نصر اور رائب وغیرہ سے اس کے تعلقات دوستانہ ہو گئے تھے۔ دربار کے علاوہ اپنے طور پر بھی وہ ان سے ملتا رہتا اور داد سخن حاصل کر کے مسرور ہوتا کیونکہ غزنی میں اس کی کامیابی کی بنیاد یہی لوگ تھے۔ جن کے لئے اس کا دل ممنونیت کے جذبے سے لبریز تھا۔

وہ شاہنامہ کے مصنف کی حیثیت سے غزنی میں معروف ہو چکا تھا اور ایک عالم اس کے لئے عقیدت کے جذبات رکھتا۔ حتیٰ کہ سلطان کا محبوب غلام ایاز بھی اسپر

مہربان تھا لیکن اسی کے ساتھ مخالف عنصر بھی منظم ہو رہا تھا۔ رشک و حسد مشرقی قوموں کا خاصہ ہے۔ فردوسی کی اتنی قدر و منزلت دیکھ کر بعض اہل دربار خود بخود جلے جاتے تھے ان میں ابو سہل، دبیر اور خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی نمایاں افراد تھے۔ عنصری نے بظاہر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا مگر دل ہی دل میں وہ بھی خار کھا رہا تھا اور فرخی اور عسجدی وغیرہ دوسرے شاعر اس کے شریک تھے۔ اس طرح محمود کے دربار میں فردوسی سے متعلق دو جماعتیں تھیں ایک اس کی بہی خواہ اور ترقی کی جو دوسری اسے نیچا دکھا دینے کی فکر میں۔ مگر دوسری جماعت کچھ کر نہ رہی تھی۔ اس لیے اس کو ریشہ دوانی کا موقع نہ ملتا۔ اور فردوسی کی وقعت سلطان کی نگاہ میں بڑھتی جاتی۔

شاہنامہ میں ہر روز سو دو سو شعروں کا اضافہ ہو رہا تھا اور فردوسی کی چالیس پچاس سال کی مشق کام آ رہی تھی رات کا کچھ وقت ماضی کے خیال میں ضرور گذرتا۔ جوانا مرگ قاسم۔ نامراد نوشابہ۔ منتظر زنگیس یاد آتی۔ فردوسی کو تاسف ہونے لگتا کہ طوس سے باہر نکلنے میں اگر وہ اتنی تاخیر نہ کرتا تو جوان بیٹا اور وفا شعار محبوبہ مفلوک الحالی میں نہ مرتی پھر بھی وہ خوش تھا کہ قسمت میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ پورا ہوا۔ نوشابہ ایک مشرقی عورت کے تحمل کی نظیر قائم کر کے مر گئی۔ تو وہ اس کی نشانی زنگیس کو زر و جواہر سے لاد دے گا۔ اور یہ نوشابہ کے صبر کا پھل ہو گا۔

مفلس زندگی کی بعض ساعتوں میں جوانی کے دنوں کا تصور کر کے نوشابہ کی محبت بوڑھے فردوسی کے دل میں تازہ ہو جاتی آنکھوں میں

آنسو بھر آتے اور ایک تسلسل سے وہ اُس کو یاد کرتا رہتا۔ آخر میں چند آہیں بھر کر رہ جاتا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ نہ یہ شغل اس کے لئے نیا تھا۔ پندرہ بیس سال سے وہ اس پر عامل رہا تھا۔ اور زندگی کی آخری سانس تک اس کو عمل کرنا تھا۔

باب (۹)

ہرات کی رقاصائیں

زیبا اور ماہ رُخ کہنے کو ناچنے گانے والی لڑکیاں تھیں لیکن محمود کے دربار میں ان کا شمار فنکاروں میں تھا اور وہ تھیں بھی فنکار۔ خصوصیت کے ساتھ زیبا تو فنکار آخر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ ہر بات اس میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ صورت پائی تھی تو اس غضب کی کہ سطحی نگاہ جسم سے زائد کی آرزو نہ کر سکے۔ بات کرنے کا طرز تھا تو اتنا مسحور کن کہ انسان چند الفاظ سنکر عالمِ خیال میں پہونچ جائے۔ گلے میں سوز تھا تو اس بلا کا کہ چند مصرعے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پڑھ دے تو وہ خود اپنا رگِ گلو کاٹنے کو تیار ہو جائے۔ اور رقص کرتی تو ماحول پر اس طرح چھا کر کہ ہر شے اس کے ساتھ رقصاں ہو جائے۔ غرضیکہ جو انداز تھا وہ نرالا۔ جو ادا تھی وہ انوکھی اور اس کی انھیں خوبیوں نے سلطان کی نگاہ میں جگہ اور کتنے ہی درباریوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا مگر خود اس کو کسی کے التفات کی پرواہ نہ تھی۔ سلطان جب طلب کرتا ماہ رُخ کے ساتھ حاضر ہو جاتی۔ فن کا مظاہرہ کر کے خوش کرتی اور اجازت پا کر چلی جاتی۔

سلطان نے اس کو دارالامارہ سے نزدیک ایک مکان مرحمت کر دیا تھا۔ اسی میں اپنے غلام قابوس کے ساتھ رہتی۔ کسی کسی دن سہ پہر کو ماہ رخ کو لے کر ہوا خوری کو

چلی جاتی۔ یا ابو سہل کے مکان کا رُخ کرتی اس کے علاوہ نہ اس کا کہیں جانا تھا نہ آنا اور نہ کسی سے تعلقات قائم کئے تھے۔ ابو سہل کو یہ عزت ضرور حاصل تھی کہ جب چاہتا اس کے وہاں چلا جاتا اور وہ اس کو خوش آمدید کہتی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ ابو سہل کی ممنون احسان تھی اس کی دلشکنی نہ کر سکتی۔ ورنہ طبعی طور پر اپنے وہاں کسی کی آمد و رفت اس کو پسند نہ تھی۔

وہ ایک پُر اسرار اور اعتکاف کی زندگی گذار رہی تھی۔ چھوٹی بہن ماہ رخ اور کہن سال غلام قابوس جس میں شریک تھا۔ محمود نے خدمت کے لئے ایک غلام اور ایک کنیز عطا کی تھی۔ زیبا کے خاص کمرے میں ان کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے فرائض اوراوقات مقرر تھے۔ قابوس کی زیر ہدایت وہ گھر کے کاموں کو انجام دیتے کنیز کو کسی کسی وقت ماہ رخ کی حضوری کا موقع مل جاتا۔ وہ بھی اس وقت جب زیبا رخ اپنے کمرے میں مطالعہ کرتی ہوتی اور ماہ رُخ کو جی بہلانے کے لئے کسی ہم جلیس کی ضرورت ہوتی تو وہ کنیز کو بلا لیتی۔ اور اس سے غزنی اور محمود کے متعلق بات چیت کرتی رہتی۔

زیبا کا مکان ایک اوسط درجہ کا مکان تھا جو پانچ کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل تھا۔ دو کمرے برآمدے کی لمبائی میں برابر برابر اور دو ادھر اُدھر تھے۔ صحن میں ایک طرف باورچیخانہ اور حمام وغیرہ تھا۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا۔ جس کے تین دروازے باہر کو کھلتے اور ایک اندرونی صحن میں۔ اس کو زیبا نے نشست گاہ بنا رکھا تھا اور اندر کے چار کمروں میں پہلو کے دو کمرے غلاموں اور کنیز کے اور برآمدے والے دونوں کمرے اس کے اور ماہ رخ کے تھے۔

زیبا کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا۔ طبیعت کسی وقت کسلمند ہوتی تو صحن میں

نکل کر ٹہل لیتی پھر کمرے میں داخل ہو جاتی۔ ماہ رخ کو اس نے مکان کے اندر آزادی سے اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے کی اجازت دے رکھی تھی مگر باہر نکلنے کی ممانعت تھی اور کسی سے ملنے ملانے کو بھی روکا تھا۔ ماہ رخ بہن کے حکم کی تعمیل کرتی اور وہ اس زندگی کی خوگر ہو گئی تھی کیونکہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اسی پر عامل تھی۔

ماہ رخ کا سن بارہ ساڑھے بارہ سال کا تھا اور وہ جوانی کے دائرے میں قدم رکھ چکی تھی اس کی آنکھوں میں خمار کی کیفیت اور قدموں میں مستانہ روی پیدا ہو چلی تھی، مگر اس کی تشبیہ اس کلی کی تھی جس کی پنکھڑیاں تبسم کی سازگار فضا سے دور شگفتگی کے لئے منہ کھول رہی ہوں۔ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر اکثر اس کو ایک حیا کا سا احساس ہونے لگتا۔ لیکن اس سے زائد وہ کچھ خیال نہ کر سکتی۔ کیونکہ زیبا نے اس کو اتنا موقع ہی نہ دیا تھا کہ کسی جوان رعنا کی نگاہوں کا جواب دیتی یا اپنے حسن و شباب کے بارے میں کچھ سن سکتی۔ برسوں سے وہ زندگی کے ایک راستہ پہ چلنے کی عادی تھی بہن کے ساتھ رقص و سرود کی محفلوں میں جاتی، اپنا فرض ادا کرتی اور دنیا کی ملتفت نگاہوں کا جواب ایک بے نیازی سے دیتی ہوئی اپنے مقام پہ واپس ہو جاتی۔ یہ اظہار بے نیازی ماہ رخ کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا اور وہ اپنے کو اس کا مستحق سمجھتی۔ کیونکہ زیبا نے ہمیشہ اس سے اسی کا مظاہرہ کرایا تھا اور وہ جذبات دوسروں کی نمائش کی خوگر ہو گئی تھی۔

ماہ رخ نے اکثر اپنے مقصد حیات پہ غور کیا تھا اور خود بخود مضمحل ہو گئی تھی ماں باپ اور خاندان کے متعلق دو چار کچی پکی باتیں اس کو معلوم تھیں اور ان کے بارے میں بھی وہ رازداری کی پابند تھی۔ جس نے آنکھیں کھول کر ماہ رخ اور بوڑھے غلام قابوس کو دیکھا تھا اور اس کے خیال میں اس کی دنیا انھیں تک محدود تھی۔ انھیں

سے اسنے رائج الوقت علوم سیکھے۔ انھیں نے اس کو ناچنا گانا سکھایا اور پہلی بار سے لے کر اس وقت تک وہ برابر انھیں کے ساتھ کسب معاش کے لئے رقص کرتی رہی تھی۔ جس کے آگے اس کے خیال کی رسائی کا میدان تنگ تھا۔ لیکن حیات شباب دل میں ایک امنگ پیدا کر رہے تھے اور ماہ رُخ کا جی چاہتا کہ وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح خوشگوار زندگی کا کوئی منصوبہ بناتی مگر اس کا شمار تو جیسے دنیا والوں میں تھا ہی نہیں۔ زیبا نے اسکو بتایا تھا کہ اس دنیا میں کوئی اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اس کو بڑی بہن کے کہنے کا یقین تھا یہی کہہ کر وہ جوانی کے ولولوں کو سمجھا دیتی اور قدم حدود احتیاط سے باہر نہ کالتی۔

زیبا کو غزنی میں کئی مہینے گذر چکے تھے۔ اس مدت میں غزنی کا ذرہ ذرہ اس سے شناسا ہو چکا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جو کوئی ایکبار اس کو دیکھ لیتا پھر فراموش نہ کر پاتا۔ اور محمود کے دربار میں تو بعض لوگ بلا امتیاز سن وسال اتنے گرویدہ ہو رہے تھے کہ بغیر اس کے بیقرار رہتے۔ ان میں چند آدمی جوان تھے چند ادھیڑ اور بوالہوس بوڑھے اور ابو سہل اور ماہک کے سے مخصوصین بھی عشاق میں شامل تھے ـــــــ ماہک سلطان کا خوش رو ندیم اور فردوسی کا نیکخو میزبان تھا۔ اس کا سن چالیس سال کے اوپر تھا۔ مگر آسائش کی زندگی نے قویٰ میں انحطاط پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ اور ابھی جوان معلوم ہوتا۔ اس نے جس دن سے زیبا کو دربار میں دیکھا تھا اس پر شیدا ہو گیا تھا۔ مگر سلطان کی خصوصی عنایت کسی آرزو کو دل میں جگہ دینے کی اجازت نہ دیتی۔ زیبا کی ہر بات اس کی نگاہ میں مجنوں بنا دینے والی تھی۔ صورت شکل سے زیادہ وہ اس کے گانے پر مفتون تھا۔ لیکن اس کا عشق

صرف خیال تک محدود تھا۔ زیبا پر اظہار کرنے کا تو محل ہی پیدا نہ ہوا۔ مالک نے کسی اور کے سامنے بھی زبان نہ کھولی کیونکہ اندیشہ تھا کہ سلطان کو اطلاع نہ ہو جائے سلطان کی بابت کوئی قطعی رائے قائم نہ ہو سکی تھی کہ حسین رقاصہ کے لئے وہ کیا ارادہ رکھتا ہے؟ ظاہری نوازشیں معنی خیز ضرور تھیں مگر پرورش کا یہ انداز ایک قدرداں کی حیثیت سے بھی ہو سکتا۔ اس لئے جب تک سلطان کا عزم ظاہر نہ ہو جاتا مالک اظہار تمنا کے خطرات مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس کے سوا مالک کی گرویدگی جنسی رجحان سے زیادہ پاکیزگی کی طرف مائل تھی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کو زیبا کو اپنانے کا خیال نہ تھا۔ مگر یہ خیال زیبا کی خوشی اور حالات پر منحصر تھا۔

بوالہوس ابوسہل درباریوں میں دوسرا شخص تھا جس کو ماہوش رقاصہ نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کو زیبا کا تقرب بھی حاصل تھا اور سلطان کی افتاد طبیعت کے لحاظ سے زیبا کے بارے میں اس نے ایک اندازہ بھی کر لیا تھا کہ اس کا کوئی ارادہ ہوتا تو اب تک تعمیل ہو جاتی اور وہ محل کے باہر نہ دکھائی دیتی۔ اس لئے کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ ابوسہل نے کوششیں شروع کر دی تھیں ______

ابوسہل کی عمر پچاس پچپن سال کی ہوگی۔ مگر صحت اچھی تھی پھر بھی طبعی خشونت کے باعث چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی اور شاید جوانی کے دنوں میں بھی وہ ایسا ہی رہا ہوگا۔

زیبا ایک محسن سمجھ کر اس کی عزت کرتی۔ مگر ابوسہل اپنے احسانات کے بدلے زیبا کے حسن و جوانی کو سمیٹ لینے کی فکر میں تھا اور اس کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچا کرتا۔ زیبا ہفتے میں دو بار تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اس کے وہاں جاتی اور

ہر مرتبہ ابوسہل کے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ سوغات لے جاتی۔ ابوسہل کی بیوی اس روش پر جواں سال رقاصہ سے خوشحال ہو گئی تھی۔ ابوسہل بھی ان مواقع پر موجود ہوتا اور اس کی انتہائی مدارات کی کوشش کرتا مگر زیبا زیادہ وقت نہ دیتی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے معذرت کر لیتی اور اجازت لے کر چلی آتی ابوسہل نے اس کو دربار شاہی تک پہونچانے کی سعی کی تھی زیبا کو اس کا احساس تھا اور ہر ممکن طریقہ سے وہ اس کی تلافی کرنا چاہتی جب یہ اول دن سے حاصل تھی اور اپنے عمل کے خلاف ابوسہل اور اس کے گھر والوں سے تعلقات قائم کر لئے تھے تاکہ احسان فراموشی کے الزام سے بچی رہے ـــــ ابوسہل کو اپنے مکان پر تخلیہ میں بات کرنے کا موقع نہ ملتا اس لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر وہ روز اس کے گھر آتا زیبا کو بار بار اس کا آنا ناگوار ہوتا لیکن کچھ کہہ نہ سکتی۔ غزنی میں اس کا عروج ابوسہل کا منت کش تھا شروع شروع میں تو ابوسہل سے ملاقات کے لئے وہ ماہ رخ کو لے کر نشست گاہ میں جاتی پھر ماہ رخ کو لے جانا چھوڑ دیا۔ ابوسہل کہنے کو تو کسی مخصوص کام سے آتا مگر ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ کچھ نہ کہتا۔ زیبا ایک رقص کرنے والی لڑکی تھی۔ تین چار سال کی مدت میں اس نے ہزاروں مردوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان گنت دلوں کی دھڑکنیں سنی تھیں۔ ابوسہل کی نگاہوں کا انداز اس سے چھپا نہ رہا۔ اور اس نے استعجاب کے ساتھ بوڑھے وزیر کو دیکھا۔ ابوسہل کی لڑکیاں عمر میں اس کی دگنی ہوں گی اور وہ بہ آں ریش سفید زیبا کے لئے دامن آرزو پھیلا رہا تھا۔ ہرات کی مغنیہ اپنی طرف سے اس کی ناراضگی کا مواد فراہم کرنا نہ چاہتی اس لئے اس نے اسکو پہلے ہی دن سمجھا دینے کا ارادہ کیا مگر اس کو الفاظ نہ مل سکے۔ کیا کہہ کر سمجھاتی؟ ابوسہل نے اس سے

کچھ بھی تو نہ کہا تھا۔

چند روز کے بعد آخر کو وہ نامساعد ساعتیں آ ہی گئیں کہ دربار غزنی کے مردبیر نے حور شمائل رقاصہ سے اظہار آرزو کر دیا اور اسلام قبول کر کے زوجیت میں آ جانے کی دعوت دے دی۔ زیبا نے انتہائی شائستہ الفاظ میں جواب دیا کہ شادی کا سوال اس کے لیے ناقابل غور ہے اور اس کو انتہائی افسوس ہے کہ وہ اپنے محسن کے ارشاد پر عمل کرنا تو درکنار خیال بھی نہیں کر سکتی۔ ابوسہل کو اس غیر متوقع جواب پر طیش آ گیا تاہم اس نے ہموار کرنے کی کوشش کی اور جب وہ کسی طرح راہ راست پر آتے دکھائی نہ دی تو شخصیت کا رعب ڈالنے پر اتر آیا اور اختیارات کے غرور میں کہنے لگا کہ وہ اس کو ناخوش کر کے غزنی میں نہیں رہ سکتی۔ زیبا اس کے زعم باطل پر مسکرا اٹھی اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ غصہ میں کانپتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور انتقام کی دھمکی دیتا ہوا کمرہ سے نکل گیا۔

زیبا سر کو جھکائے ہوئے دیر تک سناٹے میں بیٹھی رہی۔ وہ ابوسہل کے الفاظ سے بالکل ہراساں نہ تھی بلکہ اس کو اپنے محسن کی کم ظرفی کا پول کھل جانے کا قلق تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابوسہل نے اس سے ایسی قربانی چاہی جو کسی طرح ممکن نہ تھی ورنہ وہ احسان کا بدلہ احسان سے ضرور دیتی۔ زیبا کو آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے ماہ رخ نے اندر دروازے سے جھانک کر دیکھا اور زیبا اندر آنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کا چہرہ کچھ اترا ہوا تھا۔ ماہ رخ نے کسی ناخوشگوار بات کا اندازہ کیا اور خواہ مخواہ محبت میں اس کا سبب پوچھنے لگی۔ زیبا نے ایک معمولی بات پر ابوسہل کے ناراض ہو جانے کا حال کہہ دیا۔ ماہ رخ کے لئے معمولی بات وضاحت طلب تھی

لیکن زیبا نے خود سے نہ بتایا تھا۔ اس لئے اس نے چھیڑ کر استفسار نہ کیا کہ کہنے والی بات ہوتی تو وہ خود کہہ دیتی پھر بھی ابو سہل کو کسی وقت منا لینے کا مشورہ دئے بغیر نہ رہی۔ زیبا نے ماہ رخ کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور سنی ان سنی ایک کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی

زیبا طبعاً اعتکاف پسند واقع ہوئی تھی مگر سہ پہر کے وقت وہ کبھی اندر نہ بیٹھتی۔ اس دن شام کے جھٹپٹے میں بھی برآمد نہ ہوئی تو ماہ رخ کو خیال پیدا ہوا اس نے اندر جا کر دیکھا۔ وہ شمعیں روشن کئے ہوئے ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ ماہ رخ نے تفریح کو چلنے کی یاد دلائی اور زیبا اس کے ساتھ صحن میں نکل آئی۔ سیر کے لئے جانے کا وقت نہ رہا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس لئے دونوں بہنیں صحن میں بیٹھکر باتیں کرنے لگیں۔

شب میں کئی روز بعد مجرے کے لئے طلبی ہوئی۔ زیبا حسب دستور تیار ہو کر پہنچ گئی۔ ابو سہل بھی موجود تھا اور اس کو قہر کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ زیبا نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور معمول کے مطابق سلطان کا اشارہ پا کر رقص شروع کر دیا۔ اس رات اس نے بعض نئے طریقے اختیار کئے۔ جو بہت پسند کئے گئے۔ اور محمود نے خصوصی انعام عنایت کیا۔

گانے کا وقت آیا تو محمود نے فردوسی کے اشعار کی فرمائش کی۔ زیبا نے فردوسی کا نام سنا تھا۔ قابوس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ غزنی آیا ہوا ہے اور سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف پر متعین کر دیا ہے مگر اس کا کوئی شعر زیبا کے کانوں میں نہ پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر عذر کیا کہ فردوسی کا کلام اب تک اس کے ہاتھ نہ لگ سکا ——— فردوسی اور زیبا میں ملاقات نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ فردوسی جب بھی بلایا جاتا تو بھرے دربار میں اور زیبا کی طلبی تخلیہ کے وقت ہوتی ان کے اوقات مختلف تھے اور دونوں میں سے کوئی بلا مقصد کہیں آتا جاتا نہ تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ بارگاہِ شاہی کے علاوہ کسی دوسرے مقام

پر تعارف ہو جاتا۔ دونوں کی زندگیاں اصول کی پابند تھیں۔ ان میں نہ رخنہ پڑ سکتا اور نہ ملاقات کا امکان ہوتا۔ فردوسی کو آئے ہوئے اگرچہ ابھی دو ہی ہفتے ہوئے تھے۔ مگر دو سال بھی ہو جاتے تو بھی وہ ایک دوسرے سے اجنبی رہتے۔ کیونکہ ہر ایک کو اپنے کام سے کام تھا۔ دنیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ زیبا کے فردوسی سے متعارف نہ ہونے کا حال سنکر محمود کو تعجب ہوا اور متحیر ہو کر اس نے کہا کہ وہ اس کے مکان کے قریب ہی رہتا ہے۔ پھر بھی وہ اس سے ناآشنا نہیں! ابوسہل کے لئے۔ نادر موقع تھا۔ اس نے زیبا کی بیگانگی کے لئے ٹکڑا لگا دیا اور سلطان کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر کہہ دیا کہ جب وہ مشاہیر کا کلام بھی فراہم نہیں کرتی تو گانے کا نام کیوں لیتی ہے؟ زیبا نے اس کو کوئی جواب نہ دیا۔ محمود کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے ناگواری کی نگاہ سے ابوسہل کو دیکھا۔ لیکن کچھ کہا اس لئے نہیں کہ وہ اس کو زیبا کا ہمدرد قرار دیتا۔ اسی نے اس کو وہاں تک پہونچایا تھا۔ اس کے اعتراض کو زیبا کی تنبیہ پر محمول کر کے محمود نے گردن جھکالی۔ پھر سر اٹھا کر حکم دیا کہ رستم و سہراب کی داستان اور وہ تمام اشعار جو فردوسی نے اب تک سنائے ہیں زیبا کو نقل کر کے پہنچا دیئے جائیں۔ رنگ محفل بگڑ چکا تھا اس لئے سلطان نے زیبا کو اجازت دیدی اور وہ اپنے مقام پر آگئی۔

صبح کو محمود کے حکم کی تعمیل میں ایک کتاب زیبا کو پہنچ گئی۔ جس میں فردوسی کا کلام لکھا ہوا تھا۔ زیبا اس کتاب کو پاکر پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ اور ابتداء کے چند شعروں پر نظر پڑتے ہی دلچسپی محسوس کرنے لگی۔

زیبا کی نگاہ میں سرزمین ایران نے صرف ایک شاعر پیدا کیا تھا اور وہ دقیقی تھا۔ لیکن فردوسی کا کلام دیکھ کر وہ متحیر رہ گئی۔ دقیقی نے جس کام کی ابتداء کی تھی۔ فردوسی نے تو

انتہا پر پہونچا دیا تھا وہ جھوم جھوم کر شاہنامہ کے اشعار پڑھ رہی تھی اور ایرانی خون رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ماہ رخ سر پر آ کر کھڑی ہو گئی اور اس کو ہوش نہ آیا۔ جب ماہ رخ جھک کر خود پڑھنے کی کوشش کرنے لگی، تو نگاہ اٹھی اور وہ اس کو مخاطب کر کے بولی ——

کلام کیا ہے۔ معجزہ ہے ماہ رخ۔ ذرا سننا تو سہی! داستان کے رزمیہ اشعار وہ ایک کیف میں پڑھنے لگی۔ اور ماہ رخ وجد میں آ گئی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر دونوں نے تھوڑی دیر تک آرام کیا۔ پھر چنگ لے کر بیٹھ گئیں اور شاہنامہ کے اشعار مل کر گانے لگیں۔ کوئی سننے یا مغنیہ جب خود متاثر ہو کر گاتی ہے تو سننے والے پر لازماً اثر پڑتا ہے۔ زریا اور ماہ رخ اشعار میں مستغرق ہو رہی تھیں۔ اور ہمہ تن نغمہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کے گانے کا اثر کیوں نہ ہوتا؟ اک سماں بندھ گیا۔ دونوں غلام اور کنیز کھنچ کر آ گئے۔ اور قابوس کا سر اور ہاتھ پیر گانے کی لے کے ساتھ حرکت کرنے لگے۔

زریا چنگ رکھ کر خاموش ہوئی تو قابوس جھومتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ غزنی کا غلام اور کنیز دروازے کے پاس رک گئے ان کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے زریا کے کمرے کے سامنے آنے کی جرأت کی تھی۔ وہ بھی بالکل بے اختیاری میں۔ ہوش میں آتے ہی زریا کی ہدایت کے تحت الٹے قدم پلٹ پڑے —— زریا نے پہلے ہی دن سے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ ماہ رخ کو اپنی مالکہ سمجھیں اور اپنے وجود سے اس کی تنہائی میں مخل نہ ہوں۔ وہ اس پر عمل پیرا تھے اور اسی لئے فی الفور واپس ہو گئے۔ قابوس زریا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ زریا اور ماہ رخ ایک مسہری پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی پر انھوں نے قابوس کے لئے جگہ خالی کر دی مگر قابوس ان کے برابر نہ بیٹھا۔ دروازے کی طرف دیکھ کر ایک مونڈھا اٹھا لیا اور اس کو بچھا کر بیٹھ گیا۔

زیبا نے اسکے بیٹھتے ہی فردوسی کے کلام کی تعریف شروع کر دی۔ قابوس کچھ اشعار سن ہی چکا تھا اور ان سے اب تک متاثر تھا۔ اس نے دوبارہ نیچے سروں میں گانے کی فرمائش کی اور زیبا بوڑھے غلام کے کہنے کو حکم سمجھ کر تعمیل کرنے لگی۔۔۔۔۔ زیبا اور قابوس میں مالک اور غلام کا رشتہ تھا۔ دنیا کے سامنے وہ انھیں حیثیتوں میں جانے جاتے۔ لیکن روز کی عملی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ زیبا اور ماہ رخ دونوں اس کو بابا کہہ کر مخاطب کرتیں۔ اور کسی بزرگ کی طرح ادب سے پیش آتیں۔ اور قابوس بھی دونوں کو بیٹیوں کی طرح چاہتا گو حقیقت بھی اپنی جگہ پر تھی کہ پہلے وہ دستگیر کا غلام تھا پھر رقاصاؤں کے ساتھ ہو گیا۔ اس کی غلامانہ حیثیت میں تو کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ البتہ ایک آقا کے بجائے دو مالکائیں ہو گئیں۔ لیکن ان مالکاؤں کی روش اس کے لئے تکلیف دہ ہونے کے بجائے [illegible] کہ اس طرح وہ گھر کے اندر دو خادماؤں کا مالک اور گھر کے باہر دو مالکاؤں کا دل کا غلام بن گیا باہر زیبا اور ماہ رخ کے احکام کی تعمیل اس پر فرض تھی اور اندر زیبا اور ماہ رخ اس کی ہدایت کی پابند چنانچہ بیٹھتے ہی اس نے آہستہ آہستہ شعر پڑھنے کے لئے کہا۔ زیبا فی الفور پڑھنے لگی اور قابوس سننے لگا۔ دو چار شعروں کے بعد اس نے زیبا کو روک دیا اور سر جھکا کر گنگنانے لگا۔

قابوس ستر بہتر سال کا ایک بوڑھا انسان تھا مگر چند منٹ گنگنا کر اس نے زیبا کے پڑھے ہوئے اشعار کو پڑھنا شروع کیا تو اس کی آواز میں بڑھاپے کی کوئی علامت نہ تھی۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ بہت دھیرے دھیرے پڑھ رہا تھا کیونکہ مقصد صرف اس قدر تھا کہ زیبا کو نئی دھن بتا دے۔ چند منٹ میں وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ زیبا نے دھن کو سمجھ لیا اور آواز کی ندرت نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ قابوس نے دو چار شعر پڑھوا کر سنے پھر باہر نکل آیا اور گھر کے دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

زیبا اور ماہ رخ دیر تک مشق کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ سورج ڈوبنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا۔ زیبا کی طبیعت کچھ کسلمند ہو گئی تھی۔ اس نے ماہ رخ سے گھوڑا گاڑی منگوا لینے کو کہا اور خود منہ ہاتھ دھونے کے لئے حمام میں داخل ہو گئی۔ ــــــــ سلطان نے زیبا کو اجازت دے رکھی تھی کہ آنے جانے کے لئے جب ضرورت ہو شاہی اصطبل سے گھوڑا گاڑی طلب کر سکتی ہے۔ زیبا کے لئے کہیں جانے کا سوال تو تھا ہی نہیں۔ ہاں کسی کسی دن سیر کو جی چاہتا تو اس حکم سے فائدہ اٹھاتی۔ ماہ رخ کا پرچہ چلا جاتا اور گاڑی آ جاتی اس روز بھی ماہ رخ نے پرچہ بھیجدیا اور گاڑی دروازے پر آ کر لگ گئی۔

زیبا نے قابوس سے کسی کام کے لئے جانے کو کہا تھا۔ اس لئے نئے غلام کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھی۔ ماہ رخ بھی ساتھ تھی۔ اس نے کوچبان سے کہا کہ شاہی باغ کے علاوہ کوئی اور تفریح کی جگہ ہو تو وہاں لے چلے کوچبان نے ایک نئے راستہ پر گھوڑوں کو ڈال دیا اور شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر خودرو درختان کا نظارہ کرا کے واپس لے آیا۔

قابوس اس وقت تک واپس نہ ہوا تھا۔ زیبا ماہ رخ کے ہمراہ گاڑی سے اتر کر مکان میں آ گئی۔ اور قابوس کا انتظار کرنے لگی۔ اندھیرا کافی پھیل گیا تو اس کو تفکر ہونے لگا۔ مگر زیادہ پریشانی اٹھانے کی نوبت نہ آئی اور قابوس آ گیا زیبا نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی سوال کیا۔ جس کا جواب اس کو سر کی حرکت سے انکار میں ملا۔ ماہ رخ ان اشاروں کنایوں کو دیکھ رہی تھی لیکن ان کا مطلب سمجھ نہ سکتی۔ زیبا ایک لحظہ کے لئے کچھ رنجیدہ ہو گئی۔ پھر اس نے اپنی حالت میں تبدیلی کر لی اور قلبی کیفیات کو ماہ رخ سے چھپانے کے لئے کھانا طلب کر لیا۔

دونوں بہنیں ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھ گئیں۔ قابوس سے بھی انھوں نے شریک ہو جانے کو کہا۔ مگر وہ دوسرے غلام اور کنیز کی نظر میں اپنی حیثیت ایک غلام سے زیادہ دکھانا نہ چاہتا۔ اس لئے اس نے پسند نہ کیا اور زیبا و ماہ رخ نے کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے بمشکل فارغ ہو سکی تھیں کہ دو گھنٹے بعد بارگاہ سلطانی میں حاضر ہونے کی اطلاع آ گئی۔ اور زیبا تیاری میں لگ گئی۔

محمود کی بارگاہ میں زیبا کا اس رات کا مجرا یادگار رہا۔ رقص میں اس نے کمال کر دیا اور ناظرین کو نقش حیرت بنا دیا۔ سلطان نے بار بار انعام و اکرام کی بارش کی اور گانا شروع ہوتے ہی تو وہ کیف اور جوش میں مدہوش ہو کر رہ گیا۔ زیبا کلیجے کی پوری قوت اور انتہائی فنی مہارت سے گا رہی تھی۔ راگ اشعار کی مناسبت سے ولولہ انگیز تھا اس پر اشعار کی موسیقی قیامت ڈھا گئی۔ اور ابو سہل کے سے بدنفس کو بے اختیاری میں داد دینا پڑی۔ محمود نے ایک بار خاموش ہو جانے پر پھر اور گانے کی فرمائش کی اور دوبارہ چنگ کی آواز گونجنے پر اس طرح دیکھا گویا اس کی سیری نہیں ہوئی۔ زیبا کافی تھک چکی تھی لیکن ولی نعمت کا فرمان پا کر انگلیوں کو رواں کر دیا۔ اور شاہنامہ کا ایک تازہ منظر پیش کرنے لگی۔ انگلیوں نے جب کام کرنا چھوڑ دیا اور آواز جواب دے گئی تو آنکھوں سے مجبوری کا اظہار کر کے وہ ساکت ہو گئی۔ اور چنگ ماہ رخ کو دے دیا۔

زیبا کے لئے سلطان کی خوشنودی مزاج حد سے بڑھ چکی تھی۔ ایک نشہ کی سی کیفیت میں اس نے زیبا کو دیکھا اور اس کی زبان سے نکل گیا۔

"مانگو کیا مانگتی ہو۔ زیبا! ہم تم کو دینا چاہتے ہیں ——————"

"سلطان کا ایک قول چاہتی ہوں"! زیبا نے اسی طرح کہہ دیا۔ جیسے وہ سلطان

سے کہنے ہی کی منتظر تھی۔ محمود نے اس کے پابند کر دینے والے الفاظ پر چونک کر دیکھا اور پرساں ہوا۔ "کس بارے میں ـــــــ؟"

"اس کا تعلق سلطان کے رحم و کرم سے ہو گا۔ اور جو کسی صورت میں دولت غزنویہ کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ مگر میں وقت آنے پر عرض کر سکوں گی" زیبا نے دبدبہ سلطانی سے مرعوب ہوئے بغیر وضاحت کر دی اور سلطان نے الفاظ دہرائے۔

"ہم تمہاری خواہش پوری کر کے خوش ہوں گے ــــــــ"

زیبا سلطان کے الفاظ زبان سے نکلتے ہی آداب شاہی بجا لائی اور بارگاہ سے پچھلے قدم ہٹنے لگی۔ سلطان التفات خسروانہ کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا اور وہ باہر نکل گئی۔

اس کی کامیابی تمام مقربین شاہی کے لئے موجب مسرت تھی مگر ابو سہل انگارہ دل برداشتہ رہا تھا۔ وہ مغرور رقاصہ کو سزا دلانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو عروج پر عروج مل رہا تھا۔ ابو سہل کو سر دست سلطان کو اس سے برہم کرنا ناممکن نظر آنے لگا۔ تاہم اس نے ارادہ ملتوی نہ کیا اور موقع کی گھات میں لگ گیا۔

زیبا اس روز بے حد مسرور تھی۔ ماہ رخ یا قابوس نے اتنا خوش اس کو کبھی نہ دیکھا تھا بات بات پر کھلی جا رہی تھی۔ قدم قدم پر ہنس رہی تھی۔ ماہ رخ نے اس کو رقص و موسیقی کی کامیابی پر مبنی سمجھا مگر اس کی اصل وجہ جو کچھ تھی اس کو قابوس ہی جانتا تھا وہ زیبا کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن زیبا کی مسرت اور اس کی شادمانی میں پھر بھی فرق تھا۔ زیبا کے جذبات میں بہاؤ اور قابوس کے سرور قلب میں ٹھہراؤ تھا۔ زیبا کے رخسار پھولوں کی طرح شگفتہ ہو گئے تھے۔ اور قابوس کے چہرے کی جھریاں کچھ اور

سکڑ گئی تھیں۔

قیام گاہ پر پہنچ کر جب ماہ رُخ کمرے میں لیٹ کر نیند میں آ گئی۔ تو زیبا اٹھ کر قابوس کے پاس آئی اور اس کو اپنے کمرے میں بلا لے گئی۔ دونوں میں کسی اہم موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ زیبا قابوس سے بے پرواہی کی شکایت کر رہی تھی اور قابوس اسکو یقین دلا رہا تھا۔ کہ اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ زیبا باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔ قابوس نے پدرانہ پیار سے پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور زیبا نے اس کے شانے پر سر ٹکا دیا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ قابوس بھی آبدیدہ ہو گیا مگر اس نے تحمل کو ہاتھ سے نہ دیا۔ سمجھا بجھا کر اپنے ہاتھ سے زیبا کی آنکھیں پونچھیں اور دلدہی کر کے کہنے لگا کہ اگلے دن وہ بھلا سکا نی کوشش کرے گا۔ زیبا کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ اور چند آہیں بھر کر وہ خاموش ہو گئی قابوس اس کو بستر پر لیٹ جانے کی ہدایت کر کے کھڑا ہو گیا اور چلتے چلتے تسلی کے دو چار جملے کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

زیبا کی نیند اڑ گئی تھی وہ سو جانے کی کوشش کرتی رہی۔ بن بن کر لیٹتی مگر خیالات کی یلغار کم نہ ہوئی۔ صبح ہونے تک کروٹیں بدلتی رہی۔ غزنی کی مسجدوں میں جب اذان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں تو اس کے پپوٹے کچھ بوجھل ہونے لگے۔ اس نے اپنے کو نیند میں ڈال دیا۔ اور غافل ہو گئی۔

دو تین گھنٹے دن چڑھے آنکھ کھلی تو ضروریات سے فارغ ہو کر حمام میں داخل ہو گئی۔ نہا دھو کر نکلی تو ماہ رُخ کو ناشتے پر منتظر پایا۔ اس نے زیبا کے جاگنے کے انتظار میں ناشتہ نہ کیا تھا۔ بہن کی محبت پر زیبا نے پیار کی ایک نگاہ ڈالی اور ناشتہ کرنے کو بیٹھ گئی۔

ناشتہ کے دوران ہی میں قابوس آ گیا۔ اور رات کی محفل کا ذکر کرنے لگا۔ قابوس نے زیبا کی تعریف کی اور زیبا نے انکسار کرتے ہوئے کہا کہ کامیابی کا سہرا اس کی صلاحیت سے زائد فردوسی کے اشعار کے سر ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے فردوسی کے لئے انتہائی عقیدتمندانہ الفاظ استعمال کر کے قابوس سے کہا کہ غزنی میں اگر کسی سے ملنے کو اس کا جی چاہتا ہے تو فردوسی سے زیبا کا انداز ملتجیانہ تھا۔ گویا وہ قابوس سے فردوسی کے وہاں جانے کی اجازت لے رہی تھی۔ قابوس نے کسی دن لے چلنے کا وعدہ کیا اور تینوں کے درمیان شاہنامہ پر بات چیت ہونے لگی۔

باب (۱۰)

دو فن کار

فردوسی کو غزنی میں کئی مہینے گزر گئے تھے اور محمود کے دربار میں اس کی ایک خاص جگہ پیدا ہو گئی تھی۔ شاہنامہ کا چرچا عام تھا اور اس کے اشعار زبان زد ہونا شروع ہو گئے تھے اسی تناسب سے فردوسی کا حلقۂ اثر بڑھ رہا تھا۔ امیر نصر اور فضل اسفرائنی کے علاوہ عمائدین سلطنت میں بہت سے لوگ ہمدرد بن گئے تھے اور اس کا مستقبل ہر اعتبار سے امید افزا تھا۔

مالک دن میں ایک بار تھوڑی دیر کے لئے آتا اور فردوسی دوسرے تیسرے وقت نکال کر مالک کے گھر جاتا۔ اس طرح ان کے تعلقات روز بروز استوار ہوتے جا رہے تھے۔ امیر نصر اور فضل کے ہاں بھی دو چار روز بعد فردوسی نے حاضری کا معمول بنا لیا تھا۔ ان لوگوں نے کئی مرتبہ اس کے مکان پر آ کر خلوص کا ثبوت دیا تھا۔ اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے قلوب کی وسعتیں بڑھ رہی تھیں۔ امیر نصر تو فردوسی کے کلام کا دلدادہ تھا وہ ہر روز کچھ نہ کچھ سننے کی خواہش کرتا مگر اس کو فردوسی کے وقت کی قیمت کا احساس تھا اس لئے ہفتہ میں دو دن مقرر کر دئے تھے۔ جب اس کے ہاں دوسرے شعرا بھی مدعو ہوتے اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے محفل ادب گرم ہو جاتی فردوسی کی زندگی ہر اعتبار سے مطمئن اور رشادکام تھی۔ یا دماغی حافظہ پر

ضرب لگاتی رہتی اور فردوسی کا قرار تھوڑی دیر کے لئے چھن جاتا مگر اس کو طبیعت پر قابو پا لینے کے طریقے بھی معلوم ہو گئے تھے وہ ان پر عمل کرنے لگتا۔ کسی غلام کو بلا کر متعلق اور غیر متعلق باتوں میں مشغول ہو جاتا اور اپنے کو بہلا لیتا

اس کو طوس سے نکلے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہو گئے تھے۔ حسین قتیب سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ غزنی پہونچتے ہی قاصد روانہ کرے گا۔ چنانچہ وہ مالک سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ کسی شخص کو طے کرا دے جس کو طوس بھیجا جا سکے۔ مالک کو مصروفیت کے باعث یاد نہ رہا تھا۔ اس دن جب مالک آیا تو اس نے خاص طور پر توجہ دلائی۔ مالک نے خط لکھنے کو کہہ دیا۔ فردوسی نے دوسرے دن خط لکھ کر اس کو دے دیا اور مالک نے غزنی کے محکمہ امور خارجہ کے ذریعہ اس کو بھجوا دیا۔——سلطان محمود کی سلطنت کا انتظام بہت مکمل تھا۔ صدر دفتر میں علیحدہ علیحدہ شعبے قائم تھے رسل و رسائل کا مخصوص محکمہ تھا۔ جہاں سے فرامین سلطانی وقت پر روانہ ہوتے اور بیرونجات سے آئی ہوئی ڈاک یکجا ہو کر سلطان کے حضور میں پیش ہوتی مالک نے فردوسی کا خط دے دیا کہ عامل طوس کے ذریعہ حسین قتیب کو بھیج دیا جائے۔ خط میں اس نے فردوسی سے لکھوا دیا تھا کہ جواب بھی طوس کی سرکاری ڈاک کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ فردوسی یہ صورت نکل آنے سے بہت خوش ہوا اور اس کو ہر مہینہ دو مہینہ بعد فرنگیس کی خیریت معلوم ہو جانے کی توقع ہو گئی۔

یوں تو فردوسی جس دن سے طوس سے روانہ ہوا تھا۔ فرصت کے اوقات میں اکثر فرنگیس کو یاد کرتا رہتا تھا اور غزنی میں تو کوئی دن نہ گزرتا۔ جب یاں بیٹھ گھڑی دو گھڑی کے لئے حافظ کی زینت نہ بنتی اور ان میں قاسم کا اضافہ

ہوجاتا تو شاعر کے احساسات گھنٹوں تک متلاطم رہتے۔ تین تصویروں میں غزنی نے برھم خد و خال کی ایک تصویر ایجاد کر دی تھی۔ وہ تصویر اس حسینہ کی تھی جس کی ایک جھلک فردوسی نے شاہی باغ میں دیکھی تھی اور جس کو نوشابہ کہہ کر آواز دی تھی۔ فردوسی کا سن کسی جنسی کشش سے متاثر ہونے والا نہ تھا اور نہ اس کی افتاد طبیعت نے کبھی اس کی اجازت دی تھی کہ خوبرو خواتین کو جذباتی تخیل میں جگہ دے۔ نوشابہ کی ہم شکل عورت کے لئے بھی وہ کوئی تجسس نہ کرتا مگر متوفی محبوبہ کی زندہ یادگار کو نظر انداز کر دینا اس کے امکان کی بات نہ تھی۔ مالک سے ایک مرتبہ صورت شکل کا حوالہ دے کر پوچھا تھا اور کہا تھا۔

حشر میں قاتل کو گر دیکھوں تو میں پہچان لوں

بھولی بھالی شکل تھی۔ یونہی بھلا سا نام تھا

مالک اس پتہ پر کیا بتا سکتا۔ اس کے ایوس کن جواب نے فردوسی کو خاموش کر دیا مگر جذبہ شوق اندر ہی اندر ابھرتا رہا۔ ایک صبح کو اس نے مالک سے پھر کہا اور شبہہ کے بارے میں کچھ بتانے لگے۔ یعنی نوشابہ کے حلیے اور شکل و صورت کو بیان کرنے لگا۔ مالک پوری تفصیل سنکر بچکا یک چونک پڑا۔ فردوسی نے اسی تسلسل میں گاڑی پر دو عورتوں کے بیٹھے ہونے کا ذکر کیا۔ اور مالک کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی زبان پر بیساختہ زیبا کا نام آگیا۔ "زیبا" فردوسی نے دہرایا اور مالک سے اس کا پتہ پوچھنے لگا۔ مالک نے زیبا کا مختصر تعارف کرا دیا۔ فردوسی نے اس سے ملنے کی خواہش کر دی۔

فردوسی کی عمر اور عابدانہ زندگی کو دیکھتے ہوئے مالک کوئی بری رائے قائم نہ کر سکا مگر زیبا نوشابہ کی ہم شکل تھی اور فردوسی کو نوشابہ سے عشق رہا تھا۔ اس لئے ایک مجبوری نے

ماہک، کہن سال شاعر کے اشتیاق پر کچھ سوچے بغیر نہ رہا لیکن فردوسی کے لئے جذبۂ عقیدت نے ایسے خیال پر نفرین کی اور اس نے فردوسی سے زیبا کے مکان پر لے چلنے کا وعدہ کر لیا۔

ماہک کو کسی ضرورت سے جانا تھا وہ چلا گیا اور سہ پہر کا وقت زیبا کے وہاں جانے کے لئے مقرر کر گیا۔ فردوسی ایک فطری شاعر تھا۔ ہجر و انتظار کی منظر کشی کا اتفاق بھی اس کو ہوا تھا مگر عملی طور پر جوانی کے دنوں میں کبھی اس تڑپ اور بے چینی کے ساتھ وقت گذاری نہ کی تھی، جس کا تجربہ اور مظاہرہ وہ ماہک کے جانے کے بعد سے خود کر رہا تھا

ماہک فردوسی کے گھر سے تین گھنٹے دن چڑھے گیا ہوگا۔ واپس آنے کے لئے سورج چھپنے سے دو گھڑی قبل کا وقت دے گیا تھا درمیان میں سات گھنٹے باقی تھے مگر فردوسی نے اسکے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی سے ساعتیں گننا شروع کر دیں نوشابہ دہر کی چاہنے والی تھی اس نے جیتے جی اپنی دانست میں فردوسی کو کسی کشمکش میں مبتلا نہ ہونے دیا تھا بلکہ اس کے برعکس خود ہر قسم کے ذہنی مصائب سے گذرتی رہی تھی مگر نوشابہ کی تصویر محبوبہ کی صحیح شان دکھا رہی تھی۔ فردوسی عالم شباب میں جن تکالیف سے بچا رہا تھا پیری میں ان کا سابقہ پڑ رہا تھا اور وہ زیبا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے اتنا بیقرار تھا کہ وقت کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ تین گھنٹے تو کسی نہ کسی طرح اٹھ بیٹھ کر لیٹ پوٹ کر گذار دئے۔ پھر کان قدموں کی چاپ پر اور نگاہیں در پر لگ گئیں۔ اور ایک اک لمحہ ایک اک سال کے برابر ہو گیا۔

جانکنی کی تکلیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت سخت ہوتی ہے لیکن اس کا تجربہ رکھنے والے زندوں میں تو ہیں نہیں لہٰذا اس کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مگر انتظار کی اذیت برداشت کرنے والے موجود ہیں اور اس کو موت سے زیادہ تکلیف دہ بتاتے ہیں الانتظار اشدُّ من الموت۔ فردوسی کی بے کلی اس کی تصدیق کر رہی تھی۔ بار بار

دروازے کی طرف دیکھتا اور مستغرق خیال ہو جاتا۔ اکثر اپنی ٹھنڈی سانس کی آہٹ پر چونک پڑتا۔ قلم اور سفید کاغذ کے پرچے انتظار کرتے رہے اور نامداران فارس کے نام لے کر پکارتے رہے فردوسی کے کانوں میں ان کی آوازیں پڑیں مگر اس نے کوئی اعتنا نہ کی۔ اس کے ذہن میں ایک نقشہ اور دو نام گونج رہے تھے۔ رہ رہ کر ہونٹ زیبا کہنے کے لئے متحرک ہو جاتے مگر زبان سے نوشابہ نکل جاتا اور وہ کسی ہجراں نصیب عاشق کی طرح آہیں بھرنے لگتا۔

آخر خدا خدا کرکے وہ وقت آہی گیا جب مالک کا آنا متوقع تھا۔ چند منٹ تو فردوسی پہلے کی طرح راہ تکتا رہا، پھر کمرے سے صحن میں آگیا۔ تھوڑی دیر وہاں ٹہلا اور قرار نہ آیا تو بیرونی دروازہ سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا۔ اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور اتفاق سے دیر ہو گئی تھی۔ فردوسی دروازے کے باہر نکل کر منتظر ہو گیا اور اس راستہ پر بڑھتا چلا گیا جدھر سے مالک کے آنے کی امید تھی ایک چوراہے پر مالک مقابل سمت سے آتا نظر آیا اور فردوسی ٹھہر گیا۔ اسی وقت وہ گھوڑا گاڑی بھی بائیں سے داہنے کو جاتی دکھائی دی جس کو فردوسی نے شاہی باغ میں دیکھا تھا۔ گھوڑا گاڑی پر زیبا اور ماہ رخ بیٹھی ہوئی تھیں۔ فردوسی کی نگاہ جیسے ہی زیبا پر پڑی وہ بے اختیاری میں چیخ پڑا ــــــــــ

"نوشابہ" "نوشابہ" ! پھر سنبھل کر اس نے نوشابہ کے بجائے زیبا کہا اور گھوڑا گاڑی رک گئی۔

زیبا نے اس کو شاہی باغ میں اسی طرح آواز لگاتے دیکھا تھا اور فاتر العقل قرار دیا تھا۔ اس وقت بھی پاگل ٹھہرا کر آگے بڑھ جاتی لیکن قابوس فردوسی کو پہچانتا تھا۔ اس نے زیبا کو بتا دیا کہ وہ شاہنامہ کا مصنف ابوالقاسم فر[دوسی] ہے۔ غلام کے الفاظ کانوں میں پڑتے ہی زیبا کا دل ایک سودائی کے لئے عقیدت کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ تاہم وہ اس رمز کو سمجھ نہ سکی کہ فردوسی اس کو دیکھ کر "نوشابہ" "نوشابہ" کیوں پکارتا تھا۔ گاڑی

رکوا کر وہ نیچے اتر آئی اور فردوسی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا۔

وقت کی حسین ترین رقاصہ استعجاب اور تحیر میں دیکھ رہی تھی اور ایران کا مایہ ناز شاعر دیوانگی کے عالم میں دوڑ رہا تھا۔ اس کو اس بات کا بھی لحاظ نہ تھا کہ دنیا کیا خیال کر رہی ہو گی۔ وہ آنکھیں زیبا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور قدم بے اختیاری میں اٹھ رہے تھے۔ قابوس نے "فردوسی" کہہ کر اس کا تعارف کرایا تھا۔ مگر زیبا کو شک ہو رہا تھا کہ قابوس کی آنکھوں نے دھوکہ تو نہیں کھایا؟ وہ مکرر استفسار کے لئے قابوس کی طرف متوجہ ہوئی اس وقفہ میں فردوسی اس کے مقابل پہونچ گیا۔ دونوں شانے پکڑ کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں اور انتہائی پیار کے لہجہ میں کہنے لگا۔

تم پھر آگئیں، نوشابہ ——— ؟

میں نوشابہ نہیں ہوں میرا نام زیبا ہے" زیبا فردوسی کی جسارت پر سہمی سہمی کھڑی تھی مگر اس نے غلط فہمی دور کرنے کے لئے کہہ دیا اور فردوسی جذباتی انداز میں بولا

"میں جانتا ہوں کہ تمہارا نام زیبا ہے۔ مگر تم نے میری نوشابہ کی صورت چرائی ہے" زیبا اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس عرصہ میں مالک قریب آگیا اور اس نے زیبا سے کہا کہ سرِ راہ باتیں کرنے سے بہتر یہ ہے کہ فردوسی کے مکان پر بیٹھ کر گفتگو ہو۔ فردوسی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو زیبا اس کو منظور نہ کرتی۔ لیکن شاہنامہ کے مصنف نے اسکے خیال میں جگہ حاصل کر لی تھی اور اب تو اس کا فردوسی سے ایک رشتہ بھی پیدا ہو چکا تھا وہ نوشابہ کی محبت کی ورثہ دار بن چکی تھی۔ پاک باطن مغنیہ نے بوڑھے شاعر کا دل رکھنا اپنا فرض سمجھا۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے قدم اٹھا دیئے۔

گھوڑا گاڑی واپس کر دی گئی۔ آگے آگے فردوسی۔ اس کے پیچھے زیبا اور عقب میں

ماہک۔ ماہ رخ اور قابوس چلنے لگے۔ اور فردوسی کے مکان پر پہنچ گئے۔

فردوسی نے اپنے مکان میں کوئی نشست گاہ نہ بنائی تھی۔ ایک کمرہ مشاہیر فارس کی تصاویر سے مزیّن تھا جس کو نگار خانہ کہنا موزوں ہوگا۔ کیونکہ فردوسی اسی میں بیٹھ کر اپنے غیر فانی مرقع میں رنگ آمیزی کیا کرتا۔ دوسرا کمرہ خواب گاہ کا کام دیتا اس میں قالینوں کا فرش تھا۔ فردوسی نے اسی میں لا کر سب کو بٹھا دیا اور رہ رہ کر زیبا کو دیکھنے لگا۔

زیبا کو ماہک نے چند لفظوں میں نوشابہ کے متعلق بتا دیا تھا کہ وہ فردوسی کی رفیقۂ حیات تھی اور وہ اس کو اس حد تک چاہتا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد جذب محبت کا یہ عالم ہے زیبا کو فردوسی کی نیت کی پاکیزگی میں شبہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کی بیتاب نگاہی پر حیا محسوس کر رہی تھی اور فردوسی بھی کسی حد تک ہوش میں آچکا تھا۔ چاہتا تھا کہ ایک تسلسل سے زیبا کو نہ دیکھے لیکن جب وہ ارادہ کرکے سر کو جھکا لیتا' نگاہیں بلا ارادہ اٹھ جاتیں اور زیبا کی مقناطیسی آنکھوں سے ٹکرا کر ہی قرار لیتیں۔

چند لمحات سکوت کے گذار کر فردوسی نے کہا۔

"تم مجھے معاف کرنا زیبا۔ میری دیوانگی سے تمھاری توہین ہوئی۔ لیکن اس میں میرے قصور سے زیادہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ تم کو نوشابہ کے مشابہ بنا دیا۔ اتنا مشابہ کہ سرمو کوئی فرق نظر نہیں آتا ـــــــ قد و قامت کچھ مختلف ضرور ہے۔ مگر دیکھنے والا تو صورت ہی کو دیکھتا ہے ـ میں نے بھی صورت دیکھ کر تم کو نوشابہ سمجھا تھا اور اب اسکا قائم مقام سمجھتا رہوں گا ـــــ"

زیبا خاموش تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ فردوسی کو کیا جواب دے۔ فردوسی نے ایک

لحظہ اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ پھر یہ کلام میں اضافہ کیا۔

"قدرت نے تم کو جو ناک نقشہ ودیعت کیا ہے اس کا پرتو میرے آئینہ دل میں برسوں سے موجود ہے۔ نوشابہ نے جس میں جھانک جھانک کر صوری نقوش کو پکا کر دیا ہے۔ اسی لئے میری نگاہوں کو تمہارے چہرے سے ایک رابطہ پیدا ہو گیا اور میں از خود رفتہ ہو کر تمہاری طرف کھینچ گیا یہ کشش اختیاری نہ تھی اور نہ آئندہ اس پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تم اجازت دو یا نہ دو۔ میں جس وقت بھی موقع ملے گا تم کو دیکھتا رہوں گا کیونکہ تم زیبا کی حیثیت سے ہٹ کر میری محبوبہ کی یادگار ہو۔ اور میرا دکھا ہوا دل تم کو دیکھ کر تسکین پاتا ہے۔"

زیبا پر فردوسی کے جملوں نے کچھ ایسا اثر کیا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آنسو گلابی رخساروں پر بہہ آئے۔ فردوسی اس کو روتے دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"زیبا اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔ میں تم کو روتے نہیں دیکھ سکتا ——"

فردوسی نے اس انداز سے یہ جملہ کہا تھا کہ زیبا مرعوب ہو گئی اور اس نے رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کر لیں مگر اس کی طبیعت کچھ پریشان ہو گئی تھی وہ فردوسی سے اجازت لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور فردوسی نے اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا

میں اس شرط پر تم کو رخصت کر سکتا ہوں کہ تم روز تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو عزت دیا کرو یا مجھے اپنے وہاں آنے کی اجازت دو۔"

"آپ سے ملنا میری سعادت ہوگی ——" زیبا نے اپنے کو سنبھال کر کہہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ فردوسی بھی اس کے تعقب میں آ گیا۔ اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تو کل کس وقت میں تمہارا انتظار کروں؟"

"سہ پہر کو ——" زیبا جواب دیکر اس کی طرف مڑ گئی اور کہنے لگی "آپ اتنی زحمت کیوں کر رہے ہیں، میں چلی جاؤں گی۔"

"میرے لئے یہ زحمت نہیں، عین راحت ہے۔" فردوسی یہ کہتا ہوا قدم اٹھاتا رہا، مگر زیبا نے اس کو زیادہ دور جانے نہ دیا اور ماہک کے ہمراہ واپس کر دیا۔ اس کا مکان تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ ماہ رخ اور قابوس کے ساتھ چہل قدمی کرتی ہوئی وہ روانہ ہو گئی اور چند منٹ میں گھر پہنچ گئی۔

زیبا نے فردوسی کی سوتی ہوئی امنگوں کو بیدار کر دیا تھا۔ نوشابہ کے پیکر نازنین کو سپرد خاک ہوئے بیس سال سے زائد ہو گئے تھے اور مرنے کے وقت اس کی عمر پینتیس سال سے کم نہ تھی۔ اٹھارہ برس کی زیبا اس کی جوانی کا نقشہ پیش کر رہی تھی اور فردوسی کے خیال کو چالیس سال پیچھے کی طرف دوڑا رہی تھی۔ فردوسی مسئلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو انتقال روح کے ساتھ جسم کی منتقلی کی دلیل پیش کر کے زیبا کو نوشابہ کہہ دیتا اور قران السعدین کا صاحب کتاب ایک زین تازہ کا پیغامبر بن جاتا، مگر وہ ایک مرد مسلمان تھا۔ اس حقیقت سے واقف تھا کہ انسان کو حیات ثانی نہیں ملتی۔ دار البقا کو سدھارنے والا پلٹ کر نہیں آتا۔ زیبا نوشابہ کے ساتھ تھی۔ اس مماثلت نے فردوسی کو جذبات کے دھارے پر بہایا، لیکن اس کا نتیجہ بس اسی قدر نکل سکا کہ فردوسی زیبا کو نوشابہ کی شبیہ سمجھ کر چاہنے لگا۔ مگر یہ چاہت جنسی جذبات اور خیالات فاسدہ کی آلودگی سے پاک رہی۔

زیبا کو جی بھر کر دیکھ لینے سے فردوسی کو ایک تسکین ہو گئی تھی اور یہ خیال بیقراری کے ازالہ کو کافی تھا کہ اس کا دیکھنا ہر وقت ممکن ہے۔ پھر بھی دل کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ہر گھڑی سامنے رہتی۔ ماہک کے ساتھ پلٹ کر اپنے مقام پر آیا تو اسی کے متعلق تب

کرتا رہا۔ مالک اس کے رقص اور گانے کی تعریف کرنے لگا۔ فردوسی کو ان چیزوں سے لگاؤ نہ تھا۔ مگر زیبا کی خوبیوں کا تذکرہ اس کے لئے باعث مسرت تھا۔ مالک جب تک بیٹھا رہا فردوسی اس کے بارے میں سوال پر سوال کرتا رہا۔ مالک نے معلومات کے بقدر اس کو جواب دے دیئے۔ مگر بعض باتیں خود اس کو بھی معلوم نہ تھیں وہ کیا بتاتا؟ فردوسی اس کے خاندانی حالات معلوم کرنا چاہتا۔ اس کی بابت مالک کیا غزنی میں کوئی بھی کچھ نہ جانتا تھا۔ مالک نے اس سے کہہ دیا اور اس نے خود زیبا سے پوچھنے کا ارادہ کر لیا۔

دوسرے دن حسب وعدہ جب وہ آئی تو پہلی بات جو فردوسی نے اس سے کی۔ وہ یہ تھی۔

"تمھارا وطن کہاں ہے زیبا۔؟"

"ہرات میں" زیبا نے بتایا اور فردوسی نے دریافت کیا۔

"تمھارے والد کا کیا نام ہے؟"

زیبا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ ماہ رخ بھی ساتھ تھی۔ اس کی نگاہیں بھی نیچی ہو گئیں۔ زیبا نے اس کو ہدایت کی تھی کہ اپنے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہ بتائے اطاعت شعار بہن اس پر عامل تھی مگر اس کو اس احتیاط کا سبب معلوم نہ تھا۔ زیبا نے چند لمحات تک ساکت رہ کر گردن اٹھائی اور نہایت متانت کے ساتھ کہنے لگی۔

"ایک ناچنے گانے والی لڑکی کا حسب نسب ہی کیا؟ میں نے اس سلسلہ میں کوئی بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ سے ملتجی ہوں کہ ایسا کوئی سوال نہ کیجئے۔ جس کا جواب میں دے نہ سکوں۔"

فردوسی نے تعجب سے زیبا کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا جو انتہائی اذیت کا پتہ دے رہا تھا۔ فردوسی سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کچھ رموز وابستہ ہیں۔ جن کو وہ چھپانا چاہتی ہے۔ وہ اس کو تکلیف دینا نہ چاہتا اس لئے خاموش ہو گیا اور زیبا نے موضوع بدلنے کے لئے شاہنامہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

فردوسی ایک شاعر کی حیثیت سے زیبا کی نگاہ میں لائق پرستش تھا۔ اس نے اس کے کلام کو خود اس کی زبان سے سننے کی آرزو کر دی اور فردوسی نے کتاب اٹھائی مگر نظر زیبا کے چہرے کی طرف جاتے ہی اس کے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ وہ وقت اس کو یاد آ گیا جب رات کے سناٹے میں نوشابہ کو تازہ کہے ہوئے شعر سنایا کرتا۔ پھر نوشابہ کی زبان سے چنگ پر ان کو سنتا۔ زیبا اس کی آہ کا مطلب سمجھ نہ سکی۔ فردوسی نے خود بتا دیا اور کہا کہ اس کو بھی نوشابہ کی تقلید کرنا پڑے گی۔ زیبا نے حامی بھر لی۔ اور فردوسی نے ایک واقعہ کو پڑھنا شروع کر دیا۔

زیبا سر دھننے لگی۔ اس کی تعریف کا انداز بھی نوشابہ سے ملتا جلتا تھا۔ فردوسی میں شعر خوانی کا جوش پیدا ہو گیا تھا رفیقہ حیات کی شبیہہ کو ایک ولولے کے ساتھ چالیس پچاس شعر سنا ڈالے اور زیبا پر وارفتگی طاری ہونے لگی۔ فردوسی نے پوری داستان ختم کر کے زیبا سے انھیں اشعار کو پڑھنے کے لئے کہا۔ زیبا تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئی۔ پھر اس کو یاد آ گیا کہ چنگ تو وہ ساتھ لائی نہیں اور فردوسی کی محبوبہ چنگ پر پڑھا کرتی تھی اس نے فردوسی سے معذرت کی اگلے دن جب وہ اس کے گھر آئے گا۔ تو اس کمی کو پورا کرے گی۔ فردوسی بھی مجبوری رضامند ہو گیا اور زیبا تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

وقت معینہ پر فردوسی زیبا کے مکان پر پہونچ گیا۔ ایک بھی اس کے ساتھ تھا

زیبانے فردوسی کی آمد کے سلسلہ میں اپنے کمرے کو آراستہ کیا تھا۔ اسی میں لے جاکر فردوسی کو بٹھا دیا۔ ماہک کا آنا اس کو ایک نظر نہ بھایا مگر وہ اس کے معزز مہمان کے ساتھ تھا اس لئے کچھ کہہ نہ سکی اور فردوسی و ماہک ایک گدّے دار بنچ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں قابوس نے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دی اور زیبانے فردوسی و ماہک سے ماہ رخ کے کمرے میں تکلیف کرنے کو کہہ دیا۔ فردوسی گھر سے ناشتہ کرکے آیا تھا کیونکہ زیبانے اس کا وعدہ نہ لیا تھا۔ اس نے عذر کیا مگر زیبا کے اصرار پر کھڑا ہوگیا۔ اور سب لوگ برابر کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

ناشتہ میں کافی اہتمام تھا خشک اور سبز پھلوں اور میووں کے علاوہ کئی قسم کی نمکین اور میٹھی چیزیں تھیں۔ زیبا ایک ایک شے پر فردوسی کو توجہ دلانے لگی اور فردوسی کم مقدار میں کھانے کے باوجود اشتہا سے زیادہ کھا گیا۔ ناشتہ ختم ہونے پر زیبا سب کو لے کر پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ اور اس کی استدعا پر فردوسی شاہنامہ کا ایک ٹکڑا سنانے لگا۔ زیبا اور ماہ رخ نے وطنیت کے پورے جذبہ کے ساتھ اس کو داد دی اور فردوسی کے کہنے پر زیبانے چنگ سنبھال لیا۔

فردوسی نے اب تک زیبا کی صورت ہی دیکھی تھی اس کے اصلی جوہر سے آشنا نہ تھا وہ فردوسی کے پڑھے ہوئے اشعار کو کتاب سامنے رکھ کر گانے لگی تو طوس کا فنکار تصویر حیرت بن گیا۔ زیبا کے چنگ بجانے کا طریقہ وہی تھا جس طرح نوشابہ بجایا کرتی۔ گانے کی لے ویسی ہی تھی جیسے نوشابہ گایا کرتی حتیٰ کہ آواز میں بھی خاصا تشابہ تھا۔ دو چار شعر پڑھنے کے بعد زیبا ایک کیف میں آنے لگی۔ اور فردوسی تو اتنا بیخود ہوگیا کہ اس کو کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ نوشابہ چنگ رکھ کر خاموش ہوگئی۔ تو بھی وہ دیر تک

دم بخود رہا۔ اور خود فراموشی میں بیٹھا رہا۔

زیبا نے جب اس کو بولتے نہ دیکھا۔ تو خود سکوت کو توڑا اور متبسم ہو کر کہنے لگی۔

آپ کو شاید پسند نہیں آیا میرا گانا ــــ؟

"نہیں زیبا۔ پسند اور ناپسند کا سوال تو تمہارے لئے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ خالق کائنات نے کتنی یکسانیت پیدا کر دی ہے۔ تم نوشابہ سے کسی بات میں مختلف نہیں بولتی ہو تو اسی کے لہجہ میں گاتی ہو تو اسی کی آواز میں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ فن سے واقف نہ تھی تم ماہر فن ہو۔ کوئی ضعیف الاعتقاد ہوتا تو بیدریغ کہہ دیتا۔ کہ نوشابہ کی روح پھر اسی پیکر میں آ گئی۔" فردوسی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ماہ رخ اور ملک خاموش تھے زیبا بھی کوئی رائے زنی نہ کر سکی۔ اور فردوسی نے ایک لحظہ رک کر اضافہ کیا۔

قدرت کی طرف سے اس کو میرے جذب دل کا انعام بھی کہا جا سکتا ہے اور صبر و ضبط کی آزمائش بھی ــــ"

یہ کہہ کر پھر وہ خیال میں کھو گیا۔ اور کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

زیبا اپنی افتادِ طبیعت یا تلخ تجربات کے باعث دنیا سے متنفر اور مردم بیزار تھی مگر نوشابہ کی قائمقام بننے سے اس کو ایک سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ سن و سال کے تفاوت کے لحاظ سے فردوسی کی طرف کسی جنسی لگاؤ کا امکان نہ تھا اور نہ فردوسی کے کردار کا جیوت اس کی اجازت دیتا کہ وہ زیبا کے لئے کسی ایسے خیال کو دل میں جگہ دے گا۔ تاہم یہ حقیقت تھی کہ نوشابہ کے لئے فردوسی کی محبت زیبا میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اور زیبا کو یہ ناگوار نہ تھا بلکہ کسی حد تک وہ خوش تھی کہ ملک و قوم کی سربلندی کے نغمے الاپنے والا اس کا پرستار تھا اور اس کا پیکر حقیقت تک پہنچنے کے لئے مجازی منزل بن گیا تھا۔

فردوسی نشست کے دوران لمحہ بھر ایک گوشے سے اس کو دیکھتا رہا۔ زیبا نے رہ رہ کر اپنے چہرہ پر نگاہوں کا وزن محسوس کیا۔ اور نسائیت کے تقاضے سے ایک شرم کا احساس ہوا مگر اس نے فردوسی کی جسارت کو ناروا قرار نہ دیا۔ وہ فردوسی مغرب سے کچھ قبل چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا زیبا اور ماہ رخ دور تک اس کے ساتھ گئیں۔ پھر فردوسی نے ان کو واپس کر دیا۔ اور راہک کے جا بجا اپنے مکان پر پہونچ گیا۔

اسی طرح ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں فردوسی تو ایک نظارے کے بعد ہی سے مانوس ہو گیا تھا زیبا کی اجنبیت بھی جاتی رہی اور ان کے مابین دکھ درد میں شریک ہونے والے تعلقات پیدا ہو گئے۔ فردوسی اس کو محبوبہ کی ہم شبیہہ سمجھ کر چاہتا تھا اور زیبا ایک قابل قدر فنکار قرار دے کر فردوسی کی عزت کرتی۔ وقت گزرتا رہا۔ شاہنامہ کے صفحات میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور محبت کے تازہ رشتے استوار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ابو سہل اور خواجہ بزرگ کی عنایت سے اس رابطہ کو متہم کیا جانے لگا۔ مگر ان کو کسی کی پرواہ نہ ہوئی۔ اور انھوں نے اپنی روش میں ترمیم نہ کی۔

باب (۱۱)

نوشابہ کی بیٹی

فردوسی کی طوس سے روانگی کے وقت نرگس کی عمر بیس سال کی ہو چکی تھی ایران میں بارہ چودہ سال کی لڑکی بالغ ہو جاتی ہے اور اس کی شادی کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے نرگس کو بالغ ہوئے چھ سات برس گزر گئے تھے۔ فردوسی محبوبہ کی نشانی کو دھوم دھام سے رخصت کرنا چاہتا۔ اس لئے متعدد پیغاموں کے باوجود کسی سے نسبت پختہ نہ کی اور وقت کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اچھے دن آنے کے بظاہر کوئی اسباب نہ تھے جاگیر برائے نام باقی تھی مقامی روساء اور امراء حیثیتوں سے زائد اعانت کر چکے تھے ان سے غیر معمولی عطیات کی توقع نہ تھی۔ فن کا سہارا لیا جا سکتا لیکن اس کا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شاہنامہ کے اوراق اپنی ناقدری کا ماتم کر رہے تھے ان حالات میں بجز مایوسی کے امید نہ بندھتی مگر فردوسی نے ہمت نہ ہاری اور آخری کوشش کرنے کے لئے وطن سے نکل کھڑا ہوا۔

طوس میں اس کے بہت سے اعزا اقربا تھے مگر اس کو قرابت داروں سے زیادہ احباب پر بھروسہ تھا۔ اس لئے بیٹی اور نوشابہ کی کنیز کو حسین قتیبہ کے سپرد کیا اور وہ شاہ سے مرتبہ و [illegible] حاصل کرنے کے لئے غزنی کا عازم ہو گیا۔

بارہ سال کے بعد گھوڑے کے دن پھرتے ہیں۔ فردوسی کی قسمت نے ساری عمر کے بعد کروٹ لی۔ اور سلطان محمود کی کرمفرمائی سے آسائش کی زندگی میسر آگئی۔ اس کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ فرنگیس کی شادی میں دل کے حوصلے نکال کر نامراد محبوبہ کی روح کو شاد کر سکے گا۔ لیکن ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ فردوسی کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ اور اس کی زندگی از اول تا آخر حسرتوں اور ناکامیوں کی مثالیہ بن کر رہ گئی۔

فردوسی کو قسام ازل سے کتنا ہی کھوٹا مقدر کیوں نہ ملا ہو مگر احباب کے معاملہ میں وہ خوش نصیب تھا۔ طوس میں حسین قتیب۔ علی دیلم اور بو دلف اس کے سچے دوست تھے فرنگیس کو وہ حسین قتیب کو سونپ کر گیا تھا۔ لیکن علی دیلم اور بو دلف بھی اپنے کو بری الذمہ نہ سمجھتے۔ ایک روز اس کے تینوں ہمدرد یک جا ہوئے اور حسین قتیب نے فرنگیس کی شادی کا ذکر کیا۔ بو دلف اور علی دیلم بھی سوچ میں پڑ گئے حسین قتیب کا کہنا بے جا نہ تھا کہ فردوسی کی واپسی کے لئے وقت کا تعین کیا نہ جا سکتا۔ اور نوشابہ کی بیٹی سن سے اتری جا رہی تھی۔ فردوسی اس کو جاگیرداراً نہ شان و شوکت سے بیاہنے کا انتظام کرنے کے لئے گیا تھا مگر اس کے لئے کوئی دلیل نہ تھی کہ وہ کامیاب ہو کر ہی پلٹے گا۔ حسین قتیب کو اندیشہ تھا کہ اگر فردوسی کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور چند سال بعد بے نیل و مرام پلٹ کر آنا ہوا تو فرنگیس کی جوانی اک امید موہوم پر گذر چکی گی۔ اور بے زبان لڑکی کے مرادوں کے دن خام خیالی کی نذر ہو جائیں گے۔ علی دیلم اور بو دلف کو حسین قتیب کے خیال سے اتفاق تھا لیکن فردوسی کے کامیاب واپس آنے کی صورت میں ندامت اٹھانے کا خطرہ بھی

اس کا جواب حسین قتیب نے یہ دیا کہ اگر وہ بیٹی کے لئے کوئی دولت لے کر آئے گا تو بیٹے کے لئے اور ارمان نکالنے کے لئے وقت کا تعین نہیں ہوتا۔ باپ اپنی چہیتی بیٹی کو دلھن بنا کر دیکھ لے گا اور دیا جہیز دے کر دل کی تسلی کر لے گا۔ علی دیلم اور بودلف کی سمجھ میں بات آ گیا۔ اور فرنگیس کے لئے شوہر کا انتخاب کیا جانے لگا۔

فرنگیس با ہوش فوشا بر کی بیٹی تھی اور ماں کے خد و خال کی وارثہ دار اس کے لئے خواستگاروں کی کمی نہ تھی۔ کتنے ہی امیرزادے اور رؤسا کے لڑکے دامان آرزو پھیلائے تھے۔ حسین قتیب نے علی دیلم اور بودلف کے مشورے سے ایک امیرزادے کا انتخاب کیا۔ اور ایک روز تنہائی میں فرنگیس کو بلا کر استصواب کیا۔ فردوسی کی نور نگاہ اس پرسش پر ششدر رہ گئی۔ حسین قتیب نے مختصر لفظوں میں صورت حال بیان کر کے کہا کہ فردوسی مجھ کو اپنا قائمقام بنا گیا ہے۔ میں اپنے اختیارات سے شادی کی تجویز کر سکتا ہوں لیکن شوہر کو منتخب کرنے کا حق بیٹی ہی کو ہے لہذا اس کی رضا ضروری ہے انہوں نے کئی لڑکوں کے نام لئے اور جس کو انتخاب کیا تھا اس کی بابت کہا کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کا نام بھی لے سکتی ہے۔ فرنگیس کا گلا بھر آیا آنسو آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اور وہ کچھ بول نہ سکی۔ حسین قتیب نے پھر استفسار کیا اور جب فرنگیس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا کہ شاید وہ اس کو فردوسی کی جگہ پر نہیں سمجھتی۔ فرنگیس نے اس کو روٹھتے دیکھ کر حسرت آلود نظر اٹھائی اور دامن پکڑ کر رونے لگی۔ حسین قتیب کا دل غریب لڑکی کی اشکباری پر کڑھنے لگا۔ مگر وہ اس کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ اس نے پوچھا کہ آخر اس کا منشا کیا ہے فرنگیس نے کانپتی ہوئی آواز میں رک رک کر ماں کی رضا ہونے کا اظہار کر دیا

اور حسین قتیب پدرانہ شفقت میں پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گیا۔

شاداب[1] کے جاگیردار کی بیٹی ایک خاندانی امیرزادے سے منسوب کر دی گئی۔ حسین قتیب نے شادی کے تمام مصارف تنہا برداشت کئے۔ علی دیلم اور بو دلف نے جہیز فراہم کیا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد ایک نیک ساعت پر فرنگیس ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئی۔ اور حسین قتیب علی دیلم اور بو دلف دوست کی امانت کے بوجھ سے سبکبار ہو گئے۔

فرنگیس نے ایک چاہنے والا شوہر اور کھاتا پیتا گھر پایا تھا اور ہر طرح خوش و خرم تھی مگر باپ کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی حافظے سے نہ اترتا جو اس کی نگاہ میں صرف اس کی خاطر دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوگا۔ کنیز اس کے ساتھ تھی۔ سسرال میں کسی اور سے تو بے تکلفی نہ تھی دکھ درد کی سننے والی ماں کی بوڑھی کنیز ہی تھی جب بھی موقع مل جاتا فردوسی کے متعلق اس سے چند باتیں کر کے غم کو ہلکا کر لیتی۔ کنیز اس کو تسلی دیتی اور فرنگیس تصور میں فردوسی کو پردیس کی خاک چھانتے دیکھنے لگتی۔

علی دیلم۔ بو دلف اور حسین قتیب باری باری دوسرے تیسرے اس کو بلاتے رہتے اور فرنگیس کو محسوس نہ ہونے دیتے کہ اس کا باپ وطن سے دور ہے فرنگیس کا دل بھی ان کی تقویت پر مضبوط تھا اور وہ کسی غریب لڑکی کی طرح بیاہی بھی گئی

---

[1] فردوسی کی بیٹی کے متعلق کسی تذکرے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی شادی ہوئی تو کب؟ اور کس کے ساتھ؟ میں نے از روئے قیاس زیب داستان کے لئے یہ باب لکھ دیا ہے اس جسارت کو قارئین معاف فرمائیں۔

تھی۔ فردوسی کے پرستاروں نے فردوسی کی عدم موجودگی میں اس کی بیٹی کو اس طرح رخصت کیا تھا جو فردوسی کے سامنے ممکن نہ ہوتا شادی کے بعد چوتھی بار جب وہ حسین قتیب کے گھر آئی تو دو روز مقیم رہی تیسرے دن غزنی سے بھیجا ہوا فردوسی کا خط پہونچ گیا۔ حسین قتیب نے اس کو پڑھ کر نرگیس کو لاکر دے دیا اور باپ کی یاد میں تڑپنے والی بیٹی نے شدت جذبات میں آنکھوں سے لگا لیا۔ چند منٹ میں طبیعت پر پر قابو پایا تو کھول کر پڑھنے لگی۔

ابتدائی سطور میں فردوسی نے اپنے سفر کا حال درج کیا تھا۔ نرگیس اس کو ایک روانی سے پڑھ گئی اور غزنی کے واقعات پر پہونچ گئی۔ محمود کے دربار میں باپ کی عزت افزائی کے تذکرے پر اس کا چہرہ فرط مسرت سے گلنار ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد فردوسی نے اس کی جوانی کا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ اب وہ تو شاہ کی امانت کو شاہوں کی لڑکیوں کی طرح رخصت کرے گا۔ اس مقام پر نرگیس نے ضبط سے بہت کام لیا مگر اسکے آنسو نکل آئے۔

حسین قتیب ایک طرف سر جھکائے متفکر تھا۔ اس کو فردوسی کے خیال سے ندامت ہو رہی تھی اور اپنی عجلت پر تاسف۔ نرگیس کو آنسو بہانے سے فرصت ہوئی تو اس نے حسین قتیب کی طرف دیکھا وہ فردوسی کی لڑکی تھی چہرے سے خیالات کو تاڑ گئی اٹھ کر قریب آئی۔ ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح بانہیں گلے میں ڈال دیں اور کہنے لگی ———— آپ کیوں شرمندہ ہو رہے ہیں۔ لکھ دیجئے کہ شادی نرگیس کے ایما پر کر دی گئی۔ حسین قتیب فردوسی کی بیٹی کی ذہانت اور احساس فرض پر تڑپ اٹھا۔ بشاش ہو کر اس کو شاباشی دی اور جواب کو ملی دیلم اور بو دلف کی رائے پر منحصر کر دیا۔

نرگس شام کو سسرال چلی گئی۔ حسین قتیب نے خط دونوں دوستوں کے سامنے پیش کیا۔ ان کو بھی فردوسی کی کامیابی سے بہت خوشی ہوئی۔ مگر نرگس کے معاملہ میں ان کے جذبات بھی حسین قتیب سے مختلف نہ رہے۔ آخر سوچ سمجھ کر تمام واقعات پر مشتمل ایک مشترکہ خط لکھا گیا۔ جس میں تینوں دوستوں نے اپنی تعجیل اور اختیارات کے بے جا استعمال پر شرمساری کا اظہار کیا۔ نرگس نے علیحدہ خط لکھا اور بند الفاظ میں تحریر کیا کہ حسین قتیب، علی دیلم اور بودلف نے جو کچھ کیا۔ وہ انتہائی فرض شناسی کی دلیل ہے اور ذاتی طور پر وہ اس سے اختلاف نہیں رکھتی اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں اس نے اطمینان کا اظہار کیا اور اس کو فردوسی کے دوستوں کا رہین منت قرار دیا۔

حسین قتیب نے دونوں خط ملفوف کر کے عامل طوس کے حوالے کر دیے جو تاریخ تحریر کے دو ماہ بعد غزنی پہنچ گئے اور ہرکارہ کے ذریعہ فردوسی کو مل گئے۔

فردوسی نرگس کے لئے جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ عالم خیال میں طوس کے باشندوں کی زبانی بنت نوشابہ کی شادی کے تذکرے سنتا۔ وہ نرگس کو شاہانہ جلوس کے ساتھ شادآب کے جاگیردار کی ڈیوڑھی سے رخصت ہوتے دیکھتا۔ ان خطوط نے خیالات کا قلعہ مسمار کر دیا اور فردوسی انتہائی بلندی سے نیچے آگرا تھوڑی دیر تک تو صدمے میں ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر بیٹی کی تحریر اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس نے پورے زور قلم کے ساتھ تقریب شادی کی تفصیل اور جہیز کی فہرست درج کی تھی۔ فردوسی کو اپنے مخلصوں کی نیتوں پر پہلے بھی شک نہ تھا۔ ہاں جلد بازی کی شکایت تھی۔ نرگس کا خط دوسری بار دیکھنے سے اس شکایت میں بھی کمی ہو گئی۔ اور وہ اس کو نوشتہ تقدیر قرار دینے لگا۔

حسین قتیب نے اس کی تسکین کی ایک شکل تحریر کر دی تھی کہ جب وہ طوس آئیگا

تو فرنگیس پھر ایک نو عروس کی طرح آراستہ کی جائے گی۔ اور فردوسی کی بیٹی فردوسی کے سامنے رخصت ہو کر جائے گی۔ فردوسی کی فریب تسلی کے لئے یہ کافی تھا۔ اصل و نقل کا فرق سمجھتے ہوئے بھی اس نے اپنے کو بہلا لیا۔ کیونکہ مجبوری کا نام صبر تھا۔

ایک شب وارد رودہ کافی متاثر رہا۔ اس کے وطن چھوڑنے کا مقصد فوت ہو گیا تھا۔ لیکن حسین قتیبہ کی تحریر بار بار پڑھنے سے یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ اگر فرنگیس کا عقد فردوسی کی طوس کی واپسی تک ملتوی رکھا جاتا تو بے زبان دوشیزہ کے جذبات شباب کا خون اس کی ناعاقبت اندیشی پر ہوتا جس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ دن گذرنے کے ساتھ فردوسی دوستوں کے اقدام کو برمحل سمجھنے لگا۔ اور اپنے مقام پر طے کر لیا کہ اس کو بیٹی کے ساتھ جو سلوک کرنا ہے غزنی سے واپس ہو کر کرے گا۔ حالانکہ فرنگیس کے متعلق فردوسی کا کچھ سوچنا عبث تھا۔ فردوسی کا جو کچھ تھا یا مستقبل میں ہوتا وہ سب فرنگیس ہی کا تھا۔ اس کے علاوہ اور بلیھا ہی کون تھا؟ جو وراثت کا دعویدار بن سکتا۔ جہاں تک نوشابہ کی روح کی خوشنودی کا سوال ہے۔ وہ صرف فردوسی کی تسکین ضمیر کی بات تھی اور فردوسی نے اس کے اسباب فراہم کر لئے تھے۔ فرنگیس دوشیزہ ہوتی یا شادی شدہ جب بھی وہ اس کے لئے دولت کے انبار لگا دیتا۔ اس کا دل خوش ہوتا اور نوشابہ تصور میں مسکراتے محسوس ہوتی۔

فردوسی نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔ پھر بھی کسی کسی وقت منصوبہ پورا نہ ہو سکنے کا خیال آ جاتا۔ اور وہ مضمحل نظر آنے لگتا۔ ایک صبح کو وہ انھیں خیالات میں غلطاں تھا اتفاق سے زیبا خلاف وقت آ گئی۔ اور اس کے متفکر ہونے کا سبب پوچھنے لگی فردوسی زیبا سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس نے پورا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ زیبا نے شادی کو مناسب قرار دیا اور اسی کی تکلیف کو بے محل بتایا۔ زیبا نوشابہ کی تصویر تھی۔ فردوسی

نے اس کے الفاظ کو نوشابہ کے الفاظ سمجھا۔ اور اس کے دل و دماغ سے ایک بوجھ اتر گیا:۔

فرنگیس کی ازدواجی زندگی شروع ہونے کی خبر فردوسی کے لئے مسرتوں کا نوید بن گئی اور اس کا دل بیٹی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو گیا مگر ابھی اس کو غزنی آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے جو سلطان سے وطن جانے کی خواہش کرتا۔ علاوہ بریں شاہنامہ کی تکمیل ہر حال میں مقدم تھی جس کے صلے سے فرنگیس کے مستقبل کا بہت کچھ تعلق تھا۔ سوچ سمجھ کر اس نے دل پر جبر کر لیا۔ اور شاہنامہ لکھنے میں مشغول ہو گیا

باب (۱۲)

نسل و رنگ کا محافظ

سلطان محمود کے قیام حکومت کے بعد سے اس کے دربار میں دو جماعتیں برسراقتدار تھیں۔ ایک فضل اسفرائنی کی۔ دوسری خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی کی اول الذکر جماعت کا زور زیادہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فضل اسفرائنی وزارت عظمیٰ پر فائز تھا اور محمود دیرینہ خدمات کی بنا پر اس کا لحاظ کرتا۔ اگر بزرگ احمد کا شمار بھی بڑے بزرگوں میں تھا۔ درباریوں کی ایک بڑی تعداد کو اس نے ہمنوا بنا رکھا تھا۔ جن میں شعراء کی اکثریت اور ابوسہل سرد بیر پیش پیش تھا۔

بزرگ احمد کو فردوسی سے تو اُس روز سے عناد پیدا ہوگیا تھا۔ جس دن اسے فضل نے سلطان سے اس کی تعریف کی تھی مگر فردوسی کی غیر معمولی صلاحیت نے بیخکنی کا موقع نہ دیا تھا ورنہ وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ زیبا کا شمار کسی جماعت میں نہ تھا کیونکہ وہ فن کار ہونے کے باوجود درباری تجمیوں سے الگ تھی اور نہ اس نے کسی سے اپنے تعلقات ہی بڑھائے تھے جو اس کے جماعتی رجحان کا اندازہ ہوتا بلکہ اس کا شمار اگر کیا جا سکتا تو بزرگ احمد ہی کے گروہ میں کیونکہ ابوسہل اس کا طرفدار تھا لیکن جس دن سے ابوسہل اس کے خلاف ہوگیا۔ بزرگ احمد کے لئے بنا مخاصمت پیدا ہوگئی۔ پھر بھی اس نے کھل کر اور دلچسپی لے کر ریشہ دوانی نہ کی۔ مگر جب فردوسی سے

زیبا کے پنپنگ بڑھنے کا شہرہ ہوا تو بزرگ احمد نے توجہ کی اور اس کو ایک وار میں دو شکار کرنے کا موقع مل گیا۔ ابو سہل کو اشارہ کر کے اس نے فردوسی اور زیبا کے لئے بدنام کن داستانیں مشتہر کرنا شروع کر دیں حتیٰ کہ اسکی آواز سلطان کے کانوں میں پڑ گئی

سلطان کو کسی کے نجی معاملات سے سروکار نہ تھا۔ اور زیبا اگر فردوسی کی طرف ملتفت تھی تو اس کے لئے مسرت کا محل تھا۔ دونوں اپنے اپنے فن کے باکمال تھے شعر و موسیقی کی ہم آہنگی رونق محفل کے اضافہ کا باعث بن جاتی۔ لیکن ایک دن فردوسی کے ذکر کے سلسلہ میں بزرگ احمد نے کہہ دیا۔

بڑے پاک طینت۔ بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں

سلطان کو خیال پیدا ہو گیا۔ فردوسی ایک اچھا شاعر ہی نہ تھا۔ اہل علم اور فلسفی بھی تھا۔ غزنی میں اس کے زہد اور عبادت کے چرچے تھے۔ کسی رقاصہ کی طرف اس کا میلان تعجب خیز تھا اور ناقابل یقین بھی سلطان نے اڑتے اڑتے سنا تھا۔ بزرگ احمد نے اس کی تائید کر دی تو سلطان نے کان کھڑے کئے۔ ایاز فردوسی کی بریت میں کچھ کہنا چاہتا۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ سارے غزنی میں اگر زیبا کسی کے وہاں جاتی یا کوئی اس کے گھر آتا تو وہ فردوسی تھا۔ اس لئے وہ قطعی طور پر کچھ کہہ نہ سکا۔ پھر بھی اتنا کہے بغیر نہ رہا کہ بلا کر پوچھا جائے۔ ممکن ہے کہ ایک دوسرے کی صلاحیت کا قدردان نکلے۔ محمود کو بھی اس مسئلہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس نے اسی وقت دونوں کی طلبی کی ہدایت کر دی۔

مالک سلطان کے پاس موجود نہ تھا۔ غلام جب فردوسی اور زیبا کو لانے

کے لئے جا چکے تو وہ آداب شاہی بجالایا۔ ایک درباری سے اس کو حال معلوم ہوا فردوسی نے نوشابہ کے ذکر کو عام نہ کرنے کی ہدایت کردی تھی۔ اس لئے ما ایک بول نہ سکا تاہم دبی زبان سے اس قدر عرض کردیا کہ ان کو تخلیہ میں طلب کیا جائے۔ تاکہ صحیح حالات گوش گذار کرنے میں تکلف نہ ہو۔ سلطان کو یہ تجویز پسند آئی۔ اور فردوسی و زیبا کے بعد دیگرے آکر پہنچے تو سلطان نے ان کو ایک ساتھ تنہائی میں حضوری کا موقع دیا۔

سلطان کو خیال تھا کہ وہ اس طلبی پر خوفزدہ ہوں گے مگر اس نے جب ان کے چہروں کو مطمئن اور بے خوف پایا تو کچھ متحیر رہ گیا۔ اور چند منٹ کے وقفہ سے سُنی ہوئی باتوں کے متعلق مستفسر ہوگیا۔ زیبا بالکل خاموش تھی۔ فردوسی نے قدرے توقف سے نوشابہ کی سرگذشت کہہ سنائی محمود اس کی المناک داستان پر آبدیدہ ہوگیا اور اس نے ان کو جانے کی اجازت دے دی۔ فردوسی نے اٹھنے سے قبل سلطان سے استدعا کی کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے واقعات مشتہر ہوں۔ لہذا سلطان ان کو اپنے تک محدود رکھے۔ محمود نے وعدہ کرلیا اور زیبا و فردوسی سلام کرکے چلے گئے۔

بزرگ احمد کی یہ شرمناک شکست تھی جو اس نے فردوسی کے مقابلہ پر کھائی۔ سلطان نے بلا سوچے سمجھے بات کہہ دینے پر اس کو پھٹکار بتائی اور کہا کہ زیبا فردوسی کی قدرشناس ہے اور فردوسی اس کے گانے کو پسند کرتا ہے۔ جس پر اتنے حاشیے چڑھا دیے گئے۔ آئندہ کے لئے اس نے ہر ایک کے کان کھول دیے کہ جو ان کے لئے فضول باتیں پھیلائے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ سلطان کا اتنا کہہ

دینا کافی تھا۔ بزرگ احمد اور ابوسہل کو تو سانپ سونگھ گیا دوسرے اہل دربار بھی بت بن گئے۔ اور اس دن سے کسی نے کچھ کہنے کی جسارت نہیں کی۔

سلطان کی جنبہ داری نے زیبا اور فردوسی کو کچھ دنوں کے لئے ابوسہل اور بزرگ احمد کی نیش زنی سے محفوظ کر دیا حالانکہ زیبا چاہتی تو ابوسہل کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لیتی۔ اپنی مخالفت کے وجوہ میں اس کے اظہار تمنا کا بیان کر دیتی۔ سلطان جس کو باور کر لیتا۔ کیونکہ شروع میں وہی اس کا پشت پناہ تھا اور درمیان میں ایک مرتبہ وہ اس سے سلطان کو بدظن کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ زیبا سرسری طور پر بھی کہہ دیتی تو ابوسہل کے قدم جمے رہنا مشکل ہو جاتا مگر وہ اتنی کم ظرف نہ تھی کہ ابوسہل کے احسان کو بھول کر انتقام پر اتر آتی وہ اس نے صرف اپنے بچاؤ پر اکتفا کی اور فردوسی کے ساتھ بارگاہ سے باہر آگئی۔

قابوس اور ماہ رخ بیرون بارگاہ منتظر تھے فردوسی نے مختصراً واقعہ بیان کر دیا اور ان کے ساتھ زیبا کے مکان پر آ گیا۔

زیبا فردوسی کے متعلق ہر بات سے واقف ہو گئی تھی مگر فردوسی کو زیبا کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک بار اس نے پرسش کی جسارت کی تھی۔ زیبا نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس دن سے فردوسی نے کچھ نہ پوچھا تھا۔ لیکن بارگاہ سے واپس آ کر جب ماہ رخ اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ زیبا کے ساتھ اس کی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا تو چند لمحے ساکت رہ کر اس نے زیبا کو مخاطب کیا اور کہا۔

ہماری آپس کی یگانگت اور خلوص اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ دنیا اس پر انگشت نما ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم ایک دوسرے کے حالات سے اجنبی ہیں۔

"اس سلسلہ میں آپ کوئی گفتگو نہ کرتے تو اچھا تھا۔" زیبا نے نہایت متانت سے کہہ کر گردن جھکا لی۔ مگر فردوسی نے اس کی ہمت شکنی کا اثر لئے بغیر اضافہ کیا۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ تم سے کچھ پوچھنے کے لئے اصرار نہ کروں گا۔ لیکن تم نہیں جانتی کہ نوشابہ کے واسطے تمھارا وجود میرے کتنا قریب آگیا ہے! کوشش کرنے پر بھی دل نہیں مانتا کہ تمھارے بابت کسی بات سے انجان رہوں۔"

"کیا ملتا ہے آپ کو میرے تپکتے ہوئے ناسوروں کو چھیڑنے سے؟" زیبا ایک اندرونی کرب سے بلک پڑی اور فردوسی کا دل ہل گیا۔ اس نے ایک بے چینی کے ساتھ زیبا کو دیکھا۔ ذہنی تکلیف سے اس کے چہرہ کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ فردوسی نے پرسش کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر ایک اضطراب طبیعت میں کروٹیں لیتا رہا کہ وہ کون سا راز ہے جس کا انکشاف خوبرو دوشیزہ کے لئے اس قدر اذیت رساں ہے۔ ہمدردی کی ایک لہر رگوں میں دوڑنے لگی۔ اور اس کی زبان سے نکل گیا۔

"تم بتانا نہیں چاہتیں تو نہ بتاؤ لیکن میرے دل میں ایک خلش ہوتی رہے گی۔"

زیبا فردوسی کی رتبہ شناس تھی۔ شاہنامہ اس کی نگاہ میں ایک صحیفۂ آسمانی تھا جو جز جز کرکے فردوسی پر اتر رہا تھا۔ اپنی طرف شاعر اعظم کی مجنونانہ گرویدگی بھی اس کو شاد کئے ہوئے تھی۔ فردوسی کے یاس انگیز لہجہ اور الفاظ پر بیچارگی کے عالم میں زیبا نے نگاہ اٹھائی اور دردآمیز انداز میں بولی۔

"آپ میری وقعت کو اپنی اور میری نگاہوں میں گرانے پر تلے ہوئے ہیں تو یہ

اجداد کی رسوائی گوارا کر لوں گی۔ لیکن آپ کو الفاظ دینا پڑیں گے کہ میرے عزائم میں مداخلت نہ کریں گے۔"

زیبا کے جملوں پر فردوسی کا تجسس کچھ بڑھ گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راز کو سینہ میں محفوظ رکھے گا۔ اور راستہ میں حائل ہونے کی سعی نہ کریگا زیبا کچھ کہنے کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر خود بخود بپھر گئی۔ اور دیوانگی کے انداز میں کہنے لگی،

"نہیں۔ میں اپنی زبان سے اسلاف کے ناموس کو مطعون نہ کراؤں گی۔ میں نے دستگیر کی ہدایت پر عمل کرنے کا عہد کیا تھا۔ اس عہد کو توڑ نہیں سکتی۔"

فردوسی اس کی حالت پر نقش حیرت بنا ہوا تھا۔ "دستگیر" کا نام سنتے ہی اس نے دریافت کیا۔

"کیا دستگیر سے تمھارا کچھ تعلق ہے ——؟"

زیبا نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اپنی حالت پر کچھ قابو پا چکی تھی۔ دیر تک گردن جھکائے سوچتی رہی۔ پھر دفعتاً سر اٹھا کر کہنے لگی۔

"دستگیر کا نام تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا۔ اب اس کی اولاد کی داستان بھی سن لیجئے۔"

ایک لحظہ کے لئے اس نے دم لیا۔ پھر فردوسی پر نگاہ ڈال کر کہنے لگی؛

"سام بن نریمان کی نسل سے ایک خاندان فارس کے مضافات میں آباد تھا جس کو اپنی نجابت پر ناز اور بے داغ خون پر فخر تھا اور بعید تک اس خاندان نے اپنا امتیاز برقرار رکھا۔ آبا و اجداد کا مسلک ترک نہ کیا۔ شادی بیاہ میں نہ غیر

خاندان کی لڑکی بیاہ کر لائے اور نہ اپنی لڑکی باہر بھیجی۔ اچھے اور بُرے رشتے جو بھی ممکن ہوسکے نسل کو مخلوط ہونے سے بچانے کے لئے آپس ہی میں کر دیے گئے۔ اور ایران کی سرزمین میں خالص ایرانی خون کی لاج باقی رہی۔

اسلام کے عروج کو ڈھائی صدیاں گذر چکی تھیں۔ فارس کے چپے چپے پر دین محمدی کی ضیا باری ہو رہی تھی۔ زرد ہشت کا مذہب اپنے آخری دن دیکھ رہا تھا اور آتش پرستی کا آفتاب غروب ہو چکا تھا مگر اس خاندان نے اپنی وضع میں فرق نہ آنے دیا اور انقلاب کے دھارے سے اپنے کو بچائے رکھا۔ اس کو نہ صرف دہقانیت کا مسلک عزیز رہا۔ بلکہ نسل و رنگ کی خصوصیت کو بھی برقرار رکھا مگر سپہبد کے بعد اس کا غرور خاک میں مل گیا۔ اور خالص ایرانی خون میں آمیزش شروع ہو گئی۔"

زیبا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی داستان شروع کر دی۔

"سپہبد کے دو لڑکے تھے۔ رستمدار اور دستگیر۔ رستمدار پر مسلمانوں کے خلاط نے اثر کیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ دستگیر کو اس کا یہ فعل ناگوار گذرا مگر اس نے قطع تعلق نہ کیا۔ بلکہ اس کو سمجھایا کہ جو کچھ اس نے کیا اس کا وہ مجاز تھا۔ لیکن خاندان کے امتیاز پر آنچ نہ آنے دے۔ رستمدار نے اس کا وعدہ کر لیا اور سپہبد کی اولاد دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک کا عقیدہ زردہشت پر باقی رہا۔ اور دوسری نے رسول عربی کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔

دستگیر بزرگ خاندان تھا۔ اس نے حتی الامکان نسل کو خلط ملط ہونے سے بچایا۔ مگر اسلام کی تعلیمات کے سامنے اس کی چل نہ سکی۔ اور رستمدار کی بیٹیاں مسلمانوں میں بیاہ گئیں۔ اس کی ایک نواسی کا نام نوشابہ تھا جس کی

شادی "شاداب"[1] کے جاگیردار کے گھر ہوئی تھی۔"

"نوشابہ، دستگیر کی نواسی تھی ——!" فردوسی چلا اٹھا۔ زیبا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ آنچل سے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بیان جاری کر دیا۔

"ہاں استمداد کے رشتہ سے وہ اس کی نواسی ہوئی۔ مگر دستگیر اس شادی کے وقت موجود نہ تھا۔ اس سے بہت پہلے وطن کو خیرباد کہہ چکا تھا اور چلتے وقت ستمدار اور اس کی اولاد سے وعدہ لیا تھا کہ آئندہ وہ اس سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے اور نہ مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام سے اپنے رشتہ کا اعلان کریں گے۔ ستمدار کے خاندان نے کسی بات میں دستگیر کا کہنا نہیں مانا۔ مگر اس نصیحت پر عمل کیا اسکو پھر کوئی تکلیف نہ دی۔ اور نہ سام بن نریمان سے اپنے حسب و نسب کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ اگلی نسلوں کے علم میں بھی یہ بات نہ رہی کہ کبھی وہ اقلیم فارس کے تاجدار تھے اور درفش کاویانی ان کے سروں پر سایہ فگن رہا تھا —— نوشابہ کو خاندان کے حالات معلوم ضرور رہے ہوں گے لیکن اس نے شاید نانا کے دیئے ہوئے قول کا احترام کیا۔ اور اپنے لب نہ کھولے۔ جبھی آپ اس کے بجائے میری زبان سے یہ سرگزشت سن رہے ہیں۔"

شدت جذبات میں زیبا کی سانس پھول رہی تھی دم لینے کے لئے وہ ٹھہر گئی۔ فردوسی، دستگیر کے حالات سننے کو مضطرب تھا۔ لیکن زیبا کے احساسات کا لحاظ

---

[1] فردوسی کے اجداد کا مذہب بھی آتش پرستی تھا۔

کرکے زبان دہلا سکا۔ زیبا چند منٹ تک الٹی سیدھی سانسیں بھرتی رہی پھر اپنی داستان جاری کرنے کے لئے فردوسی پر نگاہیں جما دیں اور کہنے لگی۔

" دستگیر کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی شیرزاد کے ساتھ ہوئی تھی۔ ترک وطن کے ہنگام اس نے تمام زردشتی اہل خاندان کو ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر کوئی تیار نہ ہوا۔ دستگیر اپنی دھن میں بیٹی داماد کو لیکر چل پڑا اور ایران کے مختلف حصوں میں گھومتا پھرتا بلخ پہونچ گیا۔ بلخ میں کچھ دنوں کے لئے اقامت اختیار کی۔ اس کا مقصد وطن چھوڑنے سے صرف یہ تھا کہ اپنی نسل کو داغدار ہونے سے بچالے۔ کیونکہ وہاں رہ کر اس کے امکانات نظر نہ آرہے تھے۔ اسلام کی جامعیت دلوں میں گھر کر رہی تھی اور رشتہ دار آتش پرست اقرباکو برابر مسلمان بناتا جارہا تھا۔ اس لئے دستگیر کو صرف یہی ایک صورت دکھائی دی کہ باقی عمر گمنامی میں گذار دے۔ کیونکہ اس کو بیٹی داماد کی طرف سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بھی بچا کے اقتدار میں نہ آجائیں۔

بلخ میں وہ مستقلاً رہنا نہ چاہتا۔ لیکن شیرزاد کا دل وہاں لگ گیا۔ اس نے شاہی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ لہٰذا دستگیر کو ٹھہرنا پڑا۔ اسی زمانے میں اس کی لڑکی حاملہ ہو گئی۔ اور شیرزاد کے وہاں پہلی ولادت ہو گئی۔ دستگیر کو بیٹی کے حاملہ ہونے کی خبر سے فکر پیدا ہو گئی تھی اور نسل و رنگ کا سوال دماغ میں منڈلانے لگا تھا۔ مگر نواسی کی شکل دیکھی تو پیار آگیا۔ سوچ بچار جاتا رہا۔ اور وہ اس سے اپنا غم غلط کرنے لگا۔

لڑکی کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ کچھ دنوں زندہ رہ کر فوت ہو گیا

کئی سال کے وقفے سے پھر لڑکی کی ولادت ہوئی اور دستگیر کی گود میں ایک کے بجائے دو دنیا ئیں کھیلنے لگیں۔ بوڑھا زرتشتی ان بچوں سے بہت مانوس تھا۔ گردنیا کے بھی عجیب کارخانے ہیں وہ کسی کو ایک حالت پر قائم رہنے نہیں دیتی دستگیر کی مسرتوں کو بھی دیرپائی میسر نہ آئی۔ اس کی بیٹی اچانک بیمار ہو گئی اور چند ہی روز میں ضعیف باپ کو تڑپتا چھوڑ کر سفر آخرت کر گئی۔ اکتفا صرف اسی پر نہیں ہوئی زوجہ کے ساتھ نوزائیدہ بچی بھی زندہ نہ رہی اور ماں کے مرنے کے پانچویں روز چل بسی۔

دستگیر کو زندگی کے بہت تلخ تجربات تھے۔ آن تو فارس ہی میں جاتی رہی تھی جان بخارا میں نکل گئی۔ اکلوتی بیٹی کو دم توڑتے دیکھنے سے یہی اچھا تھا کہ وہ خود کشمکش حیات سے چھوٹ جاتا۔ مگر موت اور زندگی اختیاری نہیں ہوتی۔ دستگیر کو تڑپتے رہ کر جینا تھا۔ فطرت سے وہ جنگ نہ کر سکا۔ اس کا توازن عقل و ہوش جاتا رہا۔ گھنٹوں سکوت کے عالم میں بیٹھا رہتا۔ آخر ایک شب اپنے وفادار غلام قابوس کو لے کر کسی طرف کو نکل گیا۔ اور شیرزاد کے نام ایک تحریر چھوڑ گیا جس میں اپنا تعاقب نہ کرنے کی ہدایت تھی۔ اور لکھا تھا کہ اس کی نواسی کی شادی اگر کی جائے تو ایسے گھر میں جس کی نسل آمیزش سے پاک ہو۔ اور تلاش کے باوجود کامیابی نہ ہو تو بیٹھ کر عمر گزارنے کے لئے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

شیرزاد کے لئے دستگیر کی مفارقت بڑے صدمے کا سبب بن گئی مگر ہر چہ بر اولاد آدم بگذرد۔ اپنی لڑکی کی دیکھ بھال وہ فرض عین جان کر کرنے لگا۔ حالانکہ اس کے لئے بہت دشواریوں کا سامنا تھا۔ دل زوجہ کی موت کے صدمے سے

ٹوٹ چکا تھا۔ جینے میں لطف باقی نہ رہا تھا۔ تاہم وہ جیتا رہا۔ اپنے لئے نہیں اس نشانی کے لئے دستگیر کی دختر جس کو اس کے سپرد کر گئی تھی ملازمت پر جاتا تو لڑکی کو محلہ میں کسی کے وہاں چھوڑ دیتا اور واپس آتے ہی کلیجے سے لگا لیتا۔

ایک مدت کے بعد دستگیر کے ہرات میں موجود ہونے کا پتہ چلا۔ شیرزاد خود اس کے پاس گیا۔ ننھی سی بچی اس کے ساتھ تھی اس نے نانا کو پہچان لیا اور اس سے لپٹ گئی۔ دستگیر کے آنسو نکل آئے۔ مگر اس نے ان کو پونچھ لیا۔ اور نواسی کو آہستہ سے الگ کر دیا .... وہ ایک اہل علم انسان تھا۔ اس کے پاس بہت سی قدیم کتابیں تھیں جو نسلاً بعد نسل ترکے طور پر اس تک پہنچی تھیں۔ دستگیر ان کتابوں کو بہت عزیز رکھتا۔ چنانچہ بلخ سے روانگی کے وقت بھی ان کو لیتا گیا تھا۔ ہرات میں یہی کتابیں اس کی رفیق تھیں۔ رقص و موسیقی، علم ہندسہ اور کہانت میں اس کو کافی دخل تھا۔ جس میں یہ کتابیں معین ہوتی تھیں۔ شیرزاد کئی ہفتے ہرات میں مقیم رہا۔ اور اس نے دستگیر سے بلخ کو پلٹ چلنے کے لئے کہا۔ لیکن دستگیر دنیا سے الگ رہکر جینا چاہتا تھا۔ اس نے نواسی کی طرف تلخ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور بولا .... "پال پوس کر جوان کی ہوئی لڑکی نے بڑھاپے میں ساتھ چھوڑ دیا تو اور کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟" شیرزاد نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بپھر گیا۔ اور اس نے شیرزاد کو متنبہ کیا کہ وہ اس سے اتنا ہی تعلق رکھ سکتا ہے کہ کبھی کبھی بچی کو لے کر آتا رہے اور اگر اس نے اس سے زائد تکلیف دینے کی کوشش کی تو دستگیر ہرات کو بھی چھوڑ دے گا۔ شیرزاد نے حالات کو سمجھ کر سکوت اختیار کر لیا۔ اور چند روز گزار کر بلخ کو واپس ہو گیا۔

شیرزاد ہر چوتھے پانچویں مہینے بلخ جاتا اور ہفتہ عشرہ قیام کرکے واپس ہوتا
حتیٰ کہ شمس افروز کی عمر بارہ سال کی ہو گئی۔ مگر بیٹی کی جوانی باپ کے لئے پیغام
اجل بن کر آئی۔ شیرزاد کی تندرستی کو رفیقہ حیات کے مرتے ہی گھن لگ گیا
تھا۔ تاہم وہ مصیبتوں کو مردانہ وار جھیل رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا بھی
آگیا کہ قوت مدافعت کمزور پڑ گئی۔ اور شیرزاد پلنگ لگ گیا۔ بستر مرگ پر اس نے
دستگیر کو یاد کیا۔ شمس افروز نے قاصد بھیجکر نانا کو بلوایا۔ دستگیر ہرات سے ہلنے کا
نام نہ لیتا مگر جوان نواسی کے تنہا ہو جانے کا احساس بلخ کھینچ لایا اور بیٹی نے
جو امانت شیرزاد کے سپرد کی تھی۔ اس کو شیرزاد نے باپ کے حوالے کر دیا اور رفیقہ
حیات کے مرنے کے چھ سال بعد اس سے جا ملا۔

دستگیر کے پاؤں میں پھر شمس افروز کی زنجیر پڑ گئی مگر اس کو جلد ہی پابندی
سے چھٹکارا مل گیا ــــــــ فارس میں دستگیر کے قیام بلخ کی خبر پہنچ چکی تھی
یزدان داد نام کا ایک آتش پرست نوجوان تلاش معاش میں اس کو ڈھونڈھتا ہوا
بلخ پہنچ گیا۔ دستگیر کو اس کے نجیب ہونے کا علم تھا۔ اس نے یزدان داد کے وجود
کو عطیہ یزدانی سمجھا اور شمس افروز کو اس سے منسلک کر دیا۔

شیرزاد کی طرح یزدان داد کو بھی زرخوب میں جگہ مل گئی اور شمس افروز ایک
کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے لگی۔ زن و شوہر ایک دوسرے سے پروانہ
وار محبت کرتے اور تھے بھی دونوں اپنی اپنی جگہوں پر محبت کرنے کے لائق۔ شمس افروز
کا تو نام ہی اسکی خوبروئی کو ظاہر کرتا۔ مگر وہ اپنے نام سے زیادہ حسین تھی
اور یزدان داد کی رگوں میں بھی خالص ایرانی خون تھا۔ سرخ و سفید

رنگت کا تندرست نوجوان دیکھنے میں بھلا لگتا۔

دشمگیر کے پاس ابھی اجداد کی بچی کھچی دولت باقی تھی۔ بلخ میں کچھ دن رہ کر وہ پھر ہرات کو چلا گیا۔ اور وہاں علمی مشاغل میں لگ گیا۔ مگر اس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ایک روز یزدان داد کو نسل و رنگ کے محافظ کی موت کی خبر ملی۔ وہ شمس افروز کو لے کر ہرات پہونچ گیا لیکن دشمگیر کے بجائے اس کی کتابیں اور قابوس کی زبانی ایک پیغام موصول ہوا جو اس نے مرتے وقت نواسی اور داماد کے لئے دیا تھا۔ وہ پیغام یہ تھا کہ اگر وہ اپنے خون کو مخلوط ہونے سے بچا نہ سکیں تو ایسے لوگوں سے رابطہ قائم کریں جن میں کم سے کم آمیزش ہوئی ہو۔ یزدان داد یا وضع بزرگ کے الفاظ پر آبدیدہ ہو گیا۔ اور چند روز قیام کرکے بلخ کو واپس آیا۔

قابوس اور دشمگیر کی کتابیں بھی بلخ آگئیں۔ شمس افروز نے چند روز میں اپنے اخلاق سے قابوس کو مانوس کر لیا اور محسوس نہ ہونے دیا کہ اس کا آقا مر گیا۔ قابوس شمس افروز کو مالک اور اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگا۔ دشمگیر کی موت ایک پیچھے پڑی ہوئی بات بن گئی۔ اور زندگی کا محور خسرو نوں اور شادمانیوں کے ساتھ گھومنے لگا۔

قابوس کے لئے وہ دن روز عید سے کم نہ تھا جب شمس افروز کی گود میں ایک چاند سی بچی کھیل رہی تھی۔ قابوس کتنی دیر تک کھڑا دیکھتا رہا پھر اس کا دل نہ مانا اس کے ہاتھ پھیل گئے اور شمس افروز نے بچی کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ چند روز کی معصوم لڑکی بوڑھے غلام کو دیکھ کر اس طرح مسکرائے

لگی۔ گویا وہ ہمیشہ سے مانوس تھی۔ قابوس ہمہ تن متوجہ ہو کر گردن ہلا ہلا کر اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسی وقت میں یزدان داد آ گیا اور قابوس کی گود سے اس کو لے لیا۔ مگر بچی اس کی آغوش میں جاتے ہی رونے لگی۔ یزداں داد نے پھر قابوس کو دے دیا اور بچی پہلے کی طرح پھر ہنسنے لگی۔ غلام اور بچی مالک کے اس ربط کو اتفاق سمجھا گیا۔ لیکن درحقیقت یہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا خاموش اشارہ تھا۔ جو قدرت کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔

شمس افروز کے بعد دیگرے کئی بچے ہوئے مگر پہلی اور آخری لڑکیوں کے سوا کوئی زندہ نہ بچا اور اس کے بعد تو وہ چمن ہی اجڑ گیا جس کے وجود پر بہار آنے کا امکان تھا۔ یزداں داد کو ایک معرکہ میں جانا پڑا جہاں سے پلٹ کر آنا نہ ہوا۔ اور دستگیر کی خوبصورت نواسی عین عالم شباب میں بیوہ ہو گئی۔

شمس افروز کی بیوگی خود اس کے لئے جتنی بھی المناک ہوتی کم تھا۔ مگر اس کا زیادہ اثر قابوس پر پڑا۔ جوان فرزند مرجاتا تو شاید وہ اتنا ہی رنجیدہ ہوتا۔ یزدان داد کی موت پر جتنا غمگین تھا۔ تاہم اس نے فرض کا احساس کیا۔ شمس افروز کو بیٹی کی طرح تسلی دی اور اپنی زندگی میں غم نہ کرنے کی تلقین کی۔ شمس افروز کے لئے بھی کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے قابوس کا سہارا لے لیا اور عیش و عشرت میں بسر کرنے والے افلاس میں گزر کرنے لگے۔

دستگیر موت کے ہنگام وفادار غلام کو ایک حقیرانہ وختہ دے گیا تھا۔ قابوس نے اس کو دستگیر کی نواسی کے سامنے رکھ دیا اور تھوڑے دنوں تک معاش کی طرف سے بے فکری ہو گئی۔ مگر قابوس اس انتظام سے مطمئن نہ ہوا اور محنت مزدوری شروع کر دی۔ دن بھر وہ گھر کے باہر رہتا اور شام کو جو کچھ کما لاتا شمس افروز کے ہاتھ

پر رکھ دیتا۔ وہی چار نفوس کے ازوقہ کا ذریعہ ہوتا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے بڑی لڑکی نے جوانی کے دائرے میں قدم رکھ دیا۔ چھوٹی چھ سات برس کی ہو گئی اور شمس افروز کے چہرے پر بڑھاپے کی علامات آشکارا ہونے لگیں۔ مگر مقدر نے ان حالات میں بھی چین نہ لینے دیا۔ شمس افروز ایک گھریلو حادثے میں خنجر کا شکار ہو گئی اور دو لڑکیوں کا بوجھ قابوس کے ضعیف اور ناتواں کاندھے پر ڈال گئی۔

زیبا کی آواز میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور تنفس اس زور سے ہو رہا تھا کہ بول نہ سکتی پھر بھی اس نے فردوسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جانتے ہیں آپ ان لڑکیوں کو؟"

فردوسی نے کچھ کہنے کے باوجود انکار میں سر ہلا دیا۔ اور زیبا نے کہہ دیا۔

ان کے نام زیبا رخ اور ماہ رخ تھے ——— !"

"ارے تم نوشابہ کے خاندان سے ہو ——— !" فرط جذبات میں وہ چیخ اٹھا۔ مگر زیبا کو بات کرنے کا یارا نہ تھا۔ نقاہت میں وہ تکیہ پر سر رکھ چکی تھی اور تکیہ اشکوں سے بھیگ چکا تھا۔ فردوسی اس کی داستان سے کچھ کم متاثر نہ تھا۔ پھر بھی اس نے کئی سوال کر ڈالے۔

"شمس افروز کو کس نے قتل کیا؟ ——— تم نے رقص کرنے کا پیشہ کیوں اختیار کیا؟"

زیبا نے ان کے سوالات کو سنا ہو یا نہ سنا ہو مگر فردوسی کو کسی بات کا جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد زیبا کے چند الفاظ کانوں میں پڑے۔ جن کا مطلب یہ تھا کہ باقی سرگذشت وہ پھر کسی دن سنا دے گی۔ فردوسی کے

احساسات میں کیسی طوفان آ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھ گیا اور اس کا عالم بھی زیبا سے جدا نہ رہا۔۔ ________"

دیر کے بعد ماہ رخ کے قدموں کی آہٹ نے دونوں کو چونکا دیا۔ فردوسی کچھ سنبھل چکا تھا۔ اس نے زیبا سے اجازت لی اور جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

باب ۱۳

حسین قاتلہ

فردوسی کو زیبا کی بابت سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ نوشابہ سے اس کے شابہ ہونے کے اسباب سمجھ میں آ گئے تھے اور اس انکشاف سے وہ مقابلتہً زیادہ قریب آ گئی تھی اس کی دکھ بھری داستان نے بھی ایک اثر کیا تھا اور ایک مظلوم کی حیثیت سے بھی اس نے کہن سال شاعر کی ہمدردیاں حاصل کی تھیں۔ اس کے مکان سے واپسی پر دیر تک فردوسی کے دماغ میں وہی باتیں گشت کرتی رہیں۔ اور بڑی مشکل سے وہ شاہنامے پر توجہ کرنے کے قابل ہو سکا۔

رات میں سویا تو ویسے ہی مناظر خواب میں دکھائی دیئے اور نوشابہ اور زیبا دوش بدوش کھڑی نظر آئیں۔ زیبا نے نوشابہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور نوشابہ نے اس کو آغوش میں لیکر فردوسی سے کہا ——— "یہ میری بھانجی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔" فردوسی مدتوں کے بعد اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا کہ اتنے دنوں سے وہ کہاں غائب تھی۔ نوشابہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور زیبا کو فردوسی کی طرف ڈھکیل کر بھاگنے لگی فردوسی اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا مگر چند ہی قدم پر ٹھوکر کھا کر زمین پر آ رہا۔ دھچکا لگنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دل دھڑک رہا تھا تنفس زور زور سے ہو رہا تھا۔ آنکھیں مل کر اس نے دیکھا۔ زیبا یا نوشابہ کا پتہ نہ تھا۔ وہ اپنی خوابگاہ

میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ لاحول پڑھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر نکل کر آسمان کی سمت دیکھا صبح صادق کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ منہ ہاتھ دھو کر وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔

خواب کا منظر حافظہ میں ابھر رہا تھا۔ نوشابہ کی یاد شدومد سے آ رہی تھی۔ فردوسی خواب کو خیال کا تابع قرار دیتا۔ لیکن محبوبہ نے زیبا پر توجہ دلائی تھی۔ اس لئے وہ بھی احاطۂ تصور میں آ رہی تھی اور احساسات جذباتی شکل اختیار کرنے والے تھے مگر فردوسی کے کردار نے ان کو ابھرنے نہ دیا۔ اور شاہنامہ نے ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

سورج نکلنے کے بعد ایک غلام کسی ضرورت سے باہر نکلا واپس آ کر اس نے اطلاع دی کہ زیبا اور قابوس شب میں کسی قتل میں ماخوذ ہو گئے۔ فردوسی اس خبر پر گھبرا گیا۔ اس نے تکرار کر کے غلام سے پوچھا اور غلام نے پھر اپنے الفاظ کو دہرا دیا اس سے زائد اس کو علم نہ تھا۔ لہٰذا وہ مزید کچھ بتا نہ سکا۔ فردوسی اسی وقت کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ زیبا کے مکان پر پہونچا۔ ماہ رخ اپنے کمرے میں سرنگوں بیٹھی تھی ایک پرچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں غلام اور کنیز صحن میں دم بخود تھے۔ فردوسی سیدھا ماہ رخ کے پاس چلا گیا۔ وہ فردوسی کو دیکھ کر سسکنے لگی۔ اور اس کی پرسش پر ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ فردوسی نے جب بچھا کر حال کہنے کی تاکید کی تو اس نے ایک پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور فردوسی اس کو پڑھنے لگا۔

زیبا نے چھوٹی بہن کو لکھا تھا کہ اگر وہ کسی سبب سے گرفتار ہو جائے تو اس کا

کچھ بھی انجام ہو۔ ماہ رخ پیروی کے لئے قدم گھر کے باہر نہ نکالے۔ البتہ اگر اپنے کو وہاں محفوظ نہ سمجھے تو شاعر اعظم فردوسی کی پناہ میں چلی جائے اور اسی کے کہنے پر عمل پیرا ہو اور گھر سے روانہ ہوتے وقت اس کی عزیز ترین کتابوں کو بھی ہمراہ لیتی جائے۔

یہ پرچہ صبح کو ماہ رخ نے کمرے کے فرش پر پڑا پایا تھا اور اسی کو پڑھتی ہوئی زیبا کی خواب گاہ میں گئی تھی وہ خالی تھا۔ صحن میں آ کر اس نے کنیز اور غلام سے دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ سو کر اٹھے تو اس کو معہ قابوس کے موجود نہ پایا۔ ماہ رخ نے فردوسی کے استفسار پر یہی بتایا۔ فردوسی نے باتوں میں زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ زیبا کے مکان کو غلام اور کنیز پر چھوڑ دیا اور ماہ رخ اور زیبا کے کمرے سے اس کی کتابوں کو لے کر اپنے مسکن پر آ گیا۔ وہاں مالک اس کا منتظر تھا اس کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ فردوسی نے ماہ رخ کو اپنے خاص کمرے میں بٹھا کر غلاموں کو ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں ماہ رخ کے ذمہ دار رہیں اور خود مالک کے ہمراہ مکان کے باہر نکل آیا۔

راستہ میں مالک نے اس کو بتایا کہ زیبا نے ایک مسلمان افسر فوج عبداللہ کو قتل کر دیا ہے۔ قابوس اس کے ساتھ تھا۔ عبداللہ کی چیخ پر گھر والے اور محلے کے لوگ بیدار ہو گئے۔ اور زیبا مکان سے نکلتے ہوئے پکڑ لی گئی۔ مگر کہا یہ جاتا ہے کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ اتنا موقع تھا کہ وہ چاہتی تو نکل جاتی۔ بوڑھا قابوس بھی جائے واردات پر موجود تھا۔ اس لئے وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔

فردوسی ایک سناٹے میں چلا جا رہا تھا۔ دارالامارہ کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا اور مالک سے مستفسر ہوا کہ سلطان سے کس وقت ملاقات ہو سکے گی؟ مالک نے

کم از کم دو گھنٹے بعد کا وقت بتایا۔ فردوسی نے مالک کو اپنے لئے ملاقات کی سبیل پیدا کرنے کو کہا اور اس کو وہیں چھوڑ کر قید خانے کی طرف بڑھ گیا۔

غزنی کا بچہ بچہ فردوسی کو جانتا تھا اور اس کی منزلت سے واقف تھا۔ افسر قید خانہ نے اس کو دیکھ کر آنکھیں فرش راہ کر دیں اور اعزاز کے ساتھ بٹھایا۔ فردوسی نے زیبا سے ملاقات کی خواہش کی۔ افسر کو اس میں تامل ہوا۔ زیبا ایک آتش پرست لڑکی تھی اور ایک مسلمان رسالدار کے قتل کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسلامی دور حکومت میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی مگر فردوسی کے الفاظ کو رد کرنا بھی افسر قید خانہ کے لئے جسارت کی بات تھی۔ چند منٹ خاموش رہ کر اس نے وزیر اعظم سے اجازت مل جانے کی شرط پر ملوا دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن فردوسی کے لئے اتنا انتظار فضول تھا دو گھنٹے بعد زیبا سلطان کے سامنے پیش ہونے والی تھی۔ افسر قید خانہ فضل سے دریافت کرنے کے لئے جاتا اور جب تک واپس آتا۔ اس وقت تک پیشی کی ساعت آجاتی۔ اس لئے وہ افسر کو بھیجنے کے بجائے خود فضل کے مکان کی طرف چل پڑا مگر فضل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ سلطان کے سلام کو جا چکا تھا۔

فردوسی جب دارالامارہ میں آکر پہونچا تو دربار گرم ہو چکا تھا۔ عبداللہ کے قتل کا واقعہ سلطان کے گوش گذار کیا جا چکا تھا۔ سلطان زردشتی رقاصہ کی جسارت پر آگ بگولہ ہو رہا تھا اور زیبا اور قابوس کو قید خانے سے لا کر پیش کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ فردوسی نے ایک غلام کے ذریعہ مالک کو اپنے پہنچ جانے کی اطلاع کرائی اور اس نے موقع پا کر محمود سے عرض کر دیا کہ فردوسی قدمبوس ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ فردوسی آج تک بغیر طلبی کے حاضر نہ ہوا تھا۔ محمود کو اس کے آنے کی

غرض نہ سمجھنے میں دقت نہ ہوئی۔ اور یہ سوچ کر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے کہ شاید وہ ایک مسلمان مقتولوں کے مقابلہ میں آتش پرست قاتل کی سفارش کرنے آیا ہو طوسی شاعر کی بے حمیتی پر محمود متعجب ہو گیا۔ تاہم قیاس پر اس نے قطعی فیصلہ نہ کیا۔ اور فردوسی کو باریاب ہونے کی اجازت دے دی۔

محمود کا دربار تمام عمائدین سلطنت سے بھرا تھا۔ وہ لوگ جو پابندی سے حاضری نہ دیتے وہ بھی اس مقدمہ کی روداد سننے کے لئے آ گئے تھے۔ سلطان نے قاضی القضاۃ کو بھی زحمت دی تھی وہ بھی ایک طرف زردکش تھا۔ فردوسی آداب شاہی بجا لا کر تخت شاہی کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک غلام نے فضل اسفرائنی سے کچھ کہا۔ فضل نے سلطان کو ملزمین کے حاضر ہو جانے سے باخبر کر دیا اور سلطان نے بلا توقف پیش کرنے کی اجازت دے دی۔

زیبا و قابوس قید خانے سے سپاہیوں کی حراست میں آئے۔ دربار کے اندر غلاموں کے گھیرے میں لائے گئے زیبا کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور وہ سر جھکائے قدم قدم بڑھ رہی تھی۔ دربار اور اہالیان دربار اس کے لئے نئے نہ تھے۔ بارہا وہ ان کو جنبش ابرو پر نچا چکی تھی مگر خود اس کی حالت میں فرق آ گیا تھا تو ہر شے بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ تخت سے تھوڑے فاصلہ پر غلاموں نے اسکو روک دیا۔ اور محمود اس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

لمحات کے وقفے سے سلطان کی آواز دربار میں گونجی وہ زیبا سے پوچھ رہا تھا۔

"تم نے عبداللہ کو کیوں قتل کیا۔۔۔۔ ؟"

"عبداللہ کو تو میں جانتی بھی نہیں۔ ہاں "کاموس ساسانی" سے میرے خنجر نے ایک دوشیزہ کی عصمت کی قیمت اور ایک مظلوم کی جان کا معاوضہ وصول کیا ہے!"

زیبا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا اور اس کے الفاظ سے دربار میں سناٹا چھا گیا محمود اس کی بیباکی پر اور مشتعل ہو گیا اور گرج کر پوچھا۔

"دریدہ دہن لڑکی تو ایک حقیقت کو جھٹلا رہی ہے اور اپنی چرب زبانی سے سارے غزنی کی آنکھوں میں خاک جھونک دینا چاہتی ہے!"

"حقیقت کبھی جھٹلائی نہیں جا سکتی یہ اور بات کہ انسان فریب کو حقیقت سمجھ رہا ہو اور انجام کار اس کی ناسمجھی بے نقاب ہو جائے۔" وقت کی حسین ترین رقاصہ نے ایشیا کے سب سے بڑے بادشاہ کے غضب سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ حاضرین دربار کی نگاہیں اس کے حسن معصوم کا جائزہ لے رہی تھیں اور حور شمائل زیبا کے لہجہ میں سقراط کی روح جھانکتی نظر آ رہی تھی۔ محمود جس سے متاثر ہوا مگر ایک مطلق العنان فرمانروا کے روبرو گفتگو کا یہ انداز گستاخی کے مرادف ہوتا ہے۔ محمود اس کا آخری جملہ پورا ہونے سے قبل چیخ اٹھا۔

"تجھ کو اپنی بدتمیزی کی سزا ملے گی۔۔۔۔۔"

زیبا مخاطبت کے اس طریقہ کو پسند نہ کر سکی۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور کسی ملکہ کی شان سے اس نے بھرے دربار پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

"جب مجھ کو عرض حال کا موقع دینا بھی منظور نہ تھا تو بلایا کیوں گیا؟ یکطرفہ فیصلہ کر لیا جاتا۔"

یہ کہکر وہ واپس ہونے کے لئے مڑی. مگر غلام ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے بغیر سلطان کی اجازت کے اس کو پلٹنے نہ دیا گیا۔ اور بمجبوری وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی. فردوسی ارکان کی ابتداء ہونے کے بعد ہی سے بار بار درمیان میں بولنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن ایاز ہر مرتبہ اشارے سے اس کو روک دیتا۔ آخری بار جب محمود نے برہم ہو کر اس کو ڈانٹا تو فردوسی کے لب ہل کر رہ گئے۔ زیبا خود جواب باصواب دے رہی تھی۔

بزرگ احمد اور ابو سہل بہت مسرور تھے. مغرور رقاصہ اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی مگر اس کے مکالمے سے وہ دنگ رہ گئے۔ ان کے گمان میں نہ گذر سکتا کہ ایک ناچنے والی لڑکی اس فصاحت اور جرئت کے ساتھ سلطان محمود سے مخاطبہ کر سکتی ہے۔

زیبا کے آخری جملوں سے رنگ محفل بدل رہا تھا۔ اس کا یہ کہنا حق بجانب تھا کہ اگر اس کو صفائی پیش کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا تو آزادی کے ساتھ اظہار حال کا موقع ملنا چاہیئے تھا۔ محمود نے ایک انصاف پسند طبیعت پائی تھی زیبا کے تلخ الفاظ نے کانوں میں گرم سیسہ کا کام کیا اور شاہانہ مزاج میں تلملاہٹ پیدا ہو گئی لیکن عالی خیالی نفسانیت سے دب نہ سکی. سلطان غصہ پر قابو پانے کے لئے چند منٹ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بشرہ سے شگفتگی کی علامات ظاہر کر کے قاتلہ سے کہنے لگا۔

تم اپنی برئت کے لئے جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کہو۔ میں تم کو اجازت دیتا ہوں۔"

"مجھ پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کا جواب میں دے چکی کہ میں نے کا موس ساقی کو قتل کیا ہے۔ اس امر کی تحقیق کا ذمہ دار خود عدل سلطانی ہو گا کہ مقتول وہی تھا جس کو میں بتاتی ہوں یا میری نگاہ اور ہاتھوں نے غلطی کی ہے ۔"

"تم عجیب بات کہتی ہو زیبا۔ ایک مسلمان کو آتش پرست بتاتی ہو۔ مسلمان

بھی، عبداللہ کا سا سرفروش تھا جس نے کتنی ہی جنگوں میں میرے پہلو بہ پہلو دادِ شجاعت دی تھی۔" محمود نے ذہنی پریشانی سے جزبز ہو کر کہا اور زریا نے سمجھانے کی کوشش کی "لیکن سلطان اسکو باور کریں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ غلط نہیں ہے اور عبداللہ نام کے کسی انسان یا مسلم قوم کی کسی فرد سے میری کوئی عداوت نہیں۔"

"پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہوگا کہ عبداللہ کا نام دراصل کاموس ساسانی تھا؟" محمود نے عدل گسترانہ انداز سے استفسار کیا۔ اور زریا ملائمت سے بولی۔

"عبداللہ کی لاش غالباً ابھی دفن نہ ہوئی ہوگی۔ اس کو آتش پرستوں کا لباس پہنا کر رکھ دیا جائے اور بلخ کے رہنے والے جو غزنی میں موجود ہوں وہ بلائے جائیں اگر وہ اس کو دیکھتے ہی "کاموس ساسانی" کے نام سے پکار اٹھیں تو میرا بیان صحیح ہے ورنہ میں ایک جرم میں قابل گردن زدنی قرار دی جاؤں۔"

محمود سر جھکا کر سوچنے لگا اور زریا نے ایک لحظہ ساکت رہ کر سلسلہ بیان جاری کر دیا۔

"بلخ کے ان اسیر دو لوگوں کو تلاش کرنے میں تضیعِ وقت کا خیال ہو تو شاہزادہ اسمٰعیل[1] کے جو ساتھی قید میں ہیں۔ ان کو طلب کر کے سلطان اپنے طور پر دریافت کریں۔ وہ بتا دیں گے کہ عبداللہ جب تک بلخ کی فوج میں تھا۔ اس کا نام کاموس ساسانی تھا یا نہیں اور وہ عقیدے کے لحاظ سے زردشت کا پیرو تھا۔ یا مسلمان ہے؟"

---

[1] اسمٰعیل نے جب سلطان محمود سے شکست کھائی تو محمود نے اسکو سعد اس کے حوالیوں کے نظر بند کر دیا جہاں سے تا مدت العمر رہائی نہ ملی۔

سلطان نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ کیونکہ عبداللہ کا آغاز کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو مگر آخر تو وہ مسلمان تھا اس کی لاش کی بے حرمتی مناسب نہ تھی۔ سلطان نے فضل اسفرائنی کو حکم دیا کہ دو آدمی اسمٰعیل کے ساتھیوں میں سے حاضر کیے جائیں اور زیبا و تمام اہلِ دربار اس وقت تک جنبش نہ کریں جب تک وہ لوگ آکر اپنے بیانات نہ دے دیں اس طرح سلطان نے ان آدمیوں کو پہلے سے سکھا پڑھا دینے کا امکان ختم کر دیا۔ زیبا کو بارگاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی اور سلطان دوسری باتوں میں لگ گیا۔

ایک گھنٹے کے وقفے سے فضل واپس آیا۔ زیبا اپنے مقام پر لا کر کھڑی کر دی گئی اور محمود نے ایک ایک شخص کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ پہلا آدمی حاضر ہوا تو محمود نے دریافت کیا کہ آیا وہ اس کی تصدیق کر سکتا ہے کہ عبداللہ بلخ میں کاموس ساسانی کے نام سے ملازم تھا؟ آنے والا شخص عبداللہ کی شکل سے واقف نہ تھا اس نے یہی عذر پیش کیا کہ جب تک وہ اسکو نہ دیکھے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ محمود کو اس پر زیبا کی پہلی تجویز کی اہمیت کا احساس ہوا اور وہ یکایک تخت سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا دربار میں ایک گڑبڑی پڑ گئی۔ محمود درباریوں کو اپنی واپسی کا انتظار کرنے کی ہدایت کر کے باہر نکل آیا۔ فضل اسکے ساتھ تھا۔ گھوم کر اس کو دیکھا اور اسمٰعیل کے دونوں ملازمین کو لے کر امکانی تعجیل سے قبرستان پہنچ جانے کا حکم دیا۔

سلطان ٹھیک اس وقت گورستان میں پہونچا جب عبداللہ کی لاش قبر میں اتاری جا رہی تھی۔ اس نے گاڑی سے اترتے ہی ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اسی اثناء میں فضل دونوں آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ سلطان نے میت کا

منہ کھول دینے کی ہدایت کی جس پر عمل کیا گیا۔ اور بخارا کے آدمیوں نے اس کو شناخت کر دیا۔ وہ کاموس ساسانی ہی تھا۔ سلطان نے فضل کو ان آدمیوں کے ہمراہ واپس کر دیا اور خود عبداللہ کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ٹھہر گیا۔

عبداللہ کا کردار اس تصدیق سے مشکوک ہو گیا مگر اس کی لاش کو یہ عزت حاصل ہو گئی کہ سلطان نے نماز جنازہ پڑھائی اور دفن میں شریک ہوا۔

دربار میں واپس ہو کر سلطان نے پھر ان آدمیوں کو طلب کیا تاکہ کاموس ساسانی کے متعلق مفصل بیانات سن سکے۔ دو آدمی آگے پیچھے داخل ہوئے زیبا ایک طرف کھڑی ہوئی تھی اس کی نگاہ جیسے ہی پہلے آدمی سے گزر کر دوسرے پر پڑی۔ ایک چیخ منہ سے نکل گئی۔ اور "اردوان" کہہ کر وہ بے حال ہونے لگی غلاموں نے اس کو سنبھال لیا اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

آنے والا شخص تصویر کی طرح ساکت تھا اور ٹکٹکی باندھے ہوئے زیبا کو دیکھ رہا تھا سلطان اور تمام دربار کی زیبا کی چیخ پر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ہر شخص نے اپنے مقام پر سمجھ لیا تھا کہ زیبا سے اس جوان کا جذباتی واسطہ ہے جس کو "اردوان" کہہ کر اس نے پکارا تھا۔ سلطان نے ان باتوں میں وقت ضائع نہ کیا اور غلاموں کو اشارہ کیا وہ دونوں کو لے کر تخت کے قریب آ گئے۔

سلطان نے ان سے کاموس کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ انھوں نے جن کے جوابات دیئے اور یہ بات حاضرین دربار کے علم میں آ گئی کہ کاموس بلخ کا مجوسی اور اسمٰعیل کی فوج کا ایک افسر تھا جو یکایک بلخ سے غائب ہو گیا۔ محمود

اور اسمٰعیل کی جنگ میں اس نے ایک مسلمان کے روپ میں پرانے آقا کے خلاف مخبری کی۔ عبداللہ کے نام سے سلطان محمود کا تقرب حاصل کیا اور غزنی میں اسی نام سے معروف ہو گیا۔ جہاں ایک مسلمان عورت سے عقد کر کے عیالدار بن گیا۔

سلطان کی بدظنی زیبا سے کچھ کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی زیبا کا قاتلہ ہونا ایک جرم تھا۔ جس کا مواخذہ اس سے باقی تھا مگر حالات کی پیچیدگی نے سلطان کے دماغ کو تھکا دیا تھا۔ اس لئے اس نے مقدمہ کی سماعت اگلے دن پر ملتوی کر دی دونوں آدمیوں کو ان کے محبس کی طرف واپس کر دیا گیا۔ دربار سے نکلتے وقت اردوان اور زیبا کی نگاہوں نے ٹکر لی۔ آنسو آنکھوں میں چھلکنے لگے لب متحرک ہو گئے زیبا کھڑی دیکھتی رہی اور اردوان غلاموں کی حراست میں چلا گیا۔

اس کے عقب میں زیبا کے لئے بھی جانے کا حکم ہوا اور وہ ایک دل شکستہ قیدی کی طرح آہیں بھرتی ہوئی باہر آ گئی۔

فردوسی یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں بار بار ایک ولولہ پیدا ہوا مگر مصلحت نے لبوں پر قفل ڈال دیا۔ انتہائی تحمل کے ساتھ اس نے سب کچھ انگیز کیا اور دربار برخواست ہونے پر مالک کے ساتھ اٹھ آیا

باب (۱۴)

رقاصہ کی سرگذشت

ماہ رخ نے دن بھر روتے روتے آنکھیں سجا لی تھیں۔ خود فردوسی کے منہ تک منہ صبح سے ایک کھیل اڑ کر نہ گئی تھی۔ ناشتہ کرنے جا ہی رہا تھا کہ یہ خبر سنائی دی اور وہ اسی وقت نکل کھڑا ہوا۔ ضعیفی کے قوی اگر وری محسوس کر رہے تھے مگر فردوسی نے واپس آکر ماہ رخ کا حال دیکھا تو اپنی تکلیف بھول گیا۔ دل شکستہ دوشیزہ کے قریب بیٹھ کر تسلی دی غلام سے کھانا رکھا نے کو کہا۔ ماہ رخ مسلسل اشکباری کر رہی تھی۔ فردوسی نے بزرگانہ تنبیہہ سے کام لے کر ہاتھ پکڑ کر اٹھایا لے جا کر منہ ہاتھ دھلوایا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

ماہ رخ کچھ کھانے سے قبل بہن اور بوڑھے غلام کا انجام معلوم کرنا چاہتی فردوسی نے اس کو تسکین دی کہ ایک روز کی تکلیف او ہے اگلے دن انشاءاللہ دونوں رہا ہو جائیں گے۔ ماہ رخ کا اس اطلاع سے اطمینان نہ ہو سکا۔ تاہم اس نے فردوسی کے الفاظ کا احترام کیا اور کچھ نہ کچھ کھا لیا۔

فردوسی کو بھی فرط الم میں اشتہا نہ تھی وہ صرف ماہ رخ کی خاطر بیٹھ گیا۔ اور دکھانے کے لئے رسماً شریک ہو گیا۔ مگر چند نوالوں سے زیادہ حلق سے نہ اتار سکا

اس کی نگاہ میں تو دربار کا منظر پھر رہا تھا۔ اور زیبا اس کو رسن بستہ دکھائی دے رہی تھی جس کے تصور سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

زیبا نے جس وقت سے اپنی زبان سے کاموس ساسانی کے قتل کا اقبال کر لیا تھا، فردوسی کو اسی وقت سے نادان دوشیزہ کی حماقت پر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے ارتکاب قتل کو تسلیم کیوں کیا؟ مقتول خواہ عبداللہ ہوتا یا کاموس ساسانی قرار پایا۔ جہاں تک جرم کا تعلق ہے بات ایک ہی تھی۔ زیبا کے سر ایک خون عاید ہوتا جس کے لئے وہ قابل مواخذہ تھی۔

زیبا نے فردوسی کو کاموس یا اردوان کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ مگر فردوسی نے دربار سے گھر تک سلسلہ کی تمام کڑیاں جوڑ کر ایک مکمل داستان تیار کر لی تھی جس کی روشنی میں وہ واقعہ قتل کو دیکھتا تو زیبا کا فعل برمحل اور حق بجانب نظر آتا ــــــــ پچھلے دن اس کی خاندانی سرگزشت میں دو سوال حل طلب رہ گئے تھے۔ ایک یہ کہ اس کی ماں کس کے خنجر کا شکار ہو گئی۔ اور کیوں؟ اس کا جواب زیبا نے دربار میں دے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کاموس ساسانی سے اس کے خنجر نے ایک مظلومہ کے خون اور دوشیزہ کی عصمت کی قیمت وصول کر لی۔ مظلومہ اس کی ماں ہوگی اور دوشیزہ خود زیبا۔ جس کو بچانے کے لئے ماں سینہ سپر ہو گئی ہو گی۔ اور کاموس نے راستہ سے ہٹانے کے لئے وار کر دیا ہو گا۔ زیبا کے کھوئے کھوئے سے رہنے کا سبب فردوسی کو معلوم ہو گیا تھا اور غریب دوشیزہ کی بے عزتی پر اس کا خون کھولنے لگا تھا مگر کاموس اپنے ناپاک وجود سے اس دنیا کو پاک کر چکا تھا اور غیور دوشیزہ نے اپنے انتقام کے لئے فردوسی یا کسی اور کا منت کش ہونا گوارا نہ کیا تھا۔ اردوان سے زیبا کا تعلق تاریکی میں تھا لیکن فردوسی نے عقل پر ذرا سا زور دے کر اس کو بھی سمجھ لیا اور اردوان کو دیکھ کر بھرے دربار میں زیبا کے اضطراب کو

محبت کی دلیل قرار دے لیا۔ شمس افروز کے قتل کے بعد کاموس کا یکایک غائب ہو جانا اور اردوان و زیبا کا ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود نہ ملنا مختلف باتوں کی طرف رہنمائی کر رہا تھا حتی کہ اسمٰعیل اور محمود میں جنگ ہو گئی۔ اور اردوان اسمٰعیل کے ساتھ گرفتار ہو کر غزنی آ گیا۔ جس کا علم زیبا کو نہ تھا۔ قیاسات فردوسی کو الجھن میں پھنسا رہے تھے پھر بھی اس نے ان واقعات کو ربط دے لیا۔ اور زیبا کی نامرادی پر اس کی آنکھیں بار بار نم ہو گئیں مگر جب وہ زیبا کے لئے اردواں کی محبت کا تصور کرتا تو اس کو ایک تکلیف سی پہنچتی۔

نہ سمجھتا ہوں کہ دل پر مرے پتھر مارا
چوم لیتا ہے جو سنگ درجاناں کوئی

حالانکہ فردوسی کے لئے ایسے احساسات کا محل نہ تھا۔ زیبا کو چھونے کا خیال بھی اس کے لئے کسی جرم سے کم نہ ہوتا۔ اس نے تو اس کو دیکھنے کے لئے تجویز کیا تھا اور زیبا کی زندگی میں بہار آنے کا پیغام فردوسی کے لئے موجب مسرت تھا لیکن محبت بھی عجیب شے ہوتی ہے جو کسی نوعیت میں بھی رشک سے خالی نہیں رہتی تاہم فردوسی کو خیال کی یہ لغزش بھی گوارا نہ تھی۔ وہ اپنے کو ملامت کرتا اور نفس کو دبانے کے لئے نوشابہ کو یاد کرنے لگتا۔ جو زیبا کو اس کے صحیح مقام پر پہنچا دیتی

فردوسی نے ذہن میں زیبا کی پوری روداد ترتیب دے لی تھی۔ لیکن دوسرا سوال ابھی جواب کا محتاج تھا کہ زیبا رقاصہ کیونکر بنی؟ اس کا حل شب میں نکل آیا جب وہ زیبا کی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ یہ دراصل دستگیر کی کائنات تھی۔ جو شمس افروز کے ذریعہ زیبا تک پہنچی تھی۔ اس میں بیشتر کتابیں السنۂ سلف کی تھیں۔ جن کے جاننے

والے ناپید ہو چکے تھے مگر دستگیر شایان زبانوں کو جانتا ہو جبھی تو ان سے استفادہ کرتا چند کتابیں پہلوی کی زبان میں تھیں جن کے رسم الخط سے فردوسی نا آشنا تھا ایسی کتابیں بو کو وہ دیکھنے لگا۔ ایک کتاب فارس کی نامکمل تاریخ پر مشتمل تھی جس کے واقعات فردوسی شاہنامہ شروع کرنے سے قبل ہرات آکر دستگیر سے معلوم کرے گیا تھا۔ ایک کتاب رقص اور موسیقی کے متعلق تھی۔ جس سے فردوسی کو زیبا کے بارے میں اپنے سوال کا جواب مل گیا اور وہ زیبا کی بے بسی کا تصور کرنے لگا۔

رات کرب اور بے چینی میں کٹ گئی۔ صبح کو ناشتہ کے وقت مالک آگیا۔ ماہ رخ بہت پریشان تھی مالک نے بھی اس کی تسلی و تشفی کی اور فردوسی دو تین گھنٹے دن چڑھے مالک کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت پھر اس نے ماہ رخ کو سمجھایا اور سہ پہر کو زیبا کو ساتھ لے کر واپس آنے کی توقع ظاہر کی۔ ماہ رخ اس امید پر کچھ مطمئن ہو گئی اور فردوسی کے کمرے میں بیٹھ کر گھڑیاں گننے لگی۔

محمود نے دربار میں بیٹھتے ہی زیبا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ فردوسی قبل سے پہنچ گیا تھا۔ محمود نے بغور اس کو دیکھا اور بوڑھے شاعر کی حسین رقاصہ سے دلچسپی پر مسکرا پڑا۔ اس کو اس التفات کا سبب معلوم تھا اس نے فردوسی کے لئے کوئی بری رائے قائم نہ کی مگر دوسرے اہل دربار کے خیالات سلطان سے مختلف تھے۔ خصوصیت کے ساتھ بزرگ احمد اور ابو سہل تو دل ہی دل میں ہنس رہے تھے ان کو زیبا کے بری ہونے کی امید نہ تھی اور اس کے قتل پر فردوسی کی تڑپ کا اندازہ کر کے وہ محظوظ ہو رہے تھے۔

زیبا کے دربار میں قدم رکھتے ہی تمام اہالیان دربار کی نگاہیں اٹھ گئیں۔ خوبصورت

رقاصہ ایک دن اور دو راتوں کی جاگی تھی۔ حالات میں مشکل سے لمحات کے لئے سو سکی ہوگی نیند کے خمار سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں جس نے انکو اور نشہ آور بنا دیا تھا۔ بازوؤں میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں مگر وہ ایک شان استغنا سے قدم اٹھا رہی تھی اور کسی قیدی کے بجائے اقلیم حسن کی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ محمود غزنوی اس کو دیکھ رہا تھا وہ بے نیازی کے تیوروں سے دائیں بائیں نگاہ ڈالتی ہوئی سامنے پہونچی اور حسب دستور آداب شاہی میں خم ہو گئی۔ غلاموں نے ایک مقام پر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ اور جوابدہی کے لئے تیار ہونے کے انداز سے وہ کھڑی ہو گئی۔

قبل اس کے کہ سلطان اس سے کچھ پرسش کرے۔ فردوسی اپنی جگہ پر غیر متوقع طور پر کھڑا ہو گیا اور کچھ کہنے کے لئے اجازت خواہ ہوگیا۔ سلطان نے اجازت دے دی تو اس نے کہا۔

" ایک اہم مقدمہ کی سماعت کے وقت میری مداخلت بے ادبی میں داخل ہے مگر میں ایک تاریخی واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس میں سلطان کا کچھ وقت ضرور ضائع ہوگا لیکن امید ہے کہ مزاج عالی اس سے خوشنود ہو گا۔"

محمود نے کچھ سمجھ کر سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ فردوسی نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی آنکھیں سلطان پر جما دیں اور کہنا شروع کر دیا۔

ایران میں عربوں کے قبضہ کے بعد جو دور آیا اس نے عرب اور ایرانی نسل کو خلط ملط کر دیا اور اشاعت اسلام نے جب خون اور رنگ کے امتیاز کو ہیچ قرار دیا تو ایران کا خاندانی تفاخر ختم ہونے لگا۔ بادشاہ اور فقیر آپس میں رشتہ کرنے کو جائز سمجھنے لگے لیکن ان حالات میں بھی بعض خاندان ایسے تھے جو سینے تان کر اس سیلاب کے مقابلہ

ہو گئے اور پشتہا پشت تک اپنے خون کو داغدار ہونے سے بچائے گئے۔ ایسے ہی لوگوں میں سام بن نریمان کی اولاد سے ایک اہل علم زردشتی تھا جس کا نام تھا دشمگیر۔"

زیبا فردوسی کی تقریر شروع ہوتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ دشمگیر کے نام پر اس کا منہ کھل کر رہ گیا اور اس نے اپنے کو سنبھال لیا۔ فردوسی کہہ رہا تھا۔

"دشمگیر نے جہاں تک ہوسکا اس نے نسل و رنگ کی حفاظت کی اور جب کوئی قابو چلتے نہ دیکھا تو بیٹی داماد کو لے کر وطن سے نکل کھڑا ہوا تاکہ اپنی آنکھوں سے اسلاف کی عظمت کو خاک میں ملتے نہ دیکھے اور پردیس میں گمنام رہ کر زندگی کے دن پورے کردے کچھ دن وہ بلخ میں رہا۔ پھر ہرات کو منتقل ہو گیا۔ سارے ایران میں وہی ایک شخص تھا جس کو مشاہیر فارس کی داستانیں تواتر سے یاد تھیں۔ میں نے ہرات کے زمانۂ قیام میں طوس سے چل کر اس سے ملاقات کی تھی اور شاہنامے کے اکثر واقعات اسی کے بیان کئے ہوئے ہیں جن کی تاریخی اہمیت میں شک و شبہ نہیں ہوسکتا۔

دشمگیر نے مرتے وقت بلخ میں ایک نواسی چھوڑی تھی جس کا نام شمس افروز تھا اور جو یزداں داد نامی ایک سپاہی کو بیاہی تھی۔ یزداں داد ایک اتفاقی حادثے میں موت کا شکار ہو گیا اور شمس افروز پر دو لڑکیوں کی پرورش کا بوجھ آپڑا جو اس کے شوہر کی نشانی تھیں۔ کمزور عورت کے ناتواں بازو اس بار کے متحمل نہ ہوسکتے لیکن دشمگیر کا ایک غلام جو آقا کے انتقال کے بعد اس کی نواسی کے پاس آگیا تھا۔ اس آڑے وقت پر کام آیا اور حق رفاقت ادا کرتا رہا۔ غلام جو دن بھر محنت مزدوری کرکے پیدا کرتا شام کو اسی سے مالک کے بچوں کی شکم پری ہوتی۔

وقت اچھا تھا یا برا مگر کسی نہ کسی طرح کٹ رہا تھا۔ غم نصیب ماں اور بدقسمت

لڑکیاں عمر کی منزلیں طے کرتی جارہی تھیں ـــــــــ یزداں داد ایک خلیق اور ملنسار جوان تھا اس کی موت پر بہت سے دوست احباب شمس افروز کے پاس اظہار ہمدردی کے لئے آتے رہے اور جوان سال بیوہ ایک اک کا شکریہ ادا کرتی رہی آنے والوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا مگر ایک فوجی افسر کی مہربانیاں جاری رہیں وہ یزداں داد اور شمس افروز کا ہم مذہب بھی تھا اس لئے غریب بیوہ اس کی ہمدردی کو سچی ہمدردی سمجھتی رہی لیکن بدنفس افسر کو شمس افروز کے بجائے اس کے جاتے ہوئے شباب کا خیال تھا اور وہ ناجائز تصرف کے پھیر میں نت نئے تحائف بھیجا کرتا۔ شمس افروز ان کو قبول کرنا نہ چاہتی مگر افسر اس طرح سمجھا دیتا کہ اس کو بن نہ پڑتا۔ اور بادل ناخواستہ رکھ لیتی

شمس افروز ایک نیک خو اور پاک باطن عورت تھی۔ کئی بار اس نے فوجی افسر کی نیت پر شک کیا۔ لیکن ٹوک نہ سکی کیونکہ کسی بات کا یقین کئے بغیر وہ کچھ کہہ نہ سکتی۔ فوجی افسر شمس افروز کے کردار سے مرعوب تھا اس لئے حرف تمنا زبان پر لانے کے لئے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اور کئی سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں یزداں داد کی بڑی نشانی کسی کلی کی تعریف میں آچکی تھی جس کی پنکھڑیاں شگفتگی کے لئے منہ کھول رہی ہوں۔ بوالہوس فوجی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ ماں کو دیکھ کر اس نے بیٹی کو دیکھا۔ نوخیز کلی کے سامنے پژمردہ پھول کی کشش ماند پڑ گئی۔ اور بیٹی نے ماں کی جگہ لے لی۔

شمس افروز کو دستگیر کے آخری الفاظ یاد تھے۔ اس نے اپنے غلام کے ذریعہ وصیت کی تھی کہ اس کی نواسی کو اگر خالص ایرانی نسل کا شوہر نہ مل سکے تو اس کو بیٹھ کر عمر کاٹنے کے لئے چھوڑ دیا جائے بلخ کی فوج میں کئی آتش پرست تھے۔ شمس افروز جنکو جانتی تھی۔ ایک نوجوان ابھی حال میں وطن سے آیا تھا اور جلد ہی والی بلخ کی نظر عنایت

سے ترقی کر گیا تھا وہ بھی کبھی کبھی خاندانی رابطہ کے تحت شمس افروز کے پاس آتا شمس افروز اس کی نگاہوں سے بیٹی کے لیے کسی جذبے کا اندازہ کرتی اور اس کے غیر معمولی التفات کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ شمس افروز کے نزدیک یہ رشتہ موزوں تھا۔ اور دستگیر کی وصیت کے خلاف نہ تھا۔ اس نے نوجوان کو بیٹی سے ہمکلام ہونے کا موقع دے دیا۔ اور یزداں داد کی پارۂ جگر کے اٹھتے ہوئے شباب نے زردشتی نوجوان کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

فوجی افسر کو یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے حصول مقصد میں تعجیل کا عزم کر لیا اور ایک سہ پہر کو مخصوص طور پر آکر شمس افروز کو پیغام دے دیا۔ مجبور بیوہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے پھر بھی اس نے تہذیب کو ہاتھ سے نہ دیا اور شائستگی سے کہہ دیا کہ اس کا رشتہ اس نوجوان سے پختہ ہو گیا ہے۔ فوجی افسر اس انکار پر برافروختہ ہو گیا مگر کسی منصوبہ کے تحت وہ خاموش ہو گیا اور بھولی شمس افروز یہ سمجھی کہ اس نے اس کی مجبوری کو تسلیم کر لیا!"

فردوسی پورے جوش سے بیان کر رہا تھا حاضرین ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے اور سلطان کی نگاہیں بوڑھے شاعر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ فردوسی نے ایک نظر ایاز کو دیکھا اس کا سر جھک گیا تھا۔ فردوسی نے حافظہ پر زور دے کر خیالات کو یکجا کیا اور کہنے لگا۔

"نوجوان کی آمد و رفت جاری رہی محبت دلوں میں گھر کرتی گئی۔ اور فوجی شکاری اپنی گھات میں لگا رہا۔ ایک رات جبکہ بوڑھا غلام بستر علالت پر پڑا ہوا تھا۔ شمس افروز غافل سو رہی تھی۔ فوجی افسر دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا اور جوانی کی نیند میں سوتی ہوئی یزداں داد کی مہ پارہ کو گرفت میں لے لیا ——— خبیث افسر کا خیال

تھا کہ کوئی دوشیزہ اپنی عصمت دری پر کسی کو گواہ نہیں بناتی لیکن شمس افروز کی بیٹی اس بے حیائی کو برداشت نہ کر سکی۔ پوری شدت سے چیخ اٹھی حالانکہ آواز فرطِ شرم میں بہت ہلکی نکلی مگر شمس افروز کی آنکھ کھل گئی بیٹی کے تباہ کرنے والے کو اس نے پکڑ لیا اور زور زور سے چلانے لگی۔ بزدل افسر ایک عورت سے اپنے کو چھڑا نہ سکا تو خنجر کو بروئے کار لے آیا اور اس کی آنی پیٹھ کو توڑ کر شمس افروز کے سینے میں در آئی۔ فوجی نکلا ہوا چلا گیا۔ ماں زمین پر گر کر خاک و خون میں لوٹ رہی تھی اور بیٹی اپنی دوشیزگی کو بربریت کی بھینٹ چڑھا کر ماں کو آخری ہچکیاں لیتے دیکھ رہی تھی۔

آہ اور وہ بھی کسی مظلوم کی

دل تو دل ہے عرش تھرانے لگے

درباریوں کی اکثریت آہیں بھرنے لگی اور بعض لوگوں کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں محمود کی زبان سے نفرت اور کراہت کے الفاظ نکل گئے۔ فردوسی نے دہرے کر سامعین کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اور سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

جانتے ہیں آپ کون تھا وہ بدکردار؟

سلطان نے آنکھوں آنکھوں میں انکاری جواب دیا۔ اور فردوسی نے کہہ دیا

شمس افروز کی بیٹی کا نام زیبا رخ غلام کا نام قابوس تھا۔ چاہنے والے نوجوان کو اردوان کہہ کر پکارا جاتا اور فوجی افسر کاموس ساسانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

اس انکشاف پر کاموس کے لئے اہلیان دربار کے لبوں سے بُرے الفاظ نکل گئے اور سلطان نے درد و تحیر کی امتزاجی کیفیت میں زیبا کا نام لیا۔ اشکوں کی لڑیاں

زیبا کے رخساروں پر بہہ رہی تھیں۔ محمود نے غلاموں کو اس کے بازو کھول دینے کی ہدایت کی اور وہ دوڑ کر فردوسی سے لپٹ گئی۔ آداب شاہی کا لحاظ کئے بغیر فرط جذبات میں پوچھنے لگی۔ "آپ کو یہ حالات کیونکر معلوم ہوئے شاعر اعظم ——؟"

"تمہیں نے تو بتایا تھا۔ عقل نے جس کی ترتیب دیدی۔" فردوسی نے اس کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا اور سلطان کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ زیبا کو اپنے قریب بلا رہا تھا۔ زیبا نزدیک گئی تو تخت کے ایک گوشہ پر بیٹھ جانے کو کہہ دیا اور فردوسی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں کہہ ڈالو باقی روداد بھی۔"

فردوسی جوش میں ٹھٹک چکا تھا۔ مگر اس نے تعمیل حکم میں بیان جاری کر دیا

"شور و غل کی آواز پر قابوس بستر سے اٹھ کر گرتا پڑتا پہونچا اور محلہ کے لوگ بھی آ گئے۔ شمس افروز کا جسد خاکی تڑپ کر سرد ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ کاموس کے تعاقب میں دوڑے لیکن وہ دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔ صبح کو "اردوان" کو خبر ہوئی وہ دوڑا ہوا آیا۔ زیبا کی نگاہ جھک گئی منگیتر سے کس طرح آنکھ ملاتی؟ اس کی دوشیزگی کا غرور چھین چکا تھا۔ اردوان نے دلاسا دیا اور اس حادثے کے باوجود اپنے وفادار رہنے کا یقین دلایا لیکن زیبا، دستگیر کی نواسی تھی۔ اس دستگیر کی نواسی جس نے خاندان کی آن اور نسل کی نجابت کو بچانے کے لئے جلاوطن ہونا گوارا کر لیا۔ زیبا کی رگوں میں سام بن نریمان کا خون تھا جس کا تحفظ تو درکنار وہ اپنے کنوارپن کو بچا نہ سکی تھی۔ گیارہ سال کی لڑکی کی فہم و فراست ہی کیا؟ مگر زیبا کی ذکاوت حس اس کی متقضی تھی کہ وہ پہلو میں لگے ہوئے خنجر کی مدد سے

کشمکش سے نجات حاصل کرے اور ماں کے برابر جالیٹے اسنے اس کا ارادہ بھی کیا پھر دستگیر کا کردار سامنے آگیا اور ایک سوال اس کے ذہن میں پیدا ہو گیا کہ اگر وہ اس طرح مر گئی تو کاموس سے اس کا انتقام کون لے گا؟ زیبا نے ایک شجاعانہ عزم کر لیا۔ دوسرے دن جب اردوان نے محبت میں ثابت قدم رہنے کی تلقین دہرائی کی تو اسنے انتہائی متانت سے کہہ دیا کہ اس کے لئے اس طرح کا کوئی سوال اسی وقت زیر غور آسکتا ہے جب کاموس کی لاش زیر دبر پڑی ہو۔

اردوان کاموس کو تلاش کرنے کے لئے پلٹا مگر وہ چند ہی قدم گیا ہوگا کہ زیبا نے پکار لیا وہ رک گیا تو کہنے لگی کہ ان کی ملاقات اس وقت سے پہلے نہ ہوگی جب تک سفاک کاموس کو خنجر کی انی چٹا نہ دی جائے اردوان اس شرط کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا لیکن زیبا نے آخری بات کہہ دی کہ وہ دم واپسیں تک انتقام پورا ہونے کا انتظار کرے گی۔ اور اس کے بعد کی ہر گھڑی میں اس کے کان اردواں کے قدموں کی آہٹ سنتے رہیں گے۔

اردواں نے ایک یاس کی نظر سے زیبا کو دیکھا اور نکلا چلا گیا۔ زیبا اگرچہ بہت کم سن تھی مگر چھوٹی بہن کی ذمہ داری کا احساس کرتی۔ قابوس کو چلنا پھرنا دشوار تھا تاہم اس نے زیبا اور ماہ رخ کو پدری محبت میں سینے سے لپٹا لیا اور غم نہ کرنے کی تلقین کرتا رہا۔

اردواں کا خیال تھا کہ وہ کاموس کو جلد ہی تلاش کرے گا مگر کاموس کو ایک طرف اپنے گرفتار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف اردوان کی تپش شمشیر نے لرزہ بر اندام کر دیا اور وہ اس طرح روپوش ہوا کہ پھر سامنے نہ آیا۔ اردوان اس کو

ڈھونڈھتا رہا۔ اور وہ بلخ چھوڑ کر مضافات میں اقامت پذیر ہوگیا۔

قابوس شمس افروز کے قتل کے وقت صاحب فراش تھا چند روز میں اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ اس نے بھی کاموس کو تلاش کیا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ زیبا بے عزتی کے احساس سے شب و روز روتی رہتی اور ایک دوشیزہ کے لئے یہ صدمہ تھا بھی ناقابل برداشت۔ قابوس سے اس نے بلخ چھوڑ دینے کے لئے کہا۔ اور وفادار غلام دونوں لڑکیوں کو لے کر ایک روز بلخ سے روانہ ہوگیا۔ ان کی منزل کیا تھی؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔

اردوان اسمٰعیل کا مقرب اور وفادار رسالہ دار تھا اس کی خواہش پر اسمٰعیل نے کاموس کی گرفتاری کے احکام دیدیئے مگر کاموس "عبداللہ" کا چولا اختیار کر کے غزنوی فوج کا مخبر بن چکا تھا وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اردوان نے اس کی طرف سے مایوس ہوکر زیبا کے گھر کا رخ کیا تاکہ اس کو صورت حال سے باخبر کرکے امید دلادے کہ وہ جلد ہی انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ مگر اردوان کو سخت مایوسی ہوئی کہ مکان خالی تھا۔ زیبا چھوٹی بہن اور قابوس کو لے کر کسی نامعلوم مقام کو جا چکی تھی اردوان کو زیبا کی جستجو کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس کے بعد ہی والی بلخ اور سلطان غزنی کی جنگ چھڑ گئی جس میں کاموس ساسانی عرف عبداللہ نے کارنمایاں کیا اور فوج کی افسری حاصل کرلی۔ اردواں اپنے ولی نعمت کے ساتھ گرفتار ہوکر قید کر دیا گیا۔ جس کے باہر وہ اس دن نکالا گیا تھا جب کاموس کو شکست کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔

زیبا کچھ روز قابوس کے ساتھ بخارا میں رہی پھر ہرات آگئی اس کی عمر گو بہت

کم تھی لیکن فطرتاً وہ ذہین واقع ہوئی تھی اس کے علاوہ ذمہ داریوں کے بوجھ نے کسی حد تک ذکی الحس بنا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بوڑھا قابوس دن بھر مزدوری کرتا ہے حالانکہ اس کے قویٰ اتنے کمزور ہیں کہ زیادہ دور پاپیادہ چل نہیں سکتا۔ دونوں بہنیں دن بھر گھر میں تنہا رہتیں اور زیبا اکثر سوچا کرتی کہ زندگی اس طرح کیونکر بسر ہوگی اور وہ کب تک قابوس کے ناتواں کاندھے کا بار بنی رہے گی؟ ایک رات قابوس کی واپسی پر اس نے کہا کہ کوئی کام وہ ایسا تجویز کرے، جس میں دونوں بہنیں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔ قابوس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا دوسرے روز اس نے پھر کہا اور قابوس نے پھر ذہن پر زور دیا لیکن وہ کون سا کام منتخب کرتا؟ اس نے زیبا کو تسلی دیدی کہ اس کی موجودگی میں ایسے خیال کی بھی ضرورت نہیں ہے زیبا خاموش ہوگئی۔ مگر یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا رہا، اور زیبا ہر دوسرے تیسرے کوئی تجویز کرنے کو کہتی۔ ایک دن قابوس کے منہ سے نکل گیا کہ وہ اس کو رقص سکھا سکتا ہے لیکن رقص اس کے لئے موزوں نہیں ہے زیبا کو عزت آبرو کا کوئی لحاظ باقی نہ تھا اور آبرو تو اس کے پاس رہی بھی نہ تھی لحاظ کیا کرتی؟ وہ قابوس کے سر ہوگئی قابوس کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ آخر زیبا نے اس کے ساتھ فریب کیا کہ سکھا دینے میں ہرج کیا ہے زائد سے زائد وہ اس سے وعدہ لے لے کہ زیبا اس کو پیشہ نہ بنائے گی۔ قابوس نے الفاظ کا اعتبار کر لیا۔ اور رقص سکھانا شروع کر دیا۔

دستگیر مختلف علوم و فنون کا ماہر تھا۔ رقص و موسیقی میں بھی اس کو پوری دستگاہ تھی۔ قابوس نے اسی کی صحبت میں رہ کر ناچ گانا سیکھ لیا تھا۔ شب میں جب وہ کام پر سے آتا تو تھوڑی دیر آرام کر کے زیبا کو رقص کے گر تعلیم کرتا اور

اپنے سامنے معمولی سی مشق کرا دیتا دن بھر میں زیبا اس کو پکا کر لیتی اور شب میں قابوس کو عمل کر کے دکھاتی۔ وہ اس کی ذہانت اور طباعی پر خوش ہوتا۔ استاد کو جب ہونہار شاگرد مل جاتا ہے تو اس کو بھی درس دینے میں لطف آنے لگتا ہے۔ قابوس کو زیبا کی اہلیت نے خود متوجہ کر لیا اور رقص کے ساتھ وہ موسیقی بھی سکھانے لگا چند دنوں میں ایک چنگ خرید لیا گیا اور زیبا فن کو فن کی طرح حاصل کرنے لگی

سال ڈیڑھ سال میں وہ ناچ اور گانے کے تمام موٹے موٹے اصول سیکھ گئی ماہ رخ بھی نو دس برس کی ہو گئی تھی اور غیر ارادی طور پر بہن کے رنگ اختیار کر رہی تھی دستگیر کی کتابیں زیبا کے پاس اجداد کی امانت کے طور پر محفوظ تھیں ایک روز یونہی ورق الٹتے الٹتے رقص و موسیقی کی کتاب سے علامتوں کے ذریعے اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور اتار چڑھاؤ کے چند رموز اس کے ذہن میں آ گئے۔ اس دن سے اس کا معمول ہو گیا کہ وہ اس کتاب کو دیکھتی رہتی مزید ایک سال میں وہ اس قابل بن گئی کہ قابوس اپنے کو اس کی صلاحیت سے کمتر سمجھنے لگا۔

زیبا نے قابوس سے وعدہ کیا تھا کہ رقص کو پیشہ نہ بنائے گی مگر وہ ضعیفی میں اس کو آرام کرنے کا موقع دینا چاہتی اور اس کے لئے بجز اس کے کوئی ذریعہ نہ تھا کہ رقص کر کے دولت کمائے اور بوڑھے غلام کی کچھ خدمت کرے زیبا نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ چنگ لے کر کسی سڑک پر نکل جائے لیکن حالات کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ وہ اول تو آخر دستگیر کی نواسی تھی اور سام اور زریاب کا خون اس کی رگوں میں موجزن تھا ارادہ کرنے کے باوجود قدم نہ اٹھ سکے

اور وہ پھیرا بدل کر رہ گئی۔

قابوس کا سن پچھتر سال کا ہو چکا تھا۔ مسلسل محنت سے وہ بیمار پڑ گیا اور پندرہ دن تک پلنگ سے اٹھ نہ سکا۔ زیبا اور ماہ رخ کے اندوختہ کا حصہ اسی کی کمائی پر تھا۔ چند روز تو پچھلے سلسلہ میں چل گئے مگر پھر گرہستی کی ایک آدھ چیز فروخت کر کے کام چلا لیا گیا۔ آخر کو فاقوں کی نوبت آ گئی زیبا اور ماہ رخ کو اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ دو وقت جھیل لے گئیں۔ لیکن قابوس کا بغیر دوا کے پڑا رہنا گوارا نہ ہو سکا۔ اور رات گذار کر صبح کے وقت میلے کچیلے ملبوس میں زیبا چنگ لے کر نکل گئی۔

چوبیس گھنٹے اس پر گذر چکے تھے بھوک میں پھول سا چہرہ کمھلا گیا تھا۔ پھر بھی وہ ہرات کی ایک شاہراہ پر اس طرح گا ئی کہ دامن درہموں سے بھر گیا۔ دوپہر کے وقت قابوس کی دوا اور کھانے پینے کا سامان لے کر لوٹی تو ماہ رخ سمجھ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر وہ بھی بچہ نہ رہی تھی۔ نو دس سال کی لڑکی تھی مجبوری کو سمجھتی تھی۔ زیبا نے پہلے جا کر قابوس کو دوا پلائی۔ اس نے پوچھا کہ انتظام کیونکر ہوا؟ زیبا نے محلہ میں قرض مل جانے کا بہانہ کر دیا۔ قابوس دوا پی کر غفلت میں آ گیا اور زیبا دو زخ پاٹنے کے لئے بیٹھ گئی۔ بشریت کے تقاضے سے اس نے کچھ نہ کچھ کھا لیا۔ مگر ہر نوالا زہر معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن اس کو اس عمل کی ضرورت نہ تھی ایک روز کی کمائی دو دن کو کفایت کر گئی۔ تیسرے دن پھر اسی پر عمل کیا۔ اور مزید دو روز بسر ہو گئے

قابوس ایک مہینہ تک بیمار رہا۔ اور زیبا کو ہر دوسرے تیسرے ناچ گانے سے کام چلانا پڑا اس کی جھجک مٹ چکی تھی وہ آزادی کے ساتھ شارع عام پر رقص کرتی اور روپہلے سکوں کی بوچھار ہو جاتی۔

قابوس کو صحت یاب ہوتے ہی سب حال معلوم ہو گیا۔ اس نے زیبا کو سابقہ روش پر آجانے کی ہدایت کی مگر نکلے ہوئے قدم پیچھے نہ ہٹ سکے۔ زیبا غلط یا صحیح ایک راستہ اختیار کر چکی تھی اور اس کے نزدیک وہ بے محل نہ تھا۔ قابوس نے مجبور ہو کر خود زیبا کے ہمراہ جانا شروع کر دیا کیونکہ جوان لڑکی کی حفاظت اس کا فرض تھا۔ ماہ رخ تنہا گھر میں رہنے لگی اس نے زیبا سے طبیعت گھبرانے کی شکایت کی دستگیر کی عزت خاک میں مل چکی تھی۔ زیبا کو کسی بات کا لحاظ پاس نہ تھا۔ اس نے ماہ رخ کو بھی ساتھ لے لیا اور آہستہ آہستہ ماہ رخ اس کا دہنا بازو بن گئی۔ بہن کو اس کی صحیح جگہ مل گئی اور شعر کے دونوں مصرعوں نے مل کر پوری موسیقیت پیدا کر دی۔

دستگیر کی نواسیاں نسل و رنگ کی امتیازی خصوصیات کے ساتھ رقص و موسیقی کی محیر العقول صلاحیتیں رکھتیں ہرات کے گلی کوچوں میں ان کا آوازہ گونجنے لگا۔ دنیا ان کو چوڑی کی رقاصاؤں کی حیثیت سے جانتی اور ادنیٰ سے اعلیٰ ایک ان کے کمال پر سر دھنتے ان کا وقت بدل چکا تھا سنہرے سکوں کی بارش ہو رہی تھی انھوں نے نہ صرف خداداد اہمیت کے لئے خراج تحسین حاصل کیا۔ بلکہ اپنی جادو نگاہی سے دلوں میں قیامت برپا کر دی۔

قابوس نے بڑے سے بڑے وقت میں آقا زادیوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان حالات

میں بھی محافظ کا کام کرتا۔ گھر کے باہر وفادار غلام اور چہار دیواری کے اندر بزرگ خاندان نظر آتا اس کی نوخیز بالکا میں ہزاروں دھڑکتے ہوئے دلوں کا مرکز خیال تھیں اور دولت کے انبار لگے ہوئے تھے مگر خود ان کے دلوں کو چین نہ تھا۔ زیبا روز کاموس کا سراغ لگانے کے لئے کہتی۔ سوتے سوتے "کاموس" کہہ کر چونک پڑتی۔ بوڑھا غلام اس سلسلہ میں خود اس سے ہم خیال تھا اور بدنہاد قاتل کی جستجو میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا مگر کاموس جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اس کا کچھ پتہ نہ چلتا زیبا کو افسردہ دیکھ کر وہ سمجھاتا لیکن حساس دوشیزہ کی تسلی نہ ہوتی۔

سلطنت غزنی کا فیصلہ ہو چکا تھا بلخ غزنی کے تابع آگیا تھا قابوس ایک روز کاموس کی تلاش میں بلخ گیا۔ وہاں کسی نے بتا دیا کہ وہ ایک مسلمان کا نام اختیار کرکے غزنی کا ساکن ہوگیا ہے۔ غلام نے واپس آکر مالکہ کو اس کی خبر دے دی اور خوبصورت رقاصاؤں نے ہرات چھوڑ دیا۔

غزنی میں ان کا ورود بظاہر اپنے کمال کی داد خواہی کے لئے تھا مگر دراصل وہ ایک قاتل کو کیفر کردار کو پہنچانے کے لئے آئی تھیں۔ بوڑھے غلام نے اس میں بھی ساتھ دیا تھا اور عبداللہ کا پتہ لگا کے چھوڑا۔ عبداللہ زیبا کی اصلیت سے واقف تھا۔ مگر زیبا کو غزنی آتے ہی اتنا عروج مل گیا کہ عبداللہ کو کسی ریشہ دوانی کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے سوا گنہگار ضمیر سامنے آنے کا یارا نہ دیتا۔ عبداللہ اپنے کو زیبا اور قابوس سے چھپاتا رہا۔ اور وہ لوگ بھی بظاہر اس کی طرف سے انجان بنے رہے۔ حتیٰ کہ ایک شب زیبا کے ملبوس میں ہر وقت

چھپا رہنے والا خنجر بے نیام ہو گیا اور دستگیر کی نواسی نے انصاف کے تقاضے کو پورا کر دیا۔

اب یہ فیصلہ عدل سلطانی پر ہے کہ وہ زیبا کو لائق تحسین قرار دے یا قابل مواخذہ۔"

فردوسی اپنا بیان ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا سلطان نقش حیرت بنا ہوا فردوسی کو دیکھ رہا تھا۔ کئی لمحوں تک اس کے کان بجتے رہے۔ پھر اس نے قاضی القضاۃ کی سمت دیکھا۔ قاضی نے کہہ دیا کہ قانون کا ہاتھ میں لے لینا ایک جرم ہے۔ لیکن کاموس کا انجام جو کچھ ہوا وہی ہونا چاہیے تھا۔ سلطان نے زیبا اور قابوس کی بریت کا حکم دے دیا اور جس قدر تکلیف انھوں نے برداشت کی تھی اس کو ان کی جسارت کے لئے کافی قرار دیا۔

حکم سنا کر سلطان دربار برخواست کر کے کھڑا ہو گیا اور سہ پہر کے وقت زیبا اور قابوس کو حاضر ہونے کی ہدایت کر کے عقبی دروازے میں داخل ہو گیا۔

زیبا اور قابوس نے زنداں سے نجات پائی تھی ان کے لئے انتہائی مسرت کا محل تھا مگر فردوسی اور رہابک کی خوشی ان سے کچھ کم نہ تھی اور ماہ رخ تو دیوانی سی ہو گئی جب اس نے زیبا اور قابوس کو فردوسی کے ساتھ مکان میں داخل ہوتے دیکھا دوڑ کر بہن سے لپٹ گئی۔ پھر قابوس کی آغوش میں پہنچ کر سسکنے لگی۔

باب (۱۵)

ایفائے وعدہ

فردوسی نے زیبا کی ایک قیاسی داستان بیان کی تھی مگر اتفاق سے وہ حرف بہ حرف صحیح نکلی اور زیبا اس کے ذہن کی رسائی پر استعجاب میں پڑ گئی۔ دربار میں تو زیبا کا خیال تھا کہ شاید ماہ رخ نے کچھ بتایا ہو مگر مکان پہنچ کر جب اس کو معلوم ہوا کہ فردوسی نے ماہ رخ سے اس سلسلہ میں بات بھی نہیں کی تو اس کے تحیر میں اضافہ ہو گیا اور وہ فردوسی کی معلومات کو الہام کا ہم پایہ قرار دینے لگی۔ فردوسی ایک شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ ماہر افسانہ نویس بھی تھا اور اسی صلاحیت کی بدولت اس نے تاریخی حقائق کی بنیادوں پر شاہنامہ کی عمارت کھڑی کی تھی۔ فردوسی کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فطرت انسانی کا رمز شناس تھا۔ واردات قلب کا پورا تجربہ رکھتا معمولی اشارے پر پورے واقعہ کو سمجھ لینے میں اس کو دقت نہ ہوتی اور اس کی اسی اہلیت نے زیبا کی پوری سرگزشت مرتب کرا دی تھی

فردوسی کا گمان تھا کہ زیبا اپنی بے عزتی کا واقعہ بھرے دربار میں کہہ دینے پر ناراض ہو گی مگر زیبا نے اس سے کوئی شکایت نہ کی۔ فردوسی نے خود ہی صفائی دی کہ وہ تمام حالات بے کم و کاست بیان کرنے پر مجبور تھا جبکہ زیبا پہلے ہی دن

ایک جملہ میں پوری روداد سنا چکی تھی۔ زیبا نے اس موضوع پر زیادہ بات چیت نہ کی اور کہہ دیا کہ ایک قاتلہ کی صفائی سر عدالت ہی ہو سکتی۔ اس کے سوا حقیقت کو چھپانے سے فائدہ کیا تھا اور حقیقت بھی ایسی جو ایک رقاصہ کے لئے غیر متوقع نہ ہو۔ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ اور فردوسی نے اس کے احساسات کا لحاظ کر کے سکوت اختیار کر لیا۔

فردوسی ہی کے مکان پر زیبا اور قابوس نے نہا دھو کر لباس تبدیل کئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کی اور حسب الطلب سلطان کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ماہ رخ اور فردوسی بھی ساتھ ہو لئے۔ محمود ان کے پہنچنے سے قبل بیٹھ چکا تھا۔ اس نے اطلاع ملتے ہی بلا لیا۔

قابوس اپنی حیثیت کا لحاظ کر کے باہر ہی ٹھہر گیا۔ جیسے ہی وہ لوگ سامنے پہنچے محمود نے قابوس کو دریافت کیا۔ فردوسی نے کہہ دیا کہ باہر موجود ہے۔ محمود نے ایاز کو اس کے لانے کا حکم دیا۔ ایاز خود جا کر لے آیا اور محمود تخت سے اتر کر بغلگیر ہو گیا کاہے کو کسی بادشاہ نے ایک غلام کی اتنی منزلت کی ہو گی! قابوس اپنے کو آسمان کی طرف مائل پرواز محسوس کرنے لگا۔ وفور مسرت میں اس کی آنکھیں بھر آئیں اور محمود کے الفاظ پر تو ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔ محمود کہہ رہا تھا۔

"قابوس تمھارا کردار غلاموں کے لئے مشعل راہ ہے تم نے اپنی وفا کی وہ نظیر پیش کی ہے۔ نسلیں جس پر فخر کریں گی۔"

بزرگ احمد اور ابو سہل دل ہی دل میں جلے جا رہے تھے۔ محمود نے ابو سہل کو حکم دیا کہ قابوس کی گذر بسر کے لئے پانسو دینار سالانہ دئیے جانے کا حکم تحریر

کردے اور ایک سال کی تنخواہ پیشگی دہانید کرا دے۔ ابو سہل پر یہ حکم بہت گراں گزرا مگر تعمیل کے لئے مجبوری تھی۔

قابوس سلام کرکے باہر جا چکا تو سلطان زیبا کی طرف مخاطب ہوا اور اظہار ہمدردی کرکے اس کے منصب پر بحال کر دیا۔ زیبا نے صبح سے اس وقت تک دربار میں ایک بات بھی نہ کی تھی۔ سلطان کو متوجہ پا کر دبی زبان سے بولی۔

"ایک بار سلطان نے میری ایک خواہش پوری کرنے کا قول دیا تھا۔"

"ہاں مجھ کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ کہو کیا چاہتی ہو تم ؟" محمود نے پوچھا اور زیبا نے کہہ دیا۔

"اردوان کو نظر بندی سے آزاد کر دیا جائے۔"

محمود ایک لمحہ کے لئے متفکر ہو گیا۔ اردوان ان لوگوں میں تھا جو موت قبول کرنے کو تیار ہو گئے مگر اسمٰعیل کا ساتھ نہ چھوڑا۔ محمود اس کی طرف سے مشتبہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کر وہ اسمٰعیل کے مفاد کے لئے کوئی سازش نہ کرے لیکن زیبا کو دیے ہوئے الفاظ عمل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ محمود کو قول مرداں کا بھرم رکھنا لازم ہو گیا۔ اس نے کہہ دیا۔

"تم نے ایک ایسی بات کے لئے کہا ہے جس کا نتیجہ سلطنت غزنی کے حق میں خطرناک بھی ہو سکتا ہے مگر میں تمھاری خواہش کو پورا کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ فضل اسفرائنی کی طرف متوجہ ہوا اور اردوان کی رہائی کا حکم دیدیا۔ بزرگ احمد، ابو سہل اور دوسرے اہل دربار پہلو بدل کر رہ گئے۔ خود فضل بھی متامل ہوا۔ مگر سلطان کی زبان سے نکلی ہوئی بات عمل کی محتاج کیسے رہ سکتی

فضل نے اسی وقت تعمیل کی اور تھوڑے وقفہ بعد اردواں سلطان کے سامنے کھڑا تھا۔

دو روز قبل اسی دربار میں زیبا اور اردواں کی ملاقات ہوئی تھی لیکن بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آنکھوں نے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا، زبانیں جنبش نہ کر سکی تھیں کیونکہ دونوں کی حیثیتیں قیدیوں کی تھیں۔ آج زیبا آزاد تھی اور اردواں کی بیڑیاں کٹنے جا رہی تھیں۔ ان کو ہمکلام ہونے کا موقع تھا اردواں کی طرف سے جس کی ابتدا ہوئی اور پہلے دن کی طرح اشک آلود آنکھوں سے اسنے کچھ کہا۔ مگر زیبا نے ایسی سردمہری کا اظہار کیا۔ جیسے وہ اس سے واقف ہی نہ ہو۔ اور واقفیت بھی ہو تو برائے نام اردواں اس کے انداز پر متحیر رہ گیا۔ لیکن اس کو کچھ سوچنے کی نوبت نہ آئی اور محمود نے مخاطب کر لیا وہ کہہ رہا تھا۔

"اردواں۔ زیبا کی خاطر تم کو قید سے نجات دی جاتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم آٹھ روز کے اندر غزنوی سلطنت کی حدود سے نکل جاؤ۔ اور آئندہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو زنداں کے دروازے تمھارے لئے کھل جائیں گے۔"

اردواں نے سرخم کر کے سن لیا۔ مگر زیبا کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"کیا غزنی میرے وجود کو بار سمجھ رہا ہے ــــــــ"

زیبا کے بے محل سوال پر سلطان متحیر ہو گیا مگر اس کو فردوسی کی بیان کی ہوئی سرگذشت یاد آ گئی۔ اور اردواں کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ــــ

اردواں کو قید میں برسیں گزر گئی تھیں۔ اس کی تندرستی کافی متاثر تھی۔ پھر بھی

ناک نقشے کی موزونیت اور سرخ وسفید رنگت نے اس کے امتیاز کو قائم رکھا تھا۔

محمود نے رسیاں کھول دینے کا حکم دے دیا اور زیبا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ غزنی میں رہ کر غداری نہ کرے گا۔؟"

"سلطان محمود کے وسائل اتنے محدود نہیں ہیں کہ ایک تنہا شخص کی نگرانی رکھی نہ جا سکے! اس کے علاوہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے لئے سلطان کی نوازشوں کو فراموش نہ کروں گی۔"

اردواں کو آزادی دی جا چکی تھی محمود نے زیبا اور ماہ رخ کو اسکے لے جانے کی اجازت دے دی۔ اور دونوں بہنیں اردوان کے عقب میں دربار سے نکل آئیں

محمود نے ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دربار برخواست کر دیا۔ فردوسی کو اپنے مکان تک پہنچتے پہنچتے مغرب کا وقت آگیا۔ زیبا و ماہ رخ وہاں نہ تھیں۔ غلام سے اس کو معلوم ہوا کہ وہ آئیں ہی نہیں۔ فردوسی کے جی میں آیا کہ نماز پڑھ کر زیبا کے وہاں ہو آئے۔ پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور کئی روز بعد شاہنامہ کو یاد کیا اس رات فردوسی نے ایک سو سے زیادہ اشعار نظم کر ڈالے اور بہت اطمینان کی نیند سویا۔

صبح کو زیبا اردوان کے ہمراہ اس سے ملنے کے لئے آگئی۔ وہ ناشتہ کر رہا تھا۔ زیبا ناشتہ کر کے آئی تھی مگر اس کے اصرار پر شریک ہو گئی۔ اردواں کو فردوسی نے مدعو کیا۔ مگر اس نے معذرت کر لی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر فردوسی اردوان سے اس کی پچھلی زندگی پر باتیں کرنے لگا۔ اور زیبا ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلی گئی۔

سہ پہر کو فردوسی زیبا کے گھر گیا۔ زیبا نے مختصر سی نشست کے بعد تازہ کلام

سنانے کی فرمائش کردی۔ فردوسی اگر کسی کو اپنا کلام سنانا چاہتا تو وہ زیبا تھی اور فردوسی کے کلام سے اگر کسی کو عشق تھا تو زیبا کو اس لئے فردوسی اس کی معمولی سی تحریک پر شعر خوانی شروع کر دیتا اور زیبا پر اس کا فوری اثر پڑتا۔ وہ کیف میں سرشار ہو جاتی۔ کئی دن کے بعد یہ مجلس گرم ہوئی تھی۔ فردوسی کے پاس کافی ذخیرہ ہو چکا تھا۔ اس نے سب پڑھ ڈالا اور زیبا سنتے سنتے نہ تھکی بلکہ اس کا شوق لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہا۔ اردوان نے پہلی بار شاہنامے کو سنا تھا۔ اس کی رگوں میں خالص ایرانی خون تھا۔ اسلاف کے کارناموں پر وہ بھی جھومنے لگا۔ فردوسی کے خاموش ہو جانے پر دیر تک سب پر وجد طاری رہا۔ آخر خود فردوسی نے اس سکوت کو توڑا اور زیبا سے حسب معمول انھیں اشعار کو سنانے کے لئے کہا۔ زیبا نے تعمیل ارشاد میں چنگ اٹھایا اور تاروں پر انگلیوں کو حرکت دینے لگی۔

اردوان زیبا کو شمس افروز کی بیٹی کی حیثیت سے جانتا۔ ایک مغنیہ یا رقاصہ کی تعریف میں اس سے شناسا نہ تھا۔ وہ بھی ہمہ تن گوش بن کر متوجہ ہو گیا اور زیبا نے تاروں کے راگ سے ایک فضا پیدا کر کے ہلکے سروں میں پہلا شعر پڑھا۔ دوسرے شعر میں اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ نغمہ بار آواز اپنی سطح پر آ گئی۔ فردوسی اور اردوان مدہوش ہونے لگے۔ شروع میں تو احسنت اور آفریں کے الفاظ لبوں سے نکلتے رہے۔ پھر دونوں پر از خود رفتگی طاری ہو گئی اور وہ مسحور سے ہو کر رہ گئے۔

زیبا نے جب گانا بند کر دیا تو اردوان اس کو ایسی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جس میں ایک مرد کی طرف سے کسی عورت کے لئے انتہائی پیار تھا۔ مگر زیبا کی طرف سے

اس کا جواب امید افزا نہ ملا اس نے سنجیدگی کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔ فردوسی زیبا کے اس تغیر پر متحیر تھا اس کی آنکھوں نے پہلے دن دربار میں اس کی روش دیکھی تھی دوسرے دن اس سے مختلف کیفیات کا احساس کیا تھا اور آج صبح سے ویسا ہی مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں زیبا کو ان جذبات سے معرّا پا رہی تھیں۔ سابقہ ربط کے تحت جس کی توقع تھی۔ فردوسی کو خوبصورت رقاصہ کے تلوّن مزاج پر استعجاب ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ اور دقیقۂ نشست کو مختصر کر کے اٹھ آیا۔

اردوان بھی زیبا کے طور طریقہ کو بدلا ہوا دیکھ رہا تھا مگر شکایت اس لئے نہ کر سکا تھا کہ اس کے دل کی اس خیال نے تقویت کی تھی کہ اگر زیبا کو اس سے محبت نہ ہوتی تو وہ اس کی بریت کے لئے اس قدر جد و جہد نہ کرتی تاہم اس وقت کی بے التفاتی ناقابل ضبط بن گئی اور فردوسی کے جانے کے بعد جب ماہ رخ بھی اٹھ گئی تو اس نے کہہ ہی دیا۔

"تمہارے انداز سے مغائرت کی بو آتی ہے۔ زیبا!"

"میرے اور تمہارے درمیان مغائرت کا سوال تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ میرا زاویۂ نگاہ کچھ تبدیل ہو گیا ہے شاید تم اس کو محسوس کر رہے ہو۔" زیبا نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ اس کا لہجہ ایک محبوبہ کی شان کے متضاد اور کسی واعظ سے ملتا جلتا تھا۔ جس نے اردوان پر اثر کیا۔ اور سنجیدگی کے ساتھ اس نے وضاحت کی استدعا کر دی۔

"میں تمہارا منشا سمجھ نہیں سکا زاویۂ نگاہ سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

زیبا نے اس کی پرسش پر ایک لمحہ کے لئے سر جھکا لیا۔ پھر نگاہیں اوپر اٹھائیں اور سامنے کی دیوار کے ایک نقطہ پر جما دیں اور زدوان اس کا جواب سننے کا منتظر تھا وہ کہنے لگی۔ "میں نے دوشیزگی کے زمانہ میں تم سے ایک پیمان کیا تھا۔ اس کی تکمیل نتیجہ میں مشروط قرار پائی۔ لیکن شرط اس وقت پوری ہوئی جب مجھ میں اتنا انقلاب آچکا ہے کہ بنت یزداں داد کے کردار سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ بلخ میں تم سے جس دوشیزہ نے زندگی کی وابستگی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بلخ ہی میں تم سے منسوب ہونے کے لائق تھی اور ہرات آکر تو اس نے نیا قالب اختیار کرلیا۔ ایک ناچنے گانے والی لڑکی دستگیر کی نواسی کہے جانے کی مستحق نہیں ہوسکتی ------ حالات یہیں پر قرار لینے دیتے تو سوچنے کی گنجائش رہتی مگر غزنی آکر زاویہ نظر بھی بدل گیا اور ایسا بدلا جس میں مزید کسی تغیر کا امکان نہیں ہے"۔

زیبا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر زدوان کے سراپا پر نگاہ ڈالی اور کہنے لگی۔ "بلخ سے روانگی کی تاریخ سے غزنی پہونچنے تک میں نے تم کو یاد رکھا۔ تم کامیں ساسانی کا سر لانے میں کامیاب نہ ہوسکے تھے لیکن میری نگاہ ایک عورت کی حیثیت سے اگر کسی مرد پر ٹھہرتی تو وہ تم تھے۔ آج بھی میں تم سے خوشحال ہوں مگر ازدواجی زندگی کے لئے نااہل ہونے کا جو احساس کہ میں ساسانی کے ہاتھوں نسائیت کے غرور سے محروم ہونے کے بعد قائم ہوا تھا۔ وہ آنے والی ہر ساعت میں مستحکم ہوتا رہا غزنی میں تمہاری تصویر حافظہ میں تھی۔ تمہارا نام اکثر زبان پر آتا مگر اس لئے نہیں کہ سفر حیات میں تمہارے ازدواج کا سہارا درکار تھا بلکہ اس لئے کہ تم یاد رکھنے کے لائق تھے اور تمہاری شخصیت ایک ایرانی نوجوان کا کردار تھا۔

اتفاقات نے یہاں ایک ایسی شخصیت سے دو چار کر دیا۔ جس نے مجھے زندگی میں سب سے زیادہ متاثر کیا؛ اور میں محسوس کرنے لگی کہ کاموس ساسانی کی تلاش تو محض ایک بہانہ تھا۔ قسمت در اصل مجھ کو اسی انسان کے تقرب کے لئے کھینچ لائی تھی جو ایرانی نسل اور قوم کو زندہ جاوید بنا رہا ہے یطوس کا فنکار حکیم ابو القاسم فردوسی ہے جس کی الہامی شاعری نے وطنیت کی سوتی ہوئی روح کو بیدار کر دیا ہے اور میں جس کے قریب بیٹھ کر نشہ کی سی کیفیت محسوس کرتی ہوں۔

شاہنامہ بلاشبہ فردوسی کا شاہکار ہے۔ شاہکار نہیں بلکہ اس پر نازل ہونیوالا صحیفہ آسمانی ہے۔ میری سی ایک وطن پرست عورت کی تحریک جس کا سنگ بنیاد بنی۔ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ اور اردوان سے پوچھنے لگی۔

"جانتے ہو وہ عورت کون تھی ——— ؟

اردوان کے حواس خمسہ جواب دے رہے تھے۔ اس کی آرزوؤں کا قلعہ اچانک منہدم ہو رہا تھا۔ جس نے دل و دماغ کو بے قابو کر دیا تھا۔ زیبا کی پرسش پر اس نے انکار میں سر ہلا دیا اور زیبا نے کہنا شروع کر دیا۔

"وہ فردوسی کی رفیقۂ حیات اور دشتگیر کے برادر عزیز رشتدار کی نواسی تھی۔ فردوسی کو نوشابہ سے بہت محبت تھی۔ اور اسی محبت کو بنا قرار دے کر نوشابہ نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے پر مجبور کیا۔ چاہنے والے شوہر نے محبوبہ کی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی جس کے نتیجہ میں افلاس نے گھیر لیا نوشابہ طرح طرح کی تکلیفیں جھیل کر عالم شباب میں مر گئی۔ اور فردوسی کو شاہنامہ پورا کرنے کی وصیت کر گئی۔ طوس کا شاعر اعظم چہیتی بیوی کی موت پر دل شکستہ ہو گیا

مگر اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس کی نگاہ میں نوشابہ کی تصویر، خیال میں اسلاف فارس کے کارنامے تھے۔ جو اشعار کی صورت میں زبان پر آتے رہے اور ایک مدت کے بعد اس کو غزنی کا رخ کرنا پڑا۔ میرے آنے کے کئی مہینے پیچھے اور اپنے ورود کے پہلے ہی دن اس نے شاہی باغ میں مجھ کو دیکھ لیا اور نوشابہ کہہ کر پکارنے لگا۔

فردوسی کہتا ہے کہ میں شکل وصورت رفتار وگفتار میں نوشابہ سے بہت مشابہ ہوں۔ میری آواز بالکل اسی کی سی ہے اور چنگ بھی اسی طرح بجاتی ہوں میں اس کا اعتبار نہ کرتی۔ لیکن ایک رات میری ہی سی ایک عورت خواب میں مجھ کو نظر آئی۔ میں سمجھی کہ آئینہ میں اپنا پرتو دکھائی دے رہا ہے مگر جب اس کے لبوں کو حرکت ہوئی اور اس نے زیبا رُخ کہکر مجھ کو مخاطب کیا تو میں متوجہ ہوگئی اس نے اپنا نام نوشابہ بتا کر بزرگانہ لہجہ میں مجھ کو تاکید کی کہ فردوسی کا خیال رکھوں اور اس کا دل نہ ٹوٹنے دوں ـــــ خواب کی باتیں خیال پر مبنی ہوتی ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ نوشابہ کی یہی خواہش ہوگی اور میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ قدرت نے جب مجھے نوشابہ کی ہم شبیہ بنایا ہے تو میں اس فرض کو بھی پورا کروں جو نوشابہ پر زندہ ہونے کی صورت میں عائد ہوتا۔ فردوسی مجھ کو دیکھ کر جیتا ہے اور مجھ سے اس سے زائد کچھ نہیں چاہتا میں ہر حالت میں رہکر اس خواہش کو پورا کرسکتی ہوں مگر کسی اور کی ہونے کے بجائے صرف فردوسی کے فن کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں یہ میرا آخری فیصلہ ہے تم کو جس سے باخبر کرتی ہوں!!

اردوان انتہائی یاس کے عالم میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ زیبا کا دل جھرکا

اثر قبول کرنے لگا۔ مگر اس نے نگاہ جھکا لی اور اردوان نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا

"تم ایک تجلی چیز کے لئے میری زندگی کو کیوں خراب کر رہی ہو ـــــــ"

"تمہاری زندگی کے خراب ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، تم بفضلہ خوبرو ہو جوان ہو، تم کو میری سی بہت عورتیں اکٹھا ہو سکتی ہیں مگر فردوسی کو نوشابہ کی بجائے زیبا نہیں مل سکتی۔" زیبا نے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی اور اردوان زچ ہو کر بولا۔

"تم کو یہی کرنا تھا تو مجھ کو آزادی کا ہیکو دلائی؟"

"اس لئے کہ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی تھی اور آئندہ بھی رہے گی۔"

اس نے برجستہ کہہ دیا۔ اردوان لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا اور ایک لحظہ توقف کر کے نیم مجنونانہ انداز میں کہنے لگا: "اس کمبخت فردوسی کو میری ہی مسرتوں پر ڈاکہ ڈالنا تھا۔ میں اسے راستہ ہی سے کیوں نہ ہٹا دوں؟"

زیبا کا ہاتھ اس کی بات پوری ہوتے ہی تکیہ کی طرف بڑھ گیا اور انگلیوں نے خنجر کے قیمتی دستہ کو چھپاتے ہوئے دستہ کو نکال لیا۔ برہم تیوروں سے اس نے اردوان کو دیکھا اور بولی: "یہ خنجر اس بدباطن کے سینے کا جائزہ لینے کو تیار ہے۔ جس کی زبان فردوسی کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کرے گی ـــــــ!"

اردوان زیبا کے اس جذبے پر تحیر میں پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مصلحت آمیز تبسم کھیلنے لگا۔ اور صلح جویانہ انداز سے اس نے کہا۔

"تم میری بات کا برا مان گئیں لیکن یہ نہ سوچا کہ جس نے عمر کا ہر لمحہ تمہارے تصور

میں گذارا ہو۔ دفعتاً اسی خبر سے اس پر کیا بیتے گی؟ زیبا کو متوجہ پاکر ربط کلام میں اس نے اضافہ کیا۔ "آنکھوں کے ساتھ نظر بندی کے بعد مجھ کو تم سے مل سکنے کی امید نہ تھی مگر یہ سہارا کیا کم تھا کہ اگر مقدر نے یاوری کی تو تم ہمیشہ کے لئے میری ہی ہو جاؤ گی۔ کاش وہ سہارا ہی باقی رہتا اور امید یک لخت نہ ٹوٹتی۔ تم کو جانے کیا ہو گیا ہے کہ مجھ کو زندہ درگور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو برباد کر رہی ہو"

"تمھاری بابت میں پہلے ہی کہہ چکی کہ جوان جہان ہو۔ تم کو کسی شے کی کمی نہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنا نصب العین بنا چکی اور تم کو یقین دلاتی ہوں کہ جب میں شاہنامہ کے اشعار پڑھتی ہوں تو مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ آفاق میری جانب کھنچ رہے ہیں۔ وہ کیف اور وہ سرور جو اس وقت آتا ہے اس کے سامنے دنیا کی ہر مسرت ہیچ ہے۔ فردوسی اگر شاہنامہ کا مصنف ہے تو مصنفہ گرنوشابہ کے دوش بدوش کھڑا ہونا میرا کام ہے جس کے لئے میرا عزم راسخ اور ارادہ پختہ ہو چکا ہے۔"

اردوان اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر ماہ رخ کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ کھانے کے لئے کہنے آ رہی تھی اور زیبا اس کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور اردوان کو لے کر دسترخوان پر جا کر بیٹھ گئی۔

قابوس کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ اس لئے زیبا کے گھر میں وہ غلامانہ دائرے سے نکل آیا تھا۔ گھر کے بزرگ کی حیثیت سے رہتا اور سلطان کے عطا کردہ کنیز اور غلام خانہ داری کے کام انجام دیتے۔ قابوس کو بھی اردوان کے رام ہو جانے کی مسرت تھی اور وہ زیبا کی خوشگوار زندگی کا آغاز اپنی آنکھ

سے دیکھنے کا تمنائی تھا۔ دسترخوان پر وہ اردوان کے قریب بیٹھا اور اس کے اترے ہوئے چہرے سے کچھ اندازہ کیا مگر پوچھ نہ سکا۔

دوسرے دن اس کو زیبا سے اس کا عزم معلوم ہوگیا۔ بوڑھے قابوس کو اس سے بہت تکلیف پہونچی۔ اس نے زیبا کو سمجھانے کی سعی کی لیکن زیبا کا فیصلہ اٹل تھا۔ دہ ٹس سے مس نہ ہوئی آخر کو مجبور ہو کر قابوس راضی برضا ہوگیا اور زیبا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ زیبا کا اقدام سن و سال کے اعتبار سے قابوس کے نزدیک مناسب نہ تھا مگر وہ بھی ایک ایرانی تھا۔ اس کا دل بھی وطن کی سربلندی کا خواہاں اور فردوسی کی کامیابی کا جویا تھا۔ ایک بار کوشش کرنے کے بعد پھر اس نے زیبا کو راستے سے ہٹانے کی جد وجہد نہ کی اور اسی کی روش کو حق بجانب سمجھنے لگا۔

دو روز کے وقفہ سے زیبا مجرے کے لئے طلب کی گئی۔ اردوان بھی اس کے ہمراہ گیا۔ اور رقص دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ لیکن زیبا کے انداز نے کچھ کہنے کی اجازت نہ دی۔ ——— اردوان بظاہر خاموش تھا مگر اس کے قلب میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور فردوسی کے خلاف رقابت کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ شاہنامے کے مصنف سے عناد رکھنے پر وہ اپنے کو ملامت کرتا مگر زیبا کے ملکوتی حسن پر نگاہ جاتی تو محبت اس کو اندھا بنا دیتی اور وہ ضعیف العمر شاعر کے لئے ہر کارروائی پر آمادہ ہو جاتا۔ زیبا کے خیالات سے اس کو واقفیت ہو گئی تھی۔ اس لئے لبوں کو بند کئے ہوئے تھا۔ مگر دل ہی دل میں عجب عجیب منصوبے بنا رہا تھا۔

سلطان کو کسی مہم پر جانا تھا وہ روانہ ہوگیا تو اردوان کو میدان صاف

مل گیا اور وہ اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی سوچنے لگا۔

زیبا کو اردوان کا بہت خیال تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ اس کا ہم مذہب اور اہل قبیلہ تھا بلکہ حقیقتاً وہ اسکو چاہتی تھی مگر اس چاہت میں سے جنسی رجحان کا لعدم ہو گیا تھا۔ اس کا دل اردوان کی افسردگی پر کڑھتا تھا۔ لیکن بجز زبانی ہمدردی کے کچھ نہ کر سکتی کیونکہ اس نے اپنے کو وطنیت کے مفاد کے لئے مختص کر لیا تھا اور فردوسی کی مجبوبہ بن کر شاہنامہ کی تخلیق میں شریک رہنا اس کا نصب العین تھا۔ اردوان کو وہ خوش و خرم دیکھنا چاہتی مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ ایک روز لیٹے لیٹے ایک تجویز ذہن میں آ گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ـــــــ ماہ رخ پوری طرح جوان ہو چکی تھی۔ اس کے لئے کسی شوہر کا انتخاب کرنا تھا اور دہگر کی وصیت کے مطابق جس کا نجیب الطرفین ہونا لازم تھا۔ مملکت غزنہ میں اردوان کے سوا کوئی نظر نہ آتا جو اس معیار پر پورا اترتا۔ زیبا نے بہن کے ساتھ اس کو ربط دے کر دیکھا تو کوئی قباحت نہ معلوم ہوئی بلکہ کسی حد تک اردوان کی اشک شوئی ہوتے دکھائی دینے لگی۔ ماہ رخ اس کی بہن تھی اور صورت شکل میں بھی مماثل۔ اردوان اس کو زیبا قرار دے سکتا۔ مگر زیبا کے لئے ماہ رخ سے رشتہ کی رضا لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے زیبا نے فی الفور زبان سے نہ نکالا اور ماہ رخ سے پوچھنے کے لئے موقع کا انتظار کرنے لگی۔

ایک صبح کو آخر اس نے استفسار کر لیا اور کسی قدر حیا اور تکلف کے ساتھ ماہ رخ کے اظہار رضامندی سے اس کو مسرت ہوئی لیکن حقیقی بہن کا معاملہ تھا۔ اردوان سے یکایک کہہ دینا مناسب نہ تھا۔ زیبا بات میں بات نکال کر ماہ رخ کو اپنا قائم مقام بنا کر پیش کرنا چاہتی تا کہ اردوان اس کی قیمت کو سمجھ سکتا۔ کئی دن گذر گئے اور زیبا

کے لئے اس کا محل پیدا نہ ہوا۔ اس نے بھی کہنے میں تعجیل نہ کی۔ کیونکہ اردوان کو سردست وہیں رہنا تھا۔ زیبا کسی وقت بھی کہہ سکتی تھی

دن حسب معمول کٹنے لگے زیبا اور فردوس کی یکجائی ہوتی رہی اور اردوان کا خون کھولتا رہا۔ ایک تغیر جو تازہ رونما ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ ماہ رخ اردوان کو ایک مخصوص نگاہ سے دیکھنے لگی تھی کیونکہ بہن نے بتایا تھا کہ وہ اس کا ہونے والا شوہر ہے۔ اردوان ماہ رخ کو اپنی طرف ملتفت پاتا۔ مگر اس کو کوئی معنی پہنا نہ سکتا وہ اسکی بڑی بہن کا چاہنے والا تھا۔ ماہ رخ کے لئے نیت کو ڈانواڈول کیونکر کرتا؟

باب (۱۶)

رقابت

اردوان نے فطرت سے شیر کا دل اور لوہے کا کلیجہ پایا تھا۔ رزمگاہ میں اس کی تلوار ایک مرتبہ بے نیام ہو کر اس وقت تک نہ رکتی جب تک فتح خود بڑھ کر قدم نہ چوم لیتی۔ آخری معرکہ جس میں اس نے اپنے ولی نعمت کے لئے داد شجاعت دی تھی۔ سلطان محمود سے ہوا۔ اردوان کی فوج کو شکست ہوئی مگر خود اردوان مفتوح نہ ہو سکا۔ اسمٰعیل کا لشکر گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ سپاہی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ غزنوی فوجیں تسلط کر رہی تھیں۔ اردوان کو سب کچھ معلوم تھا۔ پھر بھی اس کی برّش شمشیر اپنے جوہر دکھا رہی تھی اور جس مقام پر وہ کھڑا ہوا تھا۔ گرداگرد کشتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سلطان محمود کا لشکر گھیرا ڈال کر مجبور نہ کر دیتا تو اس کا ہاتھ نہ رکتا۔ حالانکہ اس کی جنگ اس کے علم ویقین میں خودکشی کے مرادف ہوتی۔ مگر جیتے جی قبضہ شمشیر ہاتھ سے چھوڑ دینا بھی اس کے خیال میں مردمی کے خلاف تھا۔ یہی بہادری اور وفاداری تھی جس کے باعث سلطان محمود اس کو آزاد کرنے میں متامل تھا۔

بلخ کے کمینے ہی لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اردوان بھی ان اسیروں میں تھا جو قابل گردن زدنی تھے لیکن اس کی شجاعت نے رحمدل سلطان کو اس کے آزاد

سے باز رکھا اور وہ اسمٰعیل کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔ محمود اس کے بازوؤں کا قدردان تھا اس نے اردوان کو سلطنت غزنی کی پناہ میں آ جانے کی دعوت دی مگر وفا کیش اردوان اسمٰعیل کا وقت بگڑ جانے کے بعد دشمنوں سے ساز نہ کر سکا۔ اور اس نے سلطان کی پیش کش کو حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا!

محمود نے رہائی کے بعد ہی بچھڑا اسے اپنی ملازمت میں آ جانے کے لئے کہہ دیا ہوتا مگر اس کو آہوئے وحشی کے بھڑک جانے کا اندیشہ تھا۔ اسلئے کچھ دنوں کے لئے زیبا کے ہمراہ اطمینان کا سانس لینے کو چھوڑ دیا زیبا سے اس کی محبت کی داستان معلوم ہو چکی تھی اور سلطان کو یقین ہو چکا تھا کہ

خانہ زاد زلف ہے "زنجیر سے بھاگے گا" کیوں؟
ہے "گرفتار وفا زنداں سے گھبرائے گا" کیا؟

کچھ دن گذر جانے کے بعد زیبا کے ذریعہ تحریک کرانے کے لئے سلطان نے سوچا تھا اور ایک بدترین دشمن کو بہترین دوست بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سلطان کی تجویز ہر اعتبار سے دانشمندانہ تھی۔ اور اردوان اس کا نہایت وفادار رہا ہی ثابت ہوتا مگر زیبا کے جنسی انقلاب نے حالات ہی بدل دیے اور غزنی کی زندگی اردوان کے لئے صبر آزما بن گئی۔

زیبا کے گھر میں وہ کانٹوں پر بسر کر رہا تھا۔ محبوبہ کو اپنی آنکھوں سے فردوسی کی طرف ملتفت دیکھتا۔ جانتا تھا کہ ان کے مابین ایک مقدس رشتہ ہے۔ فردوسی اس کے نزدیک قابل قدر تھا۔ لیکن محبت فہم و فراست کے دائرے میں رہنے نہ دیتی اور قوت برداشت جواب دے جاتی۔ ایک رات دیر تک نیند نہ آئی اور جنون

رقابت میں اس نے ایک شیطانی عزم کر لیا۔ قریب رکھی ہوئی تلوار اٹھا کر صحن میں آ گیا اور دروازہ کھول کر مکان کے باہر نکل آیا۔

رات نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ قمری مہینے کی آخری تاریکیں تھیں۔ تاروں بھرے آسمان کے سایہ میں اردوان فردوسی کے مکان کی طرف چل پڑا۔ بوڑھے شاعر نے اس کی دنیا کو برباد کر دیا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو کوئی طاقت زریا کو اس سے چھین نہ سکتی۔ اردوان کو فردوسی کے خیال سے نفرت ہو گئی تھی اور اس نے اسکو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔

اردوان چھوٹی سی عمر میں سخت سے سخت منزلوں سے گذر چکا تھا۔ بڑی بڑی مہمات سر کی تھیں مگر خوف و دہشت اسکے قریب نہ آئی تھی۔ اور اس رات وہ ایک کمزور ناتواں انسان سے نپٹنے کے لئے جا رہا تھا لیکن اس کا یہ عالم تھا کہ قدم مشکل سے اٹھ رہے تھے اور ہمت جواب دے رہی تھی پھر بھی وہ قوت ارادی کے بل پر چلا جا رہا تھا۔

دیوار پھاند کر فردوسی کے مکان کے اندر پہنچا تو ہاتھوں پیروں میں کپکپی پڑ گئی۔ اردوان ایک لحظے کے لئے ٹھہر کر اپنی بزدلی کو ملامت کرنے لگا۔ اور ہلکے قدم اٹھاتا ہوا بڑھ گیا۔ فردوسی خواب گاہ میں موجود نہ تھا۔ بستر خالی پڑا ہوا تھا۔ اردوان نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ برابر کے کمرے میں شمعیں روشن تھیں۔ اردوان درمیانی دروازے کو بہت آہستہ سے کھول کر اس میں داخل ہو گیا۔ یہ فردوسی کا دار التصنیف تھا جس کی دیواریں جنگی ہتھیاروں اور مشاہیر عالم کے مرقعوں سے مزین تھیں۔ شاہنامہ کے اوراق بکھرے پڑے تھے فردوسی ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں دبے ہوئے قلم کا اوپری سرا ماتھے پر ٹکا تھا اور فردوسی سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا اردوان نے اس کو مخاطب کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر خود اسکی

طرف سے پرسش کا انتظار کرنے لگا۔ مگر فردوسی کسی دوسرے عالم میں تھا۔ اردوان بالکل مقابل تھا۔ لیکن دراصل وہ اس کو دیکھ نہ رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں مگر بصارت خیال کی ہم آہنگ تھی۔ اور سامنے کی اشیاء نظر آنے کے بجائے تاریخ فارس کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔

اردوان شمشیر بکف سامنے پہونچ گیا۔ مگر فردوسی کو خبر نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح محو خیال رہا۔ فردوسی کو دیکھ کر اردوان کے تنفر کا جذبہ دوچند ہوگیا اور ایک للکار کے ساتھ اسنے ہاتھ کو بلند کر دیا۔ لیکن ایک خیال برق کی سی سرعت سے دماغ میں کوند گیا۔ کہ وہ اپنے نفس کے لئے بانئ وطن کے معمار کو قتل کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لغزش پیدا ہوگئی اور تلوار فردوسی کے بازو کو چھوتی ہوئی تکیہ کے ایک حصہ کو کاٹ گئی۔

فردوسی خواب و خیال سے چونک چکا تھا اور اردوان کی گرج پر غلام بیدار ہو گئے تھے۔ اردوان نے موقع پر ٹھہرنا خطرناک سمجھا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا فردوسی نے اس کو پہچان لیا تھا اور ناراضگی کا سبب معلوم کرنے کے لئے پکار رہا تھا اردوان نے اس کی آواز سنی مگر آل اندیشی نے توجہ کرنے نہ دی اور غلام جب تک فردوسی سے صورت حال سمجھکر اسکے تعاقب میں دوڑیں دوڑیں۔ اس سے قبل وہ مکان سے نکل کر ایک طرف کو جاچکا تھا۔

اردوان اتنا ناسمجھ نہ تھا کہ حالات کی نزاکت کو سمجھ نہ سکتا۔ فردوسی کے حملہ آور کے لئے غزنی میں کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ زیبا سے اردوان کی توقعات بھی ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسنے غزنی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور شہر پناہ کے قریب پہونچکر ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ صبح کو جیسے ہی پھاٹک کھلے وہ پہلا شخص تھا جسنے

غزنی کے باہر پہنچکر اطمینان کا سانس لیا۔

غلام اردوان کے پیچھے دوڑے، تو فردوسی نے ان کو روک دیا اور وہ آقا کا حکم پاکر پلٹ آئے۔ مگر ایک استعجاب سے اس کو دیکھنے لگے۔ اور تھی بھی یہ تعجب کی بات فردوسی نے ایک ایسے شخص کو نکل جانے کا موقع دلایا تھا۔ جس نے اس کی جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا مگر فردوسی جو کچھ سوچ رہا تھا غلاموں کی عقلیں وہاں تک نہ پہونچ سکیں۔ اگرچہ اردوان نے فردوسی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ لیکن فردوسی اس کو گرفتار کرانا تو درکنار زبان سے بھی نہ نکال سکتا وہ زیبا کا محبوب تھا۔ زیبا کو اس کا برا انجام گوارا نہ ہو سکتا اور وہ اس کے مقید ہونے یا قتل کئے جانے کو برداشت نہ کر سکتی۔ فردوسی کو اردوان کا خیال نہ تھا بلکہ وہ زیبا کے رنجیدہ ہونے سے خائف تھا۔ اسی لئے اس نے غلاموں کو روک کر اپنی جگہوں پر چلے جانے کے لئے کہہ دیا اور خود اردوان کی برہمی کے وجوہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

شرارت دماغ سے رخصت ہو چکی تھی فردوسی خوابگاہ میں آکر لیٹ گیا اور یکسوئی کے ساتھ سوچنے لگا کہ اردوان کو اس سے اتنی عداوت کیوں پیدا ہو گئی۔ جو قتل کے درپے ہو گیا۔ اس نے بہت غور کیا۔ لیکن کسی نتیجہ پر پہونچ نہ سکا۔ اور سوچتے سوچتے نیند میں آ گیا۔

علی الصباح زیبانے آکر بیدار کیا تو آنکھ کھلی وہ اردوان کو ڈھونڈھنے آئی تھی اور غلاموں سے شب کی روداد سن چکی تھی۔ فردوسی اٹھ کر بیٹھ گیا تو کہنے لگی کہ اس نے بہت برا کیا جو اردوان کو نکل جانے کا موقع دیا۔ ایسا ملت کش تختہ دار کا اہل تھا۔ فردوسی نے آنکھیں مل کر تحیر میں اس کو دیکھا۔ اور حسن برہم

اور بھی بھلا لگا۔ اس نے بلا توقف ارردان کے اس اقدام کے اسباب دریافت کئے۔ زیبا کے لئے اس کا جواب ذرا مشکل تھا مگر مناسبت کو دیا کردہ مختصراً کہہ گذری۔

"میں اپنے کو حضرت شاہنامہ کی خدمت کے لئے مختص کر چکی ہوں۔ ارردان کو کچھ اور بن نہ پڑا تو نفسانیت میں انتقام پر اتر آیا۔"

"ارے یہ تم نے کیا کیا زیبا؟ جوانی ان خیالی باتوں میں برباد نہیں کی جاتی" فردوسی ایک استعجاب میں تقریباً چیخ پڑا اور زیبا نے سر کو جھکا کر جواب دیا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے ———"

فردوسی اس کو سمجھانا چاہتا تھا مگر وہ الٹے قدم پلٹ پڑی اور نکلی ہوئی چلی گئی۔ فردوسی نے ارردان کو راہ راست پہ لے آنے کا عزم کر لیا اور منہ ہاتھ دھونے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ ناشتہ سے فراغت کر کے وہ زیبا کے مکان پر پہونچا وہاں ہر ایک کو ارردان کے واقعہ کا علم ہو گیا تھا۔ فردوسی نے کسی سے اس کا ذکر نہ کرنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ اس سے مستقبل میں غزنی کے دروازے ارردان کے لئے بند ہو جانے کا خطرہ تھا۔ زیبا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ فردوسی بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ زیبا کو اس وقت بوڑھے شاعر سے نگاہیں ملانے حیا سی آ رہی تھی۔ حالانکہ اس کے کوئی اسباب نہ تھے۔ نہ فردوسی اس کو اس نگاہ سے دیکھتا اور نہ وہ فردوسی میں کوئی جسمانی کشش محسوس کرتی۔ دونوں کی محبتیں تخیلی تھیں۔ پھر بھی زیبا کو محبوبیت کا احساس تھا اور اسی کے تقاضے سے وہ نظریں چرا رہی تھی۔ فردوسی نے بغیر کسی تمہید کے ارردان کا ذکر چھیڑ

دیا اور اس کے غصے کو برمحل قرار دینے لگا۔

اپنی خاطر زیبا کی قربانی فردوسی کے لئے موجب انبساط تھی اور محبت کی خود غرضی متقاضی تھی کہ وہ کوئی جنسی مقصد نہ رکھتے ہوئے بھی اس کی ہو کر رہے۔ مگر ضمیر اس کے برعکس کہتا تھا۔ زیبا کے شباب کو خاموشی سے گذر جانے کی اجازت دے دینا۔ فردوسی کا ایسا جرم ہوتا جس کے لئے وہ اپنے کو معاف نہ کر سکتا اس نے تاب گویائی کے بقدر زیبا کو سمجھایا کہ اس کا عزم تخلیق انسانی کے مقاصد کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں چند بار اسلام کا موضوع زیر بحث آ گیا۔ اور فردوسی نے اس کو اصل فطرت کے مطابق ثابت کرنے کے لئے ایسے روشن دلائل پیش کئے کہ زیبا جن سے انکار نہ کر سکی۔ فردوسی گھوم پھر کر پھر اپنے مطلب پہ آ گیا۔ زیبا اس کی علمیت اور قوت بیان کے سامنے بول نہ سکی۔ نفس معاملہ میں فردوسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ زیبا نے ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کی حامی نہ بھری۔ اور فردوسی کو کچھ اور نہ بنا تو روٹھ کر اٹھ آیا۔

فردوسی کا یہ ایسا حربہ تھا۔ زیبا کو جس کی تاب لانا آسان نہ تھا مگر کسی کی زوجیت اختیار کر لینا اس سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ وظیفہ اور شاہنامہ میں اتنی کھو چکی تھی کہ دوسرا راستہ اختیار کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اور شادی کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ دلچسپی کا مرکز بدل دیتی۔ فردوسی نے اگرچہ مختلف طریقوں سے باور کرانے کی کوشش کی کہ شادی کر کے بھی وہ اپنے مشاغل جاری رکھ سکتی ہے لیکن زیبا کی عقل تسلیم نہ کرتی اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ نوشابہ کے جانشین اور مصنف شاہنامہ کی محبوبہ بننے کے بعد وہ کسی کے نام

کو اپنے ساتھ نسبت دینا پسند نہ کرتی۔ اسی لئے فردوسی کے ناخوش ہو جانے پر بھی اپنے ارادے کو فسخ نہ کیا اور دل پر انتہائی جبر کر کے دو روز کاٹ لے گئی۔ دن بھر کرے میں پڑی ہوئی شاہنامہ کے اشعار پڑھا کرتی۔ اور تنہائی میں آنسو بہانے لگتی

فردوسی کے لئے بھی اس کا نہ دیکھنا کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔ مگر زیبا کا مستقبل بنانے کے لئے دل کی تڑپ کو دبا رہا۔ حالانکہ بعض اوقات اتنی بے چینی ہوتی کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر فرض کا احساس غالب آ جاتا اور وہ شعر شاعری میں اپنے کو بہلا لیتا۔

زیبا کو اردوان کو قبول کرنے میں ایک قباحت اور ہو گئی تھی۔ وہ ماہ رخ سے اس کے رشتہ کا تذکرہ کر چکی تھی۔ اور چھوٹی بہن کو ایک بار اردوان سے نسبت دے کر خود اپنے کو منسوب کرتے کراہیت معلوم ہوتی۔ فردوسی کا مطالبہ اردوان کے لئے نہ تھا وہ تو صرف زیبا کو ازدواجی زندگی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ شوہر کا انتخاب خود زیبا کی پسند پر تھا۔ لیکن زیبا فردوسی کی سطح پر اردوان کو بھی دیکھنا گوارا نہ کرتی تو کسی اور کا سوال ہی کیا تھا؟

ماہ رخ اور قابوس حالات سے انجان نہ تھے۔ اور زیبا کی حالت پر ان کے دل کڑھ رہے تھے۔ قابوس سے ضبط نہ ہو سکا وہ فردوسی کے خیال سے متفق بھی تھا۔ اس نے زیبا کو فردوسی کا کہنا مان لینے کی تلقین کی مگر وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ لینے کے سوا جواب نہ دے سکی ۔۔۔۔ زیبا کا کردار بادی النظر میں فطرت شباب کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ مگر بنظر غور دیکھا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اوائل عمر میں دوشیزگی سے محرومی نے ان کا جی زندگی سے

بسر کر دیا تھا مگر وہ کسی مقصد کے تحت زندہ رہی۔ اردوان کی محبت دل کے ایک گوشہ میں موجود تھی لیکن جوانی کی امنگیں سرد ہو چکی تھیں۔ کاموس ساسانی کی تلاش میں وہ آوارہ گردی کرتی رہی اور غزنی پہنچتے تک کسی الھڑ لڑکی کے بجائے ایک تجربہ کار عورت بن گئی اس کی رگوں میں دستگیر کا خون تھا جو ایرانی نسل ورنگ کا واحد محافظ کہا جا سکتا۔ شاہنامہ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وطن کی سربلندی کے نغموں اور فردوسی کی اعجاز بیانی نے بیخود کر دیا۔ طرفہ ستم یہ ہوا کہ زیبا سے نوشابہ کا رشتہ نکل آیا اور شکل وصورت کی مشابہت کے باعث فردوسی کی مجنونانہ گرویدگی نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ شاہنامہ کا خالق اس کی نگاہ میں قابل پرستش تھا۔ مگر وہ خود جب اس کے سامنے محبت کے سجدے کرنے لگا تو محبوبیت کی شان زیبا کا مقصد حیات بن گئی اور ناکارہ زندگی کا ایک مصرف پیدا ہو گیا۔ کاموس ساسانی کے انتقام میں ماخوذ ہو کر بھرے دربار میں جب اردوان سے سامنا ہوا تو ایک لحظہ کے لئے دل میں دبی ہوئی چنگاریاں ابھر آئیں۔ لیکن فی الفور وہ سنبھل گئی اور بھولی ہوئی بات کو بھول میں ڈالنے لگی۔ جس میں اس کو کامیابی ہو گئی اور گھریلو زندگی میں اردوان سے خلا ملا بھی قدموں کو ڈگمگا نہ سکا۔ اس کے مزاج میں حد سے زائد سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی اور سطحی وجذباتی باتوں سے نفرت سی تاہم اردوان سے اس کو ہمدردی تھی اور اسی لئے اس نے ماہ رخ کو اس کے لئے تجویز کیا تھا۔

ماہ رخ کے شباب کا ابتدائی دور تھا۔ بڑی بہن کی تحریک پر اس نے اردوان کو ایک مخصوص زاویہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا اور اس کا مردانہ حسن ماہ رخ کی نگاہوں میں کھپ گیا ——— ماہ رخ کو زیبا کے حالات سے واقفیت تھی۔ وہ یہ بھی جانتی

تھی کہ زیبا اردوان کی منگیتر تھی۔ اس کو اس حقیقت کا بھی علم ہو گیا تھا کہ اس کی بہن نے دل شکستہ ہو کر شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ زیبا نے جب اس سے اردوان کے لئے اعتراض کیا تو اس کے جی میں آیا کہ خود بہن کو اپنے غلط ارادے سے باز رکھنے کی سعی کرے لیکن اس کی نگاہیں دیکھ چکی تھی کہ قابوس کی کوشش بیکار گئی۔ اس کے سوا جذبۂ اطاعت نے زبان کھولنے کی اجازت نہ دی اور اس نے زیبا کے فرمان کو نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا۔

چند روز کے تخمین میں ماہ رخ اپنے کو اردوان سے بہت قریب محسوس کرنے لگی گر نسبت پختہ ہو گئی، نوبت نہ آ سکی اور وہ وقوعہ پیش آ گیا کہ زیبا کے گھر میں ایک سنجیدہ فضا نظر آنے لگی۔ ماہ رخ کے دل میں اردوان کے لئے طوفانی کیفیت پیدا تھی گر قابوس کی مساعی رائیگاں جانے کے بعد ماہ رخ اپنے کو روک نہ سکی اور زیبا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں پر آب تھیں اور لب تھر تھرا رہے تھے۔ زیبا سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنے کے لئے آئی ہے۔ گہ پیاری بہن کو خواہرانہ جوش میں اس نے آغوش میں لے لیا اور وفورِ محبت میں پیشانی چوم لی۔ نہ ماہ رخ نے کچھ کہا اور نہ زیبا کے کان کچھ سن سکے۔ مگر حقیقت میں کہنے والے نے کہہ بھی دیا اور سننے والے نے سن لیا۔ زیبا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور کپڑے پہن کے غلام کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ ماہ رخ نے اس کو جاتے دیکھا دل میں تپک سی ہونے لگی مگر وہ اس کو دبا کر مسکرا پڑی۔

ایک رات اردوان اپنی ہوئی تلوار ہاتھ میں لئے فردوسی کے دار التصنیف میں داخل ہوا تھا۔ مگر خوت کے فن کار پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ زیبا سورج کی روشنی میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن جیسے ہی فردوسی کی نگاہ اس پہ

گئی۔ وہ بیقرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پھیل گئے۔ مگر فوراً خیال آ گیا کہ وہ چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس نے ہاتھوں کو گرا لیا۔ ادھر زیبا کے ترحم اللہ گورہ گئے۔ اللہ دو موتی پلکوں پر چھلک کر گر پڑے۔

فردوسی اس کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس کا مطالبہ منظور ہو گیا۔ مگر زیبا کے اشکوں نے مسرت کا لطف نہ لینے دیا اور اس کی زبان سے نکل گیا۔ "تم روتی ہو زیبا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں تمہارے آنسو نہ دیکھ سکوں گا ———"

"میرے چند آنسوؤں کو آپ نہیں دیکھ سکتے اور عمر بھر سسکنے کا حکم دیتے ہیں؟"

زیبا نے گلوگیر آواز میں کہا اور فردوسی نے اس سے متاثر ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"فلسفیانہ اعتبار سے رنج و راحت میں کوئی فرق نہیں۔ صرف زاویہ نظر کی بات ہوتی ہے مگر دنیا میں دونوں باتوں کا جدا جدا معیار ہو گیا ہے اور اسی پر وہ پرکھے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں جو چیز باعث مسرت ہو سکتی ہے۔ تم اس کو موجب الم قرار دیتی ہو لہٰذا اس کا فیصلہ بغیر آزمائش کے نہیں ہو سکتا کہ تمہارا کہنا صحیح ہے یا میں حق بجانب ہوں۔"

"آپ کے فرمان پر میں اس آزمائش سے گذرنے کے لئے تیار ہوں ———"

زیبا نے سر جھکا کر کہہ دیا مگر وہ پھر آبدیدہ ہو گئی۔ اور فردوسی اس کو ایسی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ جس میں دل کی دھڑکنوں اور بزرگانہ شفقتوں کا امتزاج تھا۔

باب (۱۷)
آخری فریضہ

ماہ رخ نے بڑی بہن کے لئے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا۔ حالانکہ اردوان کی تصویر اس کے لوح دل پر پختہ ہو چکی تھی، مگر زیبا کے لئے صرف حسرتوں کا خون ہی نہیں، وہ جان تک قربان کر سکتی ماہ رخ کو مسرت تھی کہ زیبا کے ایک وعدے کی بدولت زیبا اور شاعر اعظم کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے اور زیبا یک گونہ سرشاری میں دن گذار رہی تھی۔

اردوان کا کوئی پتہ نہ تھا کہ وہ کس طرف کو گیا؟ فردوسی نے اس کی بابت مشہور کرا دیا تھا کہ زیبا سے ناراض ہو کر نکل گیا۔ لوگوں کو اس خبر پر تعجب تھا۔ مگر یقین نہ کرنے کا کوئی سبب بھی نہ تھا۔ لہذا بات اسی طرح پھیل گئی۔ مالک سلطان کے ہمراہ نہ گیا تھا فردوسی نے اس سے اردوان کا سراغ لگانے کے لئے کہا۔ اور اس نے اطراف میں آدمی بھی دوڑائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اردوان شاید غزنی سے بہت دور پہنچ گیا تھا

زیبا کے حسن جہاں تاب نے غزنی میں بہت سے شگوفے کھلائے تھے۔ کتنے ہی دلوں میں ہما و ہوس کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ مالک کے دل میں بھی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود تھی مگر وہ اتنے چھچھورے ظرف کا انسان نہ تھا کہ آہیں بھرنے لگتا

مجبوری کا نام صبر سمجھ کر اس نے اپنے کو تسلی دے لی تھی اور حسن کو محض دیکھنے کی چیز قرار دے کر محبت کا ایک معیار بنا لیا تھا۔ جس سے کبھی تجاوز نہ ہوا۔ اس کی نگاہوں نے ہر نظارے پر داد حسن دی۔ لیکن لبوں نے کبھی اظہار تمنا نہ کیا اور دل کا راز دل تک محدود رہا۔ حتیٰ کہ زیبا کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ ماہک بھی اس کے لئے کوئی خیال رکھتا تھا

فردوسی۔ قابوس اور ماہ رخ: اردواں کو تلاش کرانے کی فکر میں تھے۔ زیبا بھی بظاہر اس کی واپسی کی منتظر تھی۔ مگر خود کوئی دلچسپی نہ لیتی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نسائیت نے لبوں پر مہر لگا دی ہو۔ اور دوسرا یہ کہ وہ چاہتی نہ ہو کہ اردواں واپس آ کے اور بادل ناخواستہ اس کو رشتہ ازدواج میں آنا پڑے۔ وجوہ کچھ بھی ہوں مگر زیبا اردوان کے معاملہ میں بے تعلق تھی۔ شاہنامہ اور فردوسی اس کی دلچسپیوں کا محور بنے ہوئے تھے۔ جن پر وہ گردش کر رہی تھی۔

وقت گذرتا رہا۔ اردواں پلٹ کر نہ آیا اور نہ اس کا کوئی پتہ ہی لگ سکا۔ فردوسی نے جستجو میں کوتاہی نہ کی۔ مصنف شاہنامہ کی حیثیت سے وہ بڑے امرا سے اس کے تعلقات ہو گئے تھے۔ ان کو اس نے خطوط لکھے۔ اسمٰعیل وراق کو ہرات میں ڈھونڈھنے پر توجہ دلائی اور جوابات کا انتظار کرنے لگا۔

نرگس کی شادی کی اطلاع ملنے کے بعد فردوسی نے چند روز کے لئے طوس جانے کا ارادہ کیا تھا مگر زیبا نے اپنی طرف الجھا لیا۔ اور پدری محبت و جذبات کی کشمکش میں کوئی یکسوئی نہ ہو سکی ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاہنامہ میں قابل قدر اضافہ ہو جائے تو سلطان سے کہنے کا موقع بھی ہو۔ عزم تکمیل کا محتاج رہا۔ اور دن گذرتے گئے یہاں زمانہ میں زیبا کا موس سامانی کے قتل میں گرفتار ہو گئی۔ اور فردوسی کو اس کے

سوا کچھ یاد نہ رہا۔ اس قضیہ سے چھٹکارا ملا تو زیادہ عرصہ سکون سے نہ گزر سکا اور اردوان کے فرار نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی۔ فردوسی نے اردوان کی تجسس میں کوئی فروگذاشت نہ کی تھی۔ مضافات میں تمام شناساؤں کو خطوط روانہ کر دیئے تھے پھر بھی سلطان کی واپسی کا منتظر تھا کہ وہ آ جائے تو اجازت لے کر وطن جائے گا۔ اور اسی سلسلہ میں بلخ، بخارا اور ہرات تمام مقامات پر تلاش کرے گا۔

کافی انتظار کے بعد غزنی میں سلطان کے پہنچنے کا غلغلہ ہوا اور فردوسی بھی امیر نصر اور دوسرے عمائدین کے ہمراہ بیرون شہر خیر مقدم کے لئے آ گیا۔ سلطان پورے تزک و احتشام کے ساتھ واپس ہوا تھا بہی خواہوں کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ایک ایک سے بغلگیر ہونے لگا۔ فردوسی کے قریب پہونچا تو گلے مل کر مزاج پرسی کی اور زیبا کی خیریت دریافت کی۔ فردوسی نے الحمد للہ کہہ کر اطمینان دلا دیا اور سلطان دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

سلطان کا ورود اہلیان غزنی کے لئے مسرت و شادمانی کا پیغام بر تھا اور سب سے زیادہ خوشی فردوسی کو تھی وہ بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مگر مقدر کو اس سے ہمیشہ کی ضد تھی اس نے جب کبھی جو کچھ سوچا وہ پورا نہ ہوا اگر بار رہا ہر کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن نظم سلطنت کے ایک انقلاب نے فردوسی کو وہ صدمہ پہونچایا کہ طوس جانے کا خیال تو درکنار غزنی میں اس کی بقا ہی مشکوک ہو گئی خواجہ بزرگ اور ابو سہل کی سازش سے سلطان فضل اسفرائنی وزیر اعظم سے بدظن ہو گیا۔ اور ایک مفروضہ رقابت کی بنا پر اس کو معزول کر دیا۔ فضل کی معزولی ہی فردوسی کے لئے تکلیف دہ تھی۔ نہ کہ اس کے بجائے بزرگ احمد بن حسن میمندی کا تقرر

فردوسی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اس کو اپنے قدم جمے رہنے میں بھی شک ہونے لگا۔ بزرگ احمد کے برسرِ اقتدار آتے ہی اس کے ہوا خواہوں کا انداز بدل گیا۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی سے بحال تھے۔ ابو سہل دبیر خاص کے عہدے پر فائز ہی تھا۔ سلطان کی نظر عنایت سے بزرگ احمد نے فائدہ اٹھایا اور اپنے تمام آدمیوں کو اچھے اچھے منصبوں پر مقرر کرا دیا۔

ابو سہل اب تک زیبا کو بھلا نہ سکا تھا مگر فضل کی پشت پناہی اور زیبا کی قسمت کی یاوری نے اس کا ہر حربہ بیکار کر دیا تھا۔ فردوسی سے بھی اس کو بغض تھا۔ اس کو زک نہ پہنچا سکنے پر اکثر وہ اپنے غصہ میں کھولا کرتا اور زیبا و فردوسی کے نام پر دانت پیس کر رہ جاتا ——— بڑھے فردوسی سے عناد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کثافت کے باعث وہ زیبا کو اس سے ملوث قرار دیتا اور اپنی محرومی پر اس کو خوشحال دیکھا رہ جاتا۔

بزرگ احمد کے خیالات بھی ان فنکاروں کی طرف سے اس قبیل تھے اور فردوسی کو نیچا دکھانے کے لئے وہ دوسرے شعراء کی بیجا حمایت کیا کرتا مگر عزت ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے وہ جس کو سربلند کرنا چاہے۔ اس کو کوئی گرا نہیں سکتا۔ فردوسی کو قائم ازل سے ایسی استعداد ملی تھی کہ ہر امتحان میں وہ سرخرو رہا۔ اور حریفوں کو منہ کی کھانا پڑی۔ محمود کے بجائے کوئی اور بادشاہ ہوتا تو شتر گربہ دوانی خالی نہ جاتی مگر محمود ایک ذی علم اور دانشمند سلطان تھا۔ فردوسی کی صلاحیت کے سامنے اس نے کہنے پر اعتناء نہ کی اور اس کی قدر افزائی کرتا رہا۔

وزارت کی تبدیلی پر فردوسی کو خطرات کا احساس ہونے لگا۔ کیونکہ دربار میں

اس کے طرفداروں کی رتّی گھٹ گئی تھی لیکن اس کے پرانے مربی امیر نصر نے ہمت افزائی کی اور ڈھارس بندھائی کہ بزرگ احمد اور ابوسہل اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے سلطان خود مرتبہ شناس ہے اور وہ باتوں میں آ بھی گیا تو اس کو سمجھا دیا جائے گا۔ فردوسی کی تسلی ہو گئی۔ اور اس نے زیبا کا ذکر کیا۔ نصر نے زیبا کے لئے بھی اطمینان دلا دیا اور فردوسی چوکنا رہ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ مگر بزرگ احمد انتہائی دانا اور مدبر تھا۔ پچھلے تجربات کے تحت وہ کوئی چھچھورا وار کرنا نہ چاہتا تھا اس نے اپنی پالیسی غیر جانبدارانہ رکھی اور آہستہ آہستہ فردوسی اور زیبا دونوں اس سے مطمئن ہو گئے۔

فردوسی کو نضل کی معزولی کا بہت رنج تھا مگر وہ اس کی مدد ہی کیا کر سکتا تھا ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے مخلص اور کرم فرما کے لئے جو کچھ امکان میں تھا اس سے اس نے پہلو تہی نہیں کی اور شاہنامے کے دامن پر فضل کے لئے وہ الفاظ چھوڑ گیا۔ جنھوں نے ایک معتوب اور مقہور وزیر کے نام پر مہر دوام لگا دی۔

طبیعتیں اس تبدیلی کی خوگر ہوتی جا رہی تھیں۔ فردوسی نضل کو بھلا تو نہ سکا مگر نگاہیں اس کی جگہ پر بزرگ احمد کو دیکھنے کی عادی ہو گئیں یہی صورت زیبا کی بھی ہوئی وہ بھی شروع شروع میں نئے وزیر کی طرف سے مشتبہ رہی پھر اس کا خطرہ بھی دور ہو گیا۔

فردوسی کا جلوس کا پروگرام التوا میں پڑ گیا مصلحت غزنی چھوڑنے کی اجازت نہ دیتی کیونکہ بزرگ احمد اور ابوسہل اگرچہ بادی النظر میں خاموش تھے مگر فردوسی کی عدم موجودگی میں اس کا امکان تھا کہ وہ سلطان کے کان بھر دیتے اس لئے فردوسی نے مرکز نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہنامہ پایۂ تکمیل کے قریب تھا

فردوسی نے اپنی رفتار کچھ بڑھا دی کہ جلد سے جلد اس کو ختم کر کے معاوضہ لے کر جائیگا اس سلسلہ میں اس نے امیر نصر اور زیبا سے بھی مشورہ کیا انھوں نے بھی یہی رائے دی اور وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا۔

اردوان کے متعلق تفصیل وراق اور دیلمی امراء کے خطوط آ گئے تھے۔ انھوں نے ہرات و بخارا وغیرہ میں اس کے موجود نہ ہونے کی اطلاع دی تھی۔ فردوسی اس سے کچھ متفکر تھا وہ زیبا کی سونی زندگی میں چہل پہل دیکھنے کا آرزومند تھا اور اس مقصد میں ناکامی اس کے لئے باعث رنج تھی۔ قابوس اور ماہ رخ بھی اسکی فکر میں شریک تھے لیکن بات کسی کے اختیار کی نہ تھی۔

ادنیٰ غلام قابوس کافی بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے تن تنہا تلاش میں نکلنے کا عزم ظاہر کیا مگر فردوسی نے اس کو روک دیا کہ وہ کہاں مارا مارا پھرے گا۔ اپنے خطوط کا حوالہ دے کر اس نے کہا کہ جن جن جگہوں کا پتہ اس نے لکھا ہے وہاں اگر اردوان پہنچ جائے گا تو غزنی بھیج دیا جائے گا۔ قابوس نے اس جواب کو کافی نہ سمجھا اور رخت سفر باندھ کر تیار ہو گیا۔

زیبا، ماہ رخ اور فردوسی سب نے منع کیا لیکن وہ دستگیر کی دونوں بچیوں کو ان کے گھر کا کر دینا اپنا آخری فریضہ سمجھتا۔ اس سفر سے کہنے کو اردوان کی تلاش مقصود تھی مگر حقیقت میں وہ ماہ رخ کے لئے کسی شوہر کے انتخاب کی خاطر جا رہا تھا۔ شادی کے لئے دستگیر کی شرط اتنی سخت تھی جس کی پابندی غزنی میں رہ کر ممکن نہ ہوتی۔ بلخ و بخارا میں کچھ لوگ اس کے علم میں تھے۔ جن کا خیال دماغ میں لے کر وہ اٹھا تھا۔ زیبا نے جب اس کو رکتے نہ دیکھا تو خود اسباب سفر فراہم کر دیا اور

ایک صبح کا نی زادراہ ساتھ کر کے رخصت کر دیا۔

قابوس زیبا و ماہ رخ کا غلام نہ تھا۔ دستگیر کا جانشین تھا۔ یزدان داد کی لڑکیوں کو اس کی ذات سے باپ اور نانا دونوں کی محبتوں کا لطف ملا تھا اور انھوں نے آنکھیں کھول کر اسی کو دیکھا تھا۔ زیبا تو خصوصیت کے ساتھ اس سے بہت مانوس تھی۔ زیبا کی عمر بائیس تیئس سال کی ہو گئی تھی اس مدت میں ایک دن کے لئے وہ اس سے جدا نہ ہوئی تھی۔ یہی عالم ماہ رخ کا تھا۔ دونوں بہنیں اس کو رخصت کر کے باچشم پر آب اپنے اپنے کمروں کو جا کر پڑ رہیں۔ فردوسی کو آنے میں دیر ہو گئی تھی وہ اس وقت آکر پہونچا۔ جب قابوس کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ گذر چکا تھا۔ مکان میں داخل ہو کر سیدھا زیبا کے کمرے میں چلا گیا اور اس کو اشکبار پا کر سمجھانے لگا۔ زیبا آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی تو فردوسی نے ماہ رخ کو دریافت کیا زیبا نے اس کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور فردوسی وہاں سے اٹھ کر ماہ رخ کے پاس پہونچ گیا۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ جس کا مشاہدہ ابھی فردوسی زیبا کے کمرے میں کر چکا تھا۔ ماہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر وہ زیبا کے پاس لے آیا۔ مگر ماہ رخ کو سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس نے خود اپنے کو سنبھال لیا۔ اور پھیکی پھیکی ہنسی ہنستی ہوئی بہن کے پاس آبیٹھی۔

فردوسی کو بھی قابوس کی جدائی کا قلق تھا وہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا اس کی عزت کرتا مگر قابوس ایسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ جس کے مقاصد نیک تھے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے جو نہایت ضروری تھے اسلئے متاثر ہونے کے بجائے وہ کامیابی کی دعا کرنے لگا۔ اور دونوں لڑکیوں سے اسی کی باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا تو

زیبا دماہ رخ کو سہ پہر کو اپنے گھر آنے کے لئے کہہ گیا۔ زیبا تو اس کی قربت کا موقع ہی ڈھونڈھا کرتی اس نے خوشی خوشی وعدہ کرلیا اور فردوسی چلا گیا۔

فردوسی کا وقت مقابلتہً زیادہ قیمتی بن گیا تھا وہ شاہنامہ کو جلد ختم کر دینا چاہتا لیکن زیبا کی دلجوئی کے لئے اس نے وقت نکال لیا اور ان کی نشست صبح و شام ہونے لگی۔ اس یکجائی سے فردوسی کی چند ساعتیں بیکار صرف ہو جاتیں مگر اس کا ایک افادی پہلو بھی تھا۔ زیبا کا ہر تقرب فردوسی کے جذبات میں ایک تازہ تخلیق کر دیتا اور شعریت اس حد تک پیدا ہو جاتی کہ اس کے جانے کے بعد فردوسی قلم لے کر بیٹھتا تو اشعار ایک روانی سے نکلنے لگتے اور گھنٹوں کا کام لمحات میں ہو جاتا۔

وقت اسی طرح کٹتا رہا۔ شاہنامہ کے اوراق سیاہ ہوتے رہے وہ دن بھی آ گیا، جب فردوسی اپنے شاہکار کا آخری باب لکھنے لگا۔ اور تیس سال کی محنت ٹھکانے لگنے کے آثار پیدا ہو گئے۔

باب (۱۸)

شاہنامہ کا صلہ

محمود بار بار اپنے قہار لشکر کے ساتھ غزنی سے نکلا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوا۔ سبکتگین کا محل کتنی ہی مرتبہ چراغاں میں بقعہ نور بنا۔ غزنی کے گلی کوچے آراستہ ہوئے دربار میں شعراء نے قصیدہ خوانی کی۔ رقاصوں کے فن کار نے بھی اپنے جوہر دکھائے اور بزرگ احمد اور ابو سہل کے سر دشمنوں سے خراج تحسین لے کے رہا۔ حتی کہ وقت کے محمود نے رات دن کے تواتر سے ۳۹۵ھ ہجری کو پورا کر دیا اور حکیم ابوالقاسم فردوسی نے قرآن عجم کی آخری بیت لکھ دی۔

زیبا تنہا اس مسلک پر پہلے سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کی آواز کا درد اور لہجہ کا سوز بلاشبہ سحر آفریں بن چکا تھا۔ اس زمانے میں محمود کی صحبتوں میں اس کے مجرے یادگار رہے تھے۔ رقص میں اس کے فن کا مظاہرہ کمال کے اس درجہ پہنچ چکا تھا کہ سلطان نے اپنی انگوٹھی اس کو انعام میں دے دی تھی اور گانے میں تو محفل کی محفل بت بن کر رہ گئی تھی۔ زیبا کی کامیابی کا راز اس کی ذاتی مدہوشی تھی۔ رقص کے ہنگام وہ رقص میں گم ہو جاتی اور گانے کے وقت اس پر ایسی

خود فراموشی طاری ہوتی کہ وہ سراپا نغمہ نظر آتی۔ فردوسی بھی اس کی یہ کیفیت دیکھکر اکثر از خود رفتہ ہو جاتا اور اس کو اپنے اشعار کا صحیح لطف آنے لگتا۔

قابوس کو گئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اس کے کئی خط بلخ بخارا اور ہرات سے آئے تھے جس میں اس نے اردوان کے نہ ملنے کی اطلاع دی تھی اور بعض مقاصد کے تحت کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر جانے سے باخبر کیا تھا۔ زیبا کی توجہ اردوان کی طرف سے اور کم ہو گئی تھی۔ مگر وہ قابوس کی جلد واپسی کی خواہاں تھی۔ چنانچہ آخری خط جو اس نے قابوس کے نام ہرات سے روانہ کیا تھا۔ اس میں اصرار کیا تھا کہ وہ خط ملتے ہی غزنی کے لئے روانہ ہو جائے فردوسی نے جس دن شاہنامہ کو مکمل کیا۔ وہ دن زیبا کے لئے اس کی زندگی کا یادگار دن تھا۔ وفور عقیدت میں اس نے فردوسی کے ہاتھوں کو چوم لیا اور اس کی نگاہیں بوڑھے فنکار کے چہرے کی جھریوں پر جم کر غائب ہو گئیں۔ فردوسی نے زیبا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ نوشابہ کا پیار اور محبوبیت کا غرور ان میں موجود تھا۔ فردوسی نے نوشابہ کی فرمائش کی تعمیل کر دی تھی نوشابہ زندہ ہوتی تو گھر بھر میں ناچتی گھومتی۔ فردوسی کی نظریں افکار مسلسل کی داد دینے کے لئے اس کو ڈھونڈھ رہی تھی اور پینتیس چالیس سال قبل طوس کے مکان میں اس کے ملکوتی جمال کا تصور کر رہی تھیں۔ زیبا نے اس کو زیادہ دیر ملول و مخزون نہ رکھا اور اپنے وجود سے ہر کمی کو پورا کر دیا۔ آنکھوں سے اخلاص و محبت اور لبوں سے تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی آئی اور شاہنامہ کے مکمل ہو جانے کا جشن کر اس عمل کا مظاہرہ کر دیا۔ فردوسی جس کی آرزو میں نوشابہ کا جی یا تھا۔ فردوسی کو محسوس ہوا کہ زیبا کے پیکر میں نوشابہ کی روح مسکرانے لگی مگر فی الفور اس کو وطن میں منتظر بیٹی کا خیال آ گیا اور وہ جلد سے جلد شاہنامہ کا صلہ لے کر طوس روانہ ہو جانے کی سوچنے لگا

غزنی میں فردوسی کے مخصوصین میں یوں تو بہت سے آدمی تھے مگر بالعموم لوگوں میں صرف دو ذاتیں تھیں جن کو شاہنامہ کی تکمیل کی وہی مسرت ہوئی جو بہی خواہوں کو ہو سکتی تھی ایک امیر نصر بن سبکتگین۔ دوسرا ایک ندیم سلطانی ان میں سے غائبانہ طور پر یہ خبر سلطان کے کان میں ڈال دی اور سلطان کو بھی اس سے خوشی ہوئی۔ ایک روز کے وقفہ سے فردوسی کا شاہکار نظروں کے سامنے آگیا اور سلطان اس کو بے پناہ خوشنودی کے ساتھ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

فردوسی اس لئے نازاں تھا کہ اس نے بہرام[1] چوبین کی اولاد کے خواب کی تعبیر پیش کی تھی۔ سرزمین ایران اس لئے سرخرو تھی کہ اس کے مایہ ناز سپوت زندہ جاوید بن گئے تھے۔ محمود اس لئے بشاش تھا کہ اس کے ہاتھوں وہ کام انجام پایا تھا۔ آل سامان جس کی آرزو میں مر گئے اور اپنی کدوکاوش کا نتیجہ دیکھ سکے۔

شاہنامہ کی شہرت یوں تو ایران و ترکستان ہر طرف پھیل چکی تھی دربار غزنی نے ملک الشعراء کا خطاب عنصری کو دیا تھا مگر فردوسی کی مقبولیت اس کو "خدائے سخن" ہونے کا تاج پہنا چکی تھی۔ شاہنامہ کے اشعار غزنی کی سرحدوں کو پار کرکے دور دور پہنچ چکے تھے اور عقیدت مند طوس کے فنکار کو تحفہ تحائف بھیج کر عقیدت کا ثبوت دیتے رہتے۔ سلاطین دیلم خصوصیت کے ساتھ بہت قدردان تھے۔ فردوسی نے جب رستم و سہراب کی داستان نظم کی تھی تو فخر الدولہ دیلمی نے ہزار اشرفیاں بھیجی تھیں اور فردوسی کو اپنے وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اسی وقت سے فردوسی سے دیلمیوں کے تعلقات بھی تھے اور خط و کتابت ہوتی رہتی۔ اہالیان غزنی خود سلطان اس کی منزلت سے واقف تھے اور اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ شاہنامہ کی

[1] آل سامان بہرام چوبین کی نسل سے تھے

تکمیل سے اس میں اضافہ ہوگیا اور غزنی کے در و دیوار فردوسی کی تعظیم میں سر و تند کھڑے ہونے لگے۔

امیر نصر نے اس مسرت میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا جس میں زیبا کی زبان سے شاہنامہ کی کئی داستانیں سنی گئیں، اور زیبا نے بھی پورے جذبات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جلسہ کے اختتام پر امیر نصر کی طرف سے دعوت ہوئی جس میں خوش ذائقہ کھانوں سے ضیافت کی گئی۔

فردوسی اپنا مقصد زندگی پورا کر چکا تھا صرف ایک آرزو باقی تھی کہ اپنی کمائی سے نوشابہ کی لاڈلی فرنگیس کو تمول کی زندگی بسر کرتے دیکھ سکے۔ اس کے اسباب فراہم ہو چکے تھے۔ محمود کے قول کے مطابق شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار کا معاوضہ ساٹھ ہزار دینار غزنی کے خزانے پر واجب ہو چکے تھے۔ شاہنامہ پیش کرنے کے بعد سے فردوسی کو اس رقم کی وصولیابی کی فکر ہوگئی۔ اور اس نے امیر نصر اور ایاز کو توجہ دلائی کہ وہ سلطان سے اس کی ادائیگی کے لئے عرض کریں۔

ایک روز دربار گرم تھا۔ منصب دار اپنی اپنی جگہوں پر فروکش تھے۔ ایاز نے سلطان کا مزاج موزوں پاکر فردوسی کی خواہش گوش گذار کر دی اور امیر نصر نے سفارش کی کہ معاوضہ اس کو مرحمت کر دیا جائے۔ تاکہ وہ وطن جا کر دل کا حوصلہ نکال سکے۔ محمود نے بلا توقف ابوسہل کی طرف دیکھا اور ساٹھ ہزار دینار دئے جانے کا حکم جاری کرنے کی ہدایت کر دی۔

فردوسی سے محمود کے سوءِ ظن کے بارے میں مورخین نے مختلف وجوہ لکھے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک وجہ عقیدہ کا اختلاف بھی ہے۔ لیکن عقیدے کے اختلاف کے

بجائے یہ سبب زیادہ قرین عقل ہے کہ سلاطین دیلم محمود کے سیاسی حریف تھے اور فردوسی سے ان کے مراسم تھے۔ محمود کو اس کی یہ روش کسی طرح نہ بھاتی مگر وہ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا مناسب نہ سمجھتا۔ اس لئے خاموش رہتا۔

فردوسی سے محمود کے دل میں میل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں حسب نسب اور شرافت کو پورے زور قلم سے لکھا تھا۔ یہ اشعار جب دربار میں پڑھے جاتے تو محمود کی نگاہ جھک جاتی۔ وہ ایک غلام زادہ تھا۔ فردوسی کے اشعار پر اس کو اپنی نسبی کمزوری کا احساس ہوتا مگر کچھ کہہ نہ سکتا اور نہ اس کو فردوسی کی نیت پر شک ہوتا تاہم وقتی طور پر ایک ناگواری پیدا ہو جاتی گو اس کا اثر دیرپا نہ ہوتا۔ پھر بھی ایک بات خیال میں رہ جاتی۔

ابوسہل اور بزرگ احمد میں شاہنامے کے صلے کی بابت پہلے ہی مشورہ ہو چکا تھا اور انھوں نے باہم طے کر لیا تھا کہ جس طرح بنے گا وہ فردوسی کو اس کے حق سے محروم کرا دیں گے۔ چنانچہ جب محمود نے ابوسہل کو ساٹھ ہزار دینار کا حکم لکھنے کے لئے کہا تو وہ بزرگ احمد کا منہ دیکھنے لگا اور آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرنے لگا۔ بزرگ احمد سلطان سے کچھ عرض کرنے کے لئے اجازت خواہ ہوگیا۔ سلطان نے اجازت دیدی تو اس نے فردوسی کو اس گرانقدر عطیے کے لئے نااہل بتایا اور دیلمیوں سے ساز باز رکھنے والے شخص کو حکومت کا دشمن قرار دیا۔ محمود نے بزرگ احمد کی رائے سے اتفاق کیا مگر اس کے اس مشورے سے متفق نہ ہوا کہ فردوسی کو اس کا حق نہ دیا جائے کیونکہ محمود کو قول کا پاس تھا۔ اور دئے ہوئے الفاظ سے روگردانی وہ اپنے شایان شان نہ سمجھتا۔ بزرگ احمد کا وار خالی جاتے دیکھ کر ابوسہل دست بستہ ہو کر کہنے لگا۔

"بے ادبی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

سلطان نے سر کی جنبش سے اجازت دے دی تو اس نے کہا۔

"انعام دینے سے قبل جلالت مآب کو یہ بھی ملاحظہ کر لینا چاہیے کہ جس چیز پر انعام دیا جا رہا ہے وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں؟"

ابو سہل کے جملوں سے محمود کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ اس کے بجائے یہ الفاظ کسی اور کی زبان سے نکلے ہوتے تو دربار سے اٹھا دیا جاتا مگر ان کا کہنے والا ابو سہل تھا جو سلطان کا مقرب خاص اور سلطنت کا وفادار تھا۔ انتہائی ناگوار گذرنے کے باوجود محمود نے خفگی پر اکتفا کی اور بولا۔

"ابو سہل، تم کتنے تنگ نظر ہو گئے ہو۔ تمہارے نزدیک شاہنامہ ایسی تصنیف نہیں ہے جو انعام کی مستحق ہو!"

"مجھے شاہنامے کے محاسن کا اعتراف ہے۔ لیکن اس کی نوعیت سے اختلاف" ابو سہل نے سلطان کی برہمی کا اثر لئے بغیر کہا اور سلطان نے دریافت کیا۔

"تم اپنے مطلب کو واضح کرو ــــــــــ"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس کتاب پر اگر یمین الدولہ سلطان محمود کے بجائے خاندان کسریٰ کا کوئی تاجدار انعام دیتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ محمود اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابو سہل نے سلسلۂ کلام میں اضافہ کیا۔ شاہنامہ کے کم بیش پچاس ہزار اشعار زردشتیوں کے قصص و حکایات۔ مجوسیوں کے افسانوں، شاہان سلف کے کارناموں پر مشتمل ہیں اور بلاشبہ ان کا مقصد فارس کے قدیم تمدن کو اچھالنے کے سوا نہیں ہو سکتا۔ جس سے اسلام اور اہل اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔

اور ایک مجاہد سلطان کو زیب نہیں دیتا کہ ایسی غیر اسلامی تصنیف کو بیش بہا عطئے سے سرفراز کرے۔" ابوسہل نے ایک لحظہ دم لیکر کہا۔" مجھے اندیشہ ہے کہ عالم اسلام میں سلطان جہاں پناہ کو مطعون نہ کیا جائے اور بات کہنے میں نہ آئے کہ سلطان محمود نے آتش پرستوں کے تمدن کو زندہ کرنے کے لئے خزانہ کا منہ کھول دیا۔" محمود ہمہ تن توجہ سے اس کا کلام سن رہا تھا۔ ابوسہل نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" انعام کے مستحق وہی دس بارہ ہزار اشعار ہو سکتے ہیں جو فردوسی نے اسلام اور سلاطین اسلام کے بارے میں کہے ہیں اور وہ بھی دینار کے بجائے درہم کے اہل ہیں۔"

ماہک اور امیر نصر پہلو بدل رہے تھے لیکن ان کو مداخلت کا محل نہ تھا۔ ابوسہل کا جادو چل چکا تھا۔ بات سلطان کے ذہن میں آگئی تھی۔ اس نے ابوسہل کے خاموش ہوتے ہی ساٹھ ہزار دینار کے بجائے ساٹھ ہزار درہم کی دہانید کا حکم دیدیا اور ابوسہل کا قلم حرکت میں آگیا۔

ماہک اور امیر نصر زبانیں ہلا نہ سکے اور فردوسی کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ امیر نصر سلطان کی طبیعت سے واقف تھا کہ بار بار وہ اپنی رائے میں ترمیم نہیں کرتا۔ پھر بھی اس نے ماہک کو اشارہ کیا اور ماہک نے سلطان کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ فردوسی کی محنت اس سے زائد کی مستحق ہے۔ امیر نصر نے دبی زبان سے اس کی تائید کی مگر فردوسی کی تقدیر کا لکھا ٹل نہ سکا۔ ابوسہل کا کہنا سلطان کے دل میں بیٹھ چکا تھا۔ ماہک اور امیر نصر کے الفاظ خالی گئے۔ سلطان نے ان کو جواب دے دیا کہ بات کی تہہ میں وہ اپنے کو بدنام نہیں کر سکتا۔ فردوسی کے دوستوں کو اس سے روحی تکلیف پہونچی۔ لیکن وہ مجبور تھے۔ نیش عقرب اپنا کام کر چکا تھا۔ جس کا علاج امکان میں

نہ رہا تھا۔

ابوسہل کو سلطان کی طرف سے اندیشہ تھا کہ وہ پھر واہ راست پر نہ آجائے۔ اس لئے اسنے اسی وقت ساٹھ ہزار درہم منگوا کر ایاز کے حوالہ کر دیئے کہ سلطان کی طرف سے فردوسی کو لے جا کر دے دے۔ دربار کا وقت گزر چکا تھا۔ سلطان تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ گیا اور ابوسہل اور بزرگ احمد اپنی کامیابی پر نازاں بارگاہ سے نکل آئے۔

فردوسی اختتام شاہنامہ کی تاریخ سے بہت خوش تھا۔ نوشابہ اور فرنگیس کی یاد شدت سے آرہی تھی۔ زیبا صبح و شام دونوں وقت نشست میں شریک ہوتی کبھی فردوسی اس کے مکان پر چلا جاتا ورنہ عموماً وہ خود فردوسی کے وہاں آجاتی۔ محمود کے دربار میں جس روز شاہنامہ کے صلہ کا مسئلہ پیش ہوا اس دن زیبا نے فردوسی سے شام کی تفریح کا وعدہ لیا تھا اور فردوسی نے زیبا سے کہا تھا کہ وہ سہ پہر کو خود اس کے مکان پر پہنچ جائے گا۔ اسی پروگرام کے بموجب تین گھنٹے دن رہے وہ نہانے دھونے کے لئے کھڑا ہو گیا ——— سنہ ہجری شروع ہو چکا تھا۔ یہ زمانہ غزنی کے عروج کا زمانہ تھا۔ شہر پر رونق اور بازار دیدنی بن گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ مسجدوں اور حماموں کا خاص التزام تھا۔ یوں تو ہر مکان میں آجکل کی طرح نہانے دھونے کی جگہ الگ ہوتی لیکن ان کے علاوہ شہر میں بڑے بڑے حمام بنے ہوئے تھے۔ جن میں ہر وقت گرم و سرد پانی موجود رہتا اور دوسری تمام سہولتیں ممکن ہوتیں۔ فردوسی کے مکان کے قریب بھی ایسا ہی ایک حمام تھا جس کو فردوسی کے ورود کی عزت حاصل ہوتی اس وقت بھی ایک غلام کو لیکر وہیں چلا گیا اور نہانے کے لئے داخل ہو گیا۔

ایاز جب اتفاق سے کر مکان پر پہنچا تو ایک غلام موجود تھا انعام آنے کی خبر سن کر اسکو

صبر نہ ہو سکا۔ اور ایاز کو لئے ہوئے وہ حمام کی طرف روانہ ہو گیا۔ فردوسی نہا کر کپڑے پہن رہا تھا۔ غلام اس کے برآمد ہونے کا انتظار نہ کر سکا۔ اور حمام کے دروازے پر پہنچتے ہی دور مسرت میں آقا کو یہ مژدہ سنا دیا۔ غلام کے الفاظ نے فردوسی کی رگوں میں ایک روح ڈال دی۔ اسی دن کے لئے اس نے کتنے ہی مصائب جھیلے تھے۔ یک وقت کئی چہرے نگاہوں میں گردش کرنے لگے۔ نامراد نوشابہ جوانا مرگ قاسم اور وطن میں منتظر بیٹی نگران تصورات میں اس نے وقت ضائع نہ کیا۔ جلد سے جلد کپڑے پہنکر نکل آیا۔

ایاز اس کا رتبہ شناس اور ہمدرد تھا۔ وہ ساری عمر کی محنت کا اجر لایا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے ایک ملال آشکارا ہو رہا تھا۔ فردوسی نے جواب سلام کے لئے نظریں اٹھائیں تو ایاز کو بشاش نہ پایا اور فی الفور دریافت کر لیا کہ وہ کیا صلہ لے کر آیا ہے؟ ایاز نے گردن جھکا کر تعداد بتا دی۔ فردوسی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مگر ساٹھ ہزار درہم کے واضح الفاظ وہ سن چکا تھا دماغ میں ایک جھنجھناہٹ کی کیفیت پیدا تھی کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فردوسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا تھا۔ لیکن وہ اقلیم سخن کا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی آن بان پر حرف نہ آنے دیا۔ پورے شاہانہ وقار کے ساتھ ایک بار پھر ایاز سے پوچھا اور اس کی زبان سے دوبارہ انھیں الفاظ کو سنکر کہہ دیا۔

حمام کے ملازمین اور فقرا و مساکین میں تقسیم کر دو۔۔۔۔۔

ایاز بت بنا کھڑا تھا۔ فردوسی نے اس کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے نہ دیکھا تو ایاز کو ٹوکا۔ اور اپنے غلاموں کو اس کی مدد کرنے کے لئے کہا۔ ایاز نے تعمیل شروع کر دی اور فردوسی نے اپنے مکان کا رخ کر دیا۔

غزنی کے غرباء نے داد و دہش کے ان گنت مناظر دیکھے تھے۔ آل سبکتگین میں بڑے بڑے مخیر امیرزادے موجود تھے، مگر شاہنامہ کے خالق کی دین آپ اپنی نظیر تھی ایاز کا ہاتھ درہموں کی تھیلی سے نکل نکل کر چاندی کے سکوں کی بارش کر رہا تھا اور پانے والے طبقے کے بدنصیب شاعر کو دعائیں دے رہے تھے۔

ساٹھ ہزار درہم گھنٹوں میں ختم ہو گئے۔ ایاز تھیلیاں جھاڑ کر واپس ہو گیا اور غلام فردوسی کے مکان کو چلے گئے۔

ساکنان غزنی کی اکثریت فردوسی کی ناکامی سے متاثر تھی۔ ہم عصر شعراء جو تھوڑی دیر قبل تک اس کے حریف اور رپیٹھ لگانے کی فکر میں تھے ان کو بھی فنکار عظیم کی نامرادی پر رنج تھا۔ البتہ چند قسی القلب ان لمحات میں بھی دشمن بنے ہوئے تھے۔ ایک خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی دوسرا بدیع الدین ابو سہل سردمیر۔ ابو سہل تو اس محرومی کو کافی نہ سمجھتا وہ اس کے وجود کو زیبا تک پہنچنے کے لئے راستہ کا روڑا قرار دیتا اور اس کو ہمیشہ کے لئے ہٹا دینا چاہتا تھا۔

شب کی نشست میں جب ایاز نے ایک تاثر کے ساتھ درہموں کی تقسیم کا واقعہ بیان کیا اور محمود اس سے اثر پذیر ہونے لگا۔ اس موقع پر بھی اس سنگدل نے بدنفسی کو نہ چھوڑا۔ امیر نصر نے سلطان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور یاد دلایا کہ اس نے پہلے ہی اس رقم کو حق تلفی قرار دیا تھا۔ مزاج سلطانی اس تقریر سے برہم ہو گیا اور محمود ابو سہل پر ناراض ہونے لگا۔ لیکن بزرگ اسعد کے چند جملوں نے حالات کو بدل دیا۔ اس نے کہا کہ فردوسی کو اس کا حق ملا ہو یا نہ ملا ہو، مگر اس نے نوازش خسروانہ کی بہت اہانت کی۔ سلطان کی طرف سے ایک ایسی نمائش

عطا ہوتی تو سر آنکھوں سے لگانا چاہیئے تھا۔ محمود لاکھ مدبر اور انصاف پسند سہی لیکن تھا ایک مطلق العنان فرمانروا ہی۔ ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ اور اس نے کہہ دیا کہ اس شوخی کو گستاخی کا مزہ چکھایا جائے گا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ فردوسی کی قسمت رنگ دکھا رہی تھی۔ ایاز کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مگر اس نے سلطان کو زیادہ مشتعل نہ ہونے دیا اور اپنی باتوں میں لگا کر بہلا لیا۔

صبح کو قبل اس کے کہ دربار سے فردوسی کی طلبی کا حکم جاری ہو۔ یہ خبر غزنی میں مشہور ہو گئی۔ کہ فردوسی رات ہی رات کسی طرف کو نکل گیا۔

باب (۱۹)

خودداری کا مجرم

فردوسی نے زیبا سے تفریح کو چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ سورج ڈوبنے تک زیبا اس کی منتظر رہی اور جب وہ نہ پہنچا تو ماہ رخ کو لے کر خود اس کے مکان پر آ گئی۔ غلام فردوسی کی سیر چشمی کا مظاہرہ کر کے آ چکے تھے۔ زیبا نے صحن مکان میں داخل ہو کر ایک غلام سے خیریت دریافت کی۔ اس نے کل کیفیت بتا دی اور زیبا محمود کی تلون مزاجی پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ فردوسی کی نامرادی پر اس کے دل کو دھچکا لگا۔ مگر اسی کے ساتھ محمود کی ناقدری کے جواب میں فردوسی کے عمل پر وہ جھوم اٹھی۔ بوڑھے فنکار نے دنیا کو اپنے فن کی قیمت بتا دی تھی اور تاجدارانہ نخوت پر وہ ضرب لگائی تھی جس کی خوش آئند آواز میں زیبا کو ہزاروں نغمے سنائی دے رہے تھے۔

فردوسی مصلے پر بیٹھا ہوا فرض عبودیت ادا کر رہا تھا۔ زیبا اور ماہ رخ دبے پاؤں ایک طرف آ کر بیٹھ گئیں۔ اور اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔

فردوسی کی ساری عمر کی محنت رائگاں گئی تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ پھر بھی

وہ انتہائی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکن نہ تھی۔ زیبا کو اس کے قلبی تاثرات کا اندازہ تھا اور وہ اس کے رنج میں برابر کی شریک تھی مگر وہ وقت کسی تاسف کا نہ تھا۔ اس سے فردوسی کے صدمے میں اضافہ ہو جاتا۔ اسی لئے فردوسی مصلے سے اٹھ کر جب زیبا سے مخاطب ہوا تو اظہار افسوس کے بجائے زیبا نے پہلی بات جو اس سے کہی وہ یہ تھی کہ اس نے شاہانہ غرور کے منہ پر طمانچہ لگا کر اپنے کو مبارکباد کا اہل بنا لیا ہے۔ فردوسی کے دل میں اک آگ اٹھ رہی تھی۔ مگر لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ زیبا نے اس کی دلدہی کی خاطر اپنی تمام پونجی فرنگیس کو بھیج دینے کے لئے پیش کی۔ فردوسی نے ایک تلخ ہنسی ہنس کر اس کا شکریہ ادا کیا اور سر جھکا لیا۔

فردوسی صرف شاہنامہ کا خالق ہی نہ تھا۔ درد و غم کا پروردگار بھی تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے نیرنگیاں اس پر مہربان رہی تھیں اور نت نئی مصیبتوں میں اس نے زندگی کی منزلوں کو طے کیا تھا۔ ساری عمر میں وہ دن تو عیش و مسرت میں گذرے تھے، جب نوشابہ نے شروع میں اس کو محبت کرنا سکھایا تھا۔ اس کے بعد سے جو آزمائشوں کے سلسلہ کا آغاز ہوا تو پیچھا نہ چھوٹا اور سچ پوچھو تو اس کو مسرت و شادمانی سے کوئی لگاؤ بھی نہ رہ گیا تھا وہ ایک فرض کی انجام دہی کے لئے زندہ تھا۔ جس کی تکمیل ہو چکی تھی۔

زندگی فردوسی کے نزدیک اندوہ و الم کی ہم ردیف تھی اور محبت حسرت و یاس کا دوسرا نام۔ زیبا اور فرنگیس اس بساط پر دو مختلف النوع مہرے تھے۔ جن کے لئے جذبات دل میں جوار بھاٹا آتا رہتا اور یہ کیفیت اس مقدس

ربط کا تصدق ہوتی جو اس کو نوشابہ سے تھا۔ فرنگیس نوشابہ کی بیٹی اور زیبا اس کی شبیہ تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتیں پھر بھی ان کے مابین بہت فرق تھا۔ فردوسی فرنگیس کے لئے جینا چاہتا اور زیبا کو دیکھ کر جینے کا مواد فراہم ہوتا۔ لیکن شاہنامہ کے صلے کی طرف سے آس ٹوٹ جانے کے بعد نہ زیست کی تمنا رہ گئی تھی اور نہ کوئی مقصد حیات۔ موت اختیاری ہوتی تو حمام سے واپسی پر لمحات اولین میں وہ زندگی سے ناطہ توڑ لیتا۔ اگر مر جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے جی نہ چاہنے کے باوجود زندہ تھا۔

زیبا نے نوشابہ کے انداز اور اس کے لہجہ میں بارہا قلب کی دھڑکنوں میں اضافہ کیا تھا اس وقت بھی فردوسی کو محسوس ہوا کہ محبوبہ زیبا کے پیکر میں تسکین دینے کو آئی تھی۔ احساس خیالات میں کہن سال شاعر کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور بے خیالی میں کہہ گیا۔

"نوشابہ میں تم سے شرمندہ ہوں تمھاری کوئی آرزو میں پوری نہ کر سکا۔"

"سب سے بڑی آرزو تو پوری کر دی آپ نے اور آپ کیا کرتے ——— ؟

زیبا کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ حالانکہ الفاظ زبان سے نکلنے کے ساتھ ہی اس کو احساس ہوا کہ فردوسی کی مخاطب الیہ نوشابہ تھی اس نے جواب کیوں دیا۔ ادھر زیبا کے الفاظ کو فردوسی نے نوشابہ کے الفاظ سمجھا اور دل کا بوجھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ اس نے صحیح معنی میں زیبا کو نوشابہ قرار دیا اور وفور جذبات میں نگاہیں اس کی طرف اٹھا دیں۔ زیبا غیر ارادی طور پر اس کی دلجوئی کے لئے مسکرانے لگی۔ اور در حقیقت تھوڑی دیر کے لئے نوشابہ بن گئی مگر اہ رنج کے

وجود نے: وقفے کے طلسم خیال کو توڑ دیا۔ اس نے فردوسی کو مشورہ دے دیا۔
"غزنی میں آپ کی اتنی ناقدری ہو رہی ہے تو آپ کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے؟"۔

فردوسی اس کی آواز پر چونک پڑا۔ ماہ رخ کو اس نے کوئی جواب تو نہ دیا مگر آنکھیں کسی مجبوری کی ترجمانی کرنے لگیں۔ زیبا جس وقت سے آئی تھی، فردوسی کا غم غلط کرنے میں کوشاں تھی اور اس کو کسی بحث میں پھنسا کر اچھا لینا چاہتی۔ ماہ رخ نے اس کو ایک موضوع دے دیا تھا وہ اسی پر فردوسی سے گفتگو کرنے لگی اور کتنے ہی چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں کے حوالے دے ڈالے جہاں فردوسی کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ طوس کا شاعر ایک خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا کہ غزنی کو چھوڑ کر اگر وہ جاتا تو صرف طوس کو مگر وہ فرنگیس سے نگاہ چار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس لئے طوس کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔ زیبا اس کی تردید میں کچھ کہنے والی تھی۔ لیکن مالک کے آجانے سے ٹھہر گئی۔ اور مالک فردوسی کو درباری حالات بتانے لگا۔

بزرگ احمد اور ابوسہل کی ریشہ دوانی غیر متوقع نہ تھی مگر زیبا ابوسہل کو اتنا تنگ ظرف نہ سمجھتی اس کی زبان سے ابوسہل کے لئے برے الفاظ نکل گئے تاہم اس نے جذبات کو دبا لیا ابوسہل کتنا ہی چھچھورا اور بدنفس کیوں نہ ہو لیکن زیبا کا محسن تھا۔ اس کے نام سے نفرت ہو جانے کے باوجود زیبا نے زیادہ برا بھلا نہ کہا۔ مالک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رک کر دارالامارہ کو چلا گیا۔ رات کافی جا چکی تھی۔ اس لئے زیبا و ماہ رخ بھی رخصت ہو گئیں اور فردوسی کھانا کھا کر

سونے کے لئے لیٹ گیا۔

فردوسی کی طبیعت صدمات کی خوگر بھی خم اٹھا۔ اس کے لئے کوئی امر محال نہ تھا، پھر بھی نیند نہ آسکی۔ غزنی سے جی بھر چکا تھا مگر اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہ تھا کئی گھنٹے کروٹیں بدل کر اس نے کاٹ دیئے۔ نصف شب کے بعد باہری دروازے پر دستک ہوئی۔ فردوسی نے کان کھڑے کئے۔ دوسری بار پھر ویسی ہی آواز سنائی دی۔ غلام غافل پڑے سو رہے تھے فردوسی نے ان کو زحمت دینے کے بجائے خود اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک بغیر کچھ کہے سنے اندر آگیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے فردوسی کے ساتھ بڑھنے لگا۔ فردوسی نے اس وقت آنے کا سبب دریافت کیا۔ ایک نے محمود کے برہم ہونے کا واقعہ کہہ سنایا اور باخبر کر دیا کہ آنے والی صبح کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہوگی۔ فردوسی نے ایک کی بات کا کوئی جواب نہ دیا ایک رفتار سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔

ایک نے ایک لمحہ کے توقف سے پردۂ شب میں فرار ہو جانے کا مشورہ دیا۔ فردوسی نے اس کو بھی سن لیا اور اسی طرح مستغرق خیال رہا۔ ایک فردوسی کے جواب کا منتظر ہو رہا تھا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کو اطلاع دینے آیا تھا۔ لیکن فردوسی اس طرح ساکت تھا۔ گویا اس واقعہ کو کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ ایک نے جب اس کو ٹس سے مس ہوتے نہ دیکھا تو ملتجیانہ انداز میں کہا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے اور فی الفور روانگی کے لئے تیار ہو جائے۔ فردوسی کو اس وقت جانے کیا ہو گیا تھا۔ ایک کے تاثرات کا لحاظ کئے بغیر اس نے کہہ دیا کہ اس کو اپنی جان اتنی عزیز نہیں جس کی خاطر مجرموں کی طرح غزنی کو چھوڑ دے۔ ایک نے اس کے جواب میں کہا کہ جان کی پرواہ نہیں ہے تو عزت و آبرو کا خیال تو کرنا ہی چاہیئے۔ فردوسی کے لئے ایک

لمحہ فکر پیدا ہو گیا مگر اس کو زیادہ طول نہ ہو سکا دروازے پر کوئی ہلکی ہلکی تھپک دے رہا تھا۔ فردوسی کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ اور اس نے مالک سے دروازے کھولنے کو کہا۔ پھر اس کو روک کر خود کھڑا ہو گیا۔ مالک نے خلاف معمول سبقت نہ کی اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ بادا کوئی سرکاری آدمی ہو اور اس کو دیکھ لے۔ فردوسی نے دروازہ کھولا تو امیر نصر کا ایک آدمی موجود ملا۔ اس نے فردوسی کے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا اور الٹے قدم واپس ہو گیا۔

امیر نصر نے بغیر دستخط کے ایک تحریر بھیجی تھی اور فردوسی کو فوراً غزنی سے نکل جانے کی ہدایت کی تھی۔ الفاظ کا لب و لہجہ مخلصانہ تھا اور ان کے پس پردہ ایک تنبیہ چھپی ہوئی تھی۔ فردوسی نے مالک کے کہنے پر اعتنا نہ کی تھی مگر امیر نصر کے لکھنے کو نظر انداز نہ کر سکا۔ غزنی میں تین شخصیتیں اس کی محسن اور دوست رہ گئی تھیں ان میں فضل اسفرائنی ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ امیر نصر اور مالک باقی تھے وہ دونوں بالاتفاق اس کو جان بچانے کی رائے دے رہے تھے۔ فردوسی پرچہ ہاتھ میں لئے آ کر بیٹھ گیا اور چند لمحوں میں ایک نتیجہ اخذ کر لیا۔ زیبا بھی ان واقعات کے ظاہر ہونے سے قبل ایسا ہی مشورہ دے چکی تھی۔ نوشابہ بقید حیات ہوتی تو وہی کہتی جو زیبا نے کہا تھا۔ فردوسی نے زیبا کے قول کو نوشابہ کا ایما قرار دیا اور مالک سے کہہ دیا کہ وہ جانے کو تیار ہے۔

مالک کو فردوسی کے اس فیصلے سے مسرت ہوئی مگر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ فردوسی ہمیشہ کے لئے اس سے چھوٹ رہا تھا مالک کا جی چاہنے لگا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا کیونکہ فردوسی کی طرف سے اندیشہ تھا کہ متاثر

ہو کر وہ اپنا عزم بدل نہ دے۔ چند لمحات کے توقف سے فردوسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مالک سے کہنے لگا کہ جانے سے قبل ایک نظر زیبا کو دیکھ لے۔ مالک نے اس کو روکا اور سمجھایا کہ رات دو تہائی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ زیبا سے ملنے میں کافی وقت صرف ہو جائے گا اور فرار کا موقع نہ رہے گا۔ فردوسی کے لئے زیبا سے بغیر ملے چلا جانا بہت صبر آزما تھا مگر اس نے وقت کی نزاکت کا احساس کیا اور چند منٹ میں تیار ہو گیا

فردوسی جب مکان سے باہر نکلا تو اس بے سروسامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا کچھ ساتھ نہ تھا۔ حتیٰ کہ زادِ راہ میں ایک درہم بھی نہ تھا۔ مشاہرہ جو کچھ ملتا وہ غلام کے سپرد کر دیتا۔ وہ کھانے پینے کا مہتمم تھا۔ غلام کو جگانا اور راز دار بنانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے فردوسی جس طرح بیٹھا تھا۔ ویسے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر نکل آیا۔ مالک نے استفسار کیا کہ کوئی رقم سفر خرچ کے لئے ہے بھی یا نہیں؟ فردوسی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مالک کے پاس اتفاق سے چند دینار پڑے ہوئے تھے وہ اس نے فردوسی کو دے دیئے اور شہر کے باہر تک ساتھ نہ دے سکنے پر معذرت خواہ ہو گیا۔

فردوسی کی حیثیت ایک معتوب شاہی کی تھی۔ شخصی حکومت کے دور میں ایسے شخص کی ہمدردی کسی بڑے جرم سے کم نہ تھی۔ اسیر نصر اور مالک نے جو کچھ کیا تھا اس کا راز فاش ہو جاتا تو ان کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ مالک عواقب سے بے خبر نہ تھا۔ لیکن فردوسی کی جان اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی لہٰذا انجام پر نظر ڈالے بغیر وہ سب کچھ کر گزرا مگر فردوسی کو پہنچانے کے لئے جانا کوئی دانشمندی نہ تھی اس لئے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے مصافحہ کیا اور گلوگیر لہجے میں الوداع

کہہ کر رخصت ہو گیا۔

فردوسی مالک کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں تھا جن کی رفاقت پر وہ فخر کر سکتا۔ طوس کے احباب حسینی قتیب علی دیلم اور بودلف کچھ کم باوفا نہ تھے مگر مالک نے جو کچھ کیا تھا طوس والے بھی زائد از زیادہ اسی قدر کر سکتے۔ ایک سے چھوٹنے کا اس کو بہت رنج تھا۔ لیکن رنج میں وقت ضائع کرنے کا محل نہ تھا زیبا کے لئے البتہ ایک بار پھر جی میں آیا کہ اس سے جا کر مل لے مگر سپیدۂ سحر آسمان پر نمودار ہونے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ زیبا کے پاس جا کر اتنی جلد چھٹکارا نہ ہو سکتا۔ اس لئے اس نے ایک عزم راسخ کے ساتھ قدم اٹھا دیئے۔

جامع مسجد کے قریب سے گذرتے ہوئے ایک خیال اس کے ذہن میں آ گیا ایک مقام پر کھڑے ہو کر اذان کی آن کے لئے اس نے سوچا اور مسجد کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ صحن کو طے کر کے امام کے کھڑے ہونے کی جگہ پر پہونچا اور کوئلہ سے دیوار پر لکھ دیا۔

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست　　چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
محمود غزنوی کی بارگاہ دریا کی طرح ہے　　وہ بھی ایسا دریا جس کی کوئی انتہا نہیں ہے
چہ غوطہ ہا زدم واندرو ندیدم دُر　　گناہ بخت من است۔ ایں گناہ دریا نیست
بکن میں نے کتنے ہی غوطے لگائے مجھے موتی نہ ملا　　یہ میرے مقدر کا قصور ہے دریا کی خطا نہیں ہے

صبح کی علامات پیدا ہو رہی تھیں اس لئے زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرا اور جلد مسجد کے باہر آ گیا۔ غزنی کے پھاٹک کھلنے کا وقت قریب تھا۔ تیز قدم بڑھاتا ہوا مشرقی پھاٹک تک آیا اور چادر سے منہ لپیٹے ہوئے باہر نکل گیا۔

غزنی سے باہر آنے سے قبل یا پھاٹک سے نکلنے کے بعد تک فردوسی کے پیش نظر کوئی مستقل مقام نہ تھا جہاں کا وہ عزم کر سکتا۔ اُس کو صرف سلطان محمود کے عتاب سے بچنا تھا جس کے لئے ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ اس نے یہ بھی طے نہ کیا تھا کہ کس مقام پہ پہنچ کر دم لے گا۔ طوس جانے کو جی چاہتا مگر وہاں کا ارادہ اس لئے نہ تھا کہ عامل طوس گرفتار کر کے محمود کے پاس نہ بھیجدے۔ مالک نے اس کو ہدایت کی تھی کہ مشرقی پھاٹک سے نکل کر کسی غیر معروف راستہ پر روانہ ہو جائے وہ اسی پر عامل تھا اور شاہراہ چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیا تھا۔

سورج نکلنے تک ایک رفتار سے چلتا رہا۔ اور غزنی سے کئی میل دور ہو گیا۔ مگر دیتی ہی مسافت میں اسی سال کے بوڑھے کے پاؤں جواب دے گئے۔ اور دم لینے کے لئے وہ ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔ لیکن یہ خطرہ بھی لگا ہوا تھا کہ غزنی کے سپاہی اس کی تلاش میں نہ آ جائیں۔ اس لئے چند منٹ سے زیادہ توقف نہ کیا اور ہمت سے کام لے کر پھر چل پڑا۔

اس طرح دوپہر تک کافی فاصلہ پیچھے چھوڑ دیا آفتاب کی تمازت جب ناقابل برداشت ہو گئی تو ایک قریہ کے قریب قیام کیا اور رو گھنٹے گذار کر پھر عازم سفر ہو گیا۔

محمود نے دربار میں آتے ہی اس کو یاد کیا اور میمندی احمد نے چند سپاہی بلانے کے لئے بھیجدیئے۔ انھوں نے واپس آ کر فرار ہو جانے کی اطلاع دی۔ محمود نے بوڑھے شاعر کی چالاکی پر بہت پیچ و تعب کھایا اور تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ اور فردوسی ہاتھ نہ آ سکا۔

سطحی خیال کے مطابق فردوسی کی منزل بلخ۔ بخارا۔ ہرات یا طوس ہوسکتی اور اس کو مغربی یا شمالی پہاڑ کے سے جانا چاہیے تھا۔ اس لئے بزرگ احمد نے جو سوار بھی روانہ کئے وہ شمال جنوب اور مغرب کو۔ مشرق کی طرف کسی نے رخ نہیں کیا اور کوئی جاتا بھی تو فردوسی کو پکڑ نہ سکتا۔ کیونکہ جانے والے سیدھے راستوں پر ڈھونڈھتے اور فردوسی نے مالک کے کہنے کے مطابق راستوں کو چھوڑ دیا تھا۔ باغات اور کھیتوں کے درمیان گزر رہا تھا۔

شام تک مسلسل سعی اور جستجو کے باوجود کوئی کامیابی نہ ہوئی تو حکم سلطانی کے بموجب فرامین جاری کردیے گئے کہ فردوسی جس وقت اور جہاں کہیں مل جائے اس کو غزنی حاضر کیا جائے۔ ان فرمانوں کو راتوں ہی رات چہار جانب بھیج دیا گیا اور بزرگ احمد اور کمینہ پرور ابوسہل امروز فردا میں اس کے گرفتار ہو کر آنے کی توقع کرنے لگے۔

فردوسی نے ضعف پیری اور تھکن کے باوجود سورج کی روشنی میں کافی مسافت طے کر ڈالی اور شب ایک قریہ میں گذارنے کے لئے ٹھہر گیا۔ گاؤں کے دیہاتیوں نے مسافر جان کر اس کی ضیافت کی اور فردوسی نے بھی دروغ مصلحت آمیز میں عذر نہ کیا۔ اپنے کو ایک مسافر بتا دیا اور سفر کے لئے ایک خچر خریدنے کی فرمائش کر دی جو کم و بیش قیمت پر مل گیا۔ اور آگے کا سفر بہ آرام طے ہو جانے کا سامان ہوگیا۔

فردوسی کے پاس مال دنیا میں سے ایک عصا اور چادر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر شاہنامے کے اوراق اور لکھنے پڑھنے کی چیزیں دم کے ساتھ تھیں۔ رات میں چند گھنٹے آرام کر کے وہ اٹھ بیٹھا اور قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا جس پر سلطان کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ ایک پرچہ اس نے ایاز کے نام تحریر

کیا اور صبح ہوتے گاؤں کے ایک شخص کو مناسب معاوضہ پر غزنی جانے کے لئے آمادہ کیا. سلطان کے نام کا خط اور ایاز کا پرچہ اس کے سپرد کر کے اپنے سامنے روانہ کر دیا اور خود خچر پر سوار ہو کر شمال کی طرف چل دیا

فردوسی کے بھیجے ہوئے آدمی نے اس کا پرچہ اور خط اسی دن ایاز کو پہنچا دیا ایاز کو بھی فردوسی کے انجام کا بہت قلق تھا مگر حالات اس قدر بگڑ چکے تھے جن کی اصلاح وہ نہ کر سکتا. پھر بھی وہ موقع محل سے سلطان کو ہموار کرنے کی سوچ رہا تھا. فردوسی نے اس کو لکھا تھا کہ بیس روز کے بعد اس کا خط سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے. ایاز نے خط لے کر رکھ لیا اور مقررہ دن آنے کا انتظار کرنے لگا.

فردوسی سلطان محمود کی طاقت اور اختیارات سے واقف تھا. جانتا تھا کہ وسط ایشیا، عراق اور ایران میں کہیں اس کو پناہ نہیں مل سکتی مگر جان بچانے کے لئے جد و جہد بھی لازم تھی. اس لئے جلد سے جلد وہ غزنی سے نکل جانا چاہتا تھا. اس نے ابھی تک اپنے مستقر کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا تھا. لیکن ہرات نزدیک ترین شہر تھا اور وہاں اس کے جاننے والے بھی کثرت سے تھے لہذا اس نے ادھر ہی کا رخ کر دیا اور دو دو منزلوں کی ایک ایک منزل کر کے فاصلہ کو کم کرنے لگا.

باب (۲۰)
شاعر کا انتقام

فردوسی نے ایک سے وعدہ لے لیا تھا کہ زیبا کو اچانک مٹیا آجانے والے حالات سے باخبر کر دے گا اور مایک نے ارادہ بھی کیا تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ مگر صبح کو اس کی رائے بدل گئی۔ مایک سلطان غزنی کا ندیم تھا۔ درباری گھاتوں سے کماحقہٗ واقف۔ زیبا اگرچہ فردوسی کی وفادار تھی۔ تاہم عورت ذات تھی۔ مایک کی دانشمندی نے اجازت نہ دی کہ اپنی اعانت مجرمانہ کا ایک شاہد پیدا کرے جس کی زبان اگر کسی وقت قابو میں نہ رہے اور فردوسی کے فرار میں اس کے راز کو ظاہر کر دے تو مایک بھی فردوسی کے ساتھ معتوب شاہی قرار پائے سوچ سمجھ کر اس نے خاموش رہنا ہی مصلحت سمجھا اور زیبا چند گھنٹوں تک ذہنی اذیت سے بچی رہی۔

ناشتہ کے بعد حسب معمول وہ فردوسی کے مکان پہنچی تو اس کو موجود نہ پا کر متحیر رہ گئی۔ غلام خود اپنے آقا کی تلاش کر رہے تھے۔ زیبا نے خیال کیا کہ امیر نصر یا کسی اور کے وہاں گیا ہوگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ اور زیبا کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے

شروع میں تو وہ اعتبار نہ کرسکی کہ فردوسی نے اس کی طرف سے اس قدر بے اعتنائی کی ہوگی کہ بغیر علم و اطلاع کے چلا گیا۔ مگر زیادہ دیر فریب تسلی میں اپنے کو بہلا نہ سکی شاہی سپاہی فردوسی کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ غزنی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا گیا۔ فردوسی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ زیبا کو یقین ہوگیا کہ وہ جان بچا کر کسی طرف کو نکل گیا۔ دوپہر ہوتے ہوتے ان شعروں کا چرچا ہونے لگا۔ جن کو فردوسی جامع مسجد کی دیوار پر لکھ گیا تھا۔ زیبا نے بھی ان کو سن کر ورد زبان کرلیا اور شام کو مالک کی زبانی باتوں باتوں میں اس کی تصدیق ہوگئی۔ کہ فردوسی کسی ذریعہ سے محمود کی نیت کا حال سن کر فرار ہوگیا۔

زیبا کو فردوسی کے بچ نکلنے کی مسرت تھی مگر اس سے چھوٹ کر محسوس ہو رہا تھا کہ زیبا نے کوئی نہایت بیش قیمت شے گنوا دی تھی۔ طبیعت خود بخود اچھٹ رہی تھی اور جی چاہتا کہ ایک لحظہ ضائع کئے بغیر غزنی سے نکل جائے اور یہ حقیقت تھی کہ غزنی میں اب اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جس غرض کو لے کر وہ وہاں آئی تھی وہ غرض پوری ہوچکی تھی اس کا خنجر کاموس سامانی سے اپنی دوشیزگی کی قیمت اور شمس افروز کا خون بہا وصول کرچکا تھا۔ زیبا اس واقعے کے بعد ہی غزنی کو چھوڑ دیتی لیکن فردوسی نے زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ شاہنامہ نے ایک نئے مقصد حیات کی تخلیق کر دی تھی اور زیبا نے عزم مصمم کرلیا تھا کہ وہ شاہنامے اور صرف شاہنامہ کے خالق کے لئے زندہ رہے گی۔ فردوسی کی طرف التفات کا ایک سبب خود فردوسی کی مجنونانہ محبت بھی تھی جو اس کو نوشابہ کی ہم شبیہ کی حیثیت سے زیبا سے تھی۔ زیبا کو بوڑھے شاعر کے لئے اپنے

جذبات کا علم تھا مگر وہ یہ نہ جانتی تھی کہ فردوسی سے الگ ہو کر اس کو قرار نہ آئے گا کم و بیش اسی سال کا ضعیف العمر انسان، نتیس تیس برس کی حسین ترین رقاصہ کا محبوب بنا ہوا تھا اور اس کو فردوسی کے بغیر چین نہ تھا۔

فردوسی سے زیبا کی والہانہ محبت بادی النظر میں ناقابل یقین ہے جوانی کی نگاہ کسی تابناک چہرے ہی کو دیکھ کر سکون پاتی ہے۔ فردوسی کے پاس جسمانی کشش میں سے کچھ نہ تھا۔ سن کے تقاضے سے قوی ضعیف اور اعضا اکڑ در پڑ گئے تھے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور رخساروں پہ جھریاں نمودار تھیں جنہیں زاویہ نگاہ سے کوئی عورت اس پر نظر ڈال کر خوش نہ ہو سکتی مگر زیبا جانے کن آنکھوں سے دیکھتی کہ سامنے ہوتے ہی مسکرانے لگتی۔ ان گنت نوجوانوں کے خوابوں کی مکر ہزاروں دھڑکتے ہوئے دلوں کا مرکز خیال رقاصہ کا عجیب نظریہ تھا کہ شباب و جمال کے متقیلی پیکروں کو ٹھکرا کر قبر میں پیر لٹکائے ہوئے بڈھے کی سمت مائل تھی اور بسا اوقات محبت کے غرور کا احساس کرتی اس کو نوشابہ کے قائم مقام ہونے کا فخر تھا اور فردوسی کی محبت پر ناز بھی اس کے نزدیک اگر اس کا حسن قابل قدر تھا تو صرف اس لئے کہ فردوسی اس کو دیکھ کر طمانیت قلب محسوس کرتا اور اس کا وجود شاہنامہ کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح معاون ہو جاتا۔

زیبا کو زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ فردوسی نے اس کے لئے کوئی پیغام نہ چھوڑا ۔۔۔ ورنہ یہ بتا کر گیا تھا کہ کس مقام پر اس کو تلاش کیا جائے؟ حالانکہ زیبا کو اس کے خیال میں کسی شکایت کا محل نہ تھا۔ کیونکہ فردوسی کے لئے ایسی کوئی بات ممکن نہ تھی وہ کسی سے مل کر گیا ہوتا تو کچھ کہلاتا بھی۔ لیکن اس کو تو جان کے لالے

پڑے ہوں گے۔ ملنے ملانے کا سوال کیا؟ اور پتہ بتا جانا تو بالکل خارج از عقل تھا۔ وہ سلطان محمود کی گرفت سے بچنے کے لئے گیا تھا۔ جائے پناہ کا اعلان کیونکر کر دیتا؟ زیبا کو فردوسی کی مجبوریوں کا اعتراف تھا۔ مگر اس سے اس کی تسکین نہ ہوتی۔ وہ اس مقام پر اڑ کر پہنچ جانا چاہتی جہاں فردوسی چھپا ہوا تھا۔

ایک دن اور ایک رات تو کسی نہ کسی طرح کٹ گئی۔ دوسری صبح سے زیبا کا دم گھٹنے لگا اور غزنی کے قیام کا ایک ایک لمحہ بار چبھنے لگا۔ مگر وہ بلا جانے بوجھے قدم بھی نہ اٹھا سکتی۔ اس کو قابوس کی واپسی کا بھی انتظار تھا۔ اگر وہ غزنی سے روانہ ہو جاتی تو قابوس اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ سارے دن کمرے میں پڑی ہوئی سوچتی رہی اور کوئی فیصلہ نہ کر سکی تو سہ پہر کو ماہ رخ سے مشورہ کیا۔ ماہ رخ نے قابوس کے آنے تک غزنی سے نہ ہٹنے کی رائے دی اور زیبا نے چھوٹی بہن کے کہنے پر عمل کرنے کا عزم کر لیا۔

غزنی میں فردوسی کی فراری پر چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ بزرگ احمد اور ابو سہل کے خلاف عام منافرت پھیل رہی تھی اور دبی زبان سے سلطان کے سلوک کو برا بتایا جا رہا تھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک مظلوم کو علی الاعلان مظلوم کہہ سکے۔ ابو سہل اور بزرگ احمد کے ضمیر ان کو ملامت کر رہے تھے۔ لیکن ان کو فردوسی سے جانے کیا عناد تھا کہ دل نہ پسیجتے۔ وہ ہر نشست میں کچھ ایسی باتیں کرتے کہ سلطان کی برہمی میں اضافہ ہو جاتا۔ فردوسی کی گرفتاری کے گشتی احکام جاری ہو چکے تھے۔ چند روز کے وقفے سے بزرگ احمد نے ایک تاکیدی فرمان اور بھیج دیا اور عامل طوس کو خاص طور پر ہدایت کی کہ جس وقت بھی فردوسی وہاں پہنچے۔ فوراً غزنی

حاضر کیا جائے۔

بزرگ احمد فردوسی کے ہمدردوں کی طرف سے غافل نہ تھا۔ بالخصوص زیبا پر اس کی خاص نظر تھی۔ مگر کسی کے خلاف کچھ کرتے بن نہ پڑتا۔ امیر نصر اور مالک کے سے لوگ اس سے پایہ کمی کا نہ رکھتے۔ لہٰذا ان کے لئے سلطان سے کچھ کہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ زیبا کی بابت البتہ کان بھرنے کا موقع تھا۔ اس سے فردوسی کا رابطہ ظاہر سا تھا اور عام خیال کیا جا رہا تھا کہ فردوسی کے بعد وہ غزنی میں نہ ٹھہرے گی۔ بزرگ احمد نے ایک نشست میں اس اندیشہ کا اظہار کیا۔ بات قرین عقل تھی لیکن سلطان اتنا نا منصف نہ تھا کہ قیاس پر زیبا کو ماخوذ کرنے کا حکم دے دیتا۔ وہ سن کر خاموش ہو رہا۔ بزرگ احمد نے وار خالی جاتے دیکھ کر کہا کہ اگر سلطان اجازت دیدے تو زیبا کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے۔ سلطان کو اس میں کوئی مضائقہ دکھائی نہ دیا اور بزرگ احمد نے اس کا ایما پا کر زیبا کے مکان کے گرد مخبر لگا دیئے۔

زیبا اس نگرانی سے بے خبر نہ رہی۔ اس نے سلطان سے شکایت کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر کچھ کہنا سننا بے سود سمجھا۔ سلطان کی طرف سے اس کا دل پھیکا پڑ چکا تھا۔ فردوسی کے ساتھ اس کی روش نے صرف زیبا ہی پر نہیں۔ عام لوگوں کے خیالات پر اثر کیا تھا اور ہر چھوٹا بڑا سلطان سے بدظن ہو رہا تھا۔ لیکن کسی کو زبان ہلانے کا یارا نہ تھا۔ زیبا بھی یہ سب دیکھ کر انجان بنی رہی اور قابوس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔

فردوسی کو غزنی سے گئے ہوئے بیس روز گذر گئے تو ایک دن دربار میں ایاز نے اس کا بھیجا ہوا سربستہ خط سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ سلطان نے ابو سہل کے

پھر دوبارہ پڑھنے کی ہدایت کی اور ابوسہیل نے تعمیل میں پڑھنا شروع کر دیا۔

بسی بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند ز تو در جہاں یادگار

اے بادشاہ میں نے وہ کام کیا ہے — جو دنیا میں تیری یادگار بن کر رہے گا

پے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند

میں نے نظم سے ایک اونچا محل تعمیر کیا ہے — جس کو طوفان سے نقصان نہیں پہنچ سکتا!

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی

میں نے اس تیس سال کی مدت میں بہت تکلیف اٹھائی — اور اس نظم سے ایران کو زندہ کر دیا

چو بر باد دادند گنج مرا — نہ بد حاصلے سی و پنج مرا

میرا خزانہ لٹ گیا ۔ — اور پینتیس سال کی محنت کا اجر نہ ملا

اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر

اگر بادشاہ کسی بادشاہ کا بیٹا ہوتا — تو میرے سر پہ سونے کا تاج رکھ دیتا!

سلطان اور اہل دربار ابتدائی شعروں ہی سے سمجھ گئے تھے کہ اس میں کیا لکھا ہوگا؟ مگر ہر ایک تحمل سے سنتا رہا۔ پانچویں شعر پہ بہت سے درباریوں سے ضبط نہ ہو سکا اور انھوں نے سلطان سے کہا کہ وہ ابوسہیل کو روک دے۔ وہ ایسی نظم سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خود سلطان غم و غصہ میں کانپ رہا تھا لیکن خفت مٹانے کے لیے اس نے ابوسہیل کو روکنے کے بجائے اور پڑھنے کی ہدایت کر دی اور ابوسہیل فردوسی سے سلطان کی منافرت کو بڑھانے کے لیے پڑھتا گیا۔

وگر مادر شاہ بانو بدے — مرا سیم و زر تا بزانو بدے

اگر بادشاہ کسی ملکہ کے بطن سے ہوتا تو — سونا چاندی دیتا کہ زانو تک آ جاتا۔

پرستارزادہ نیاید بکار — وگر چند دارد پدر شہریار

لے پالک کا لڑکا کام نہیں آسکتا — خواہ وہ بادشاہ کا بیٹا کیوں نہ ہو

ان دو شعروں پر تو سلطان کے غیض کا عجب عالم ہوا۔ آنکھیں چڑھ گئیں چہرہ تمتمانے لگا مگر اس نے ابو سہل کو ممانعت نہ کی۔ اور ابو سہل پڑھتا رہا۔

سر ناسزایاں برافراشتن — وز ایشاں امید بہی داشتن

اگر نااہل لوگ کسی درجے پر پہنچ جائیں — تو ان سے بھلائی کی توقع کرنا اپنی

سر رشتہ خویش گم کردن است — بہ جیب اندروں مار پروردن است

عقل کو کھوتا ہے اور — آستین میں سانپ پرورش کرنے کے برابر ہے

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت — گرش برنشانی بباغ بہشت

کیونکہ درخت جس کی فطرت تلخ ہے — اس کو جنت ہی میں کیوں نہ لگایا جائے

ور از جوئے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

جنت کے پانی سے سینچا جائے — اس کی جڑوں میں شہد ڈالا جائے

سرانجام گوہر بہ کار آورد — ہماں میوہ تلخ بار آورد

پھر بھی نتیجہ میں اس کی فطرت رنگ لائے گی — اور اس سے تلخ پھل ہی پیدا ہوں گے

ز بد اصل چشم بہی داشتن — بود خاک در دیدہ انباشتن

بد اصل سے فائدے کی امید رکھنا — اپنی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے برابر ہے

ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند — کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند

میں یہ شعر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ — ان سے سبق حاصل کرے (اور جان لے

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا

کہ شاعر کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو ہجو — کہتا ہے جو قیامت تک باقی رہتی ہے

فردوسی نے کتنی ہی سچی بات کیوں نہ کہی ہو، لیکن سلطان کی شان میں ایسے الفاظ کا استعمال انتہائی ناپسند کیا گیا اور وقتی طور پر اس کے ہمدردوں کو بھی یہ انداز ناگوار گذرا۔ ماہک اور امیر نصر کے سے بہی خواہ بھی فردوسی کی دریدہ دہنی کو برداشت نہ کر سکے۔ سارے دربار میں اگر کسی کو اس ہجو سے لطف آیا تو فردوسی کے ان ازلی مخالف شاعروں کو جو ہر موقع پر اس کے ستیزہ اور ایذا رسانی رہے تھے۔ مگر فردوسی کی محرومی کے بعد سے اس کے لئے ایک درد محسوس کر رہے تھے ان کے دلوں پر مصنف شاہنامہ کی قدرت کلام کا سکہ بیٹھ چکا تھا اور فردوسی کی خودداری نے نگاہوں میں فردوسی کی قیمت پیدا کر دی تھی ——— اس کے ما سوا فردوسی کی آتشیں ان کے لئے سبق آموز تھی آج وہ جن حالات سے گذرا تھا کل دوسروں کے لئے وہی پیش آ سکتے۔ وہ تاریخی نظم جس نے رہتی دنیا تک کے لئے سلطان محمود کو بدنام کر دیا، تمام درباریوں کے لئے باعث تنغص تھی مگر یہ شاعر دل ہی دل میں لطف لے رہے تھے۔ پھر بھی ان کی زبانوں پر مہر لگی رہی اور ایک گہرا سکوت ہی وقت کا اقتضا تھا محمود نے پوری نظم سن کر چاک کر ڈالنے کا حکم دے دیا اور درباریوں کو تاکید کر دی کہ آئندہ اس کا ذکر نہ کریں مگر محمود کی یہ ہدایت کارگر نہ ہو سکی۔ دوسرے دن اسی نظم کے اشعار رازداری کے ساتھ غزنی میں گشت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اختفا کا وعدہ لے کر سناتا اور ہجو کی شہرت معمول سے زیادہ تیز روی اختیار کرتی جاتی۔ زیبا کا غلام بھی باہر کہیں سن آیا۔ اس نے چند شعر ماہ رخ کو سنائے۔ ماہ رخ نے زیبا سے ذکر کیا اور تجسس کرنے پر پوری نظم زیبا کے علم میں آ گئی۔

بزرگ احمد اور ابو سہل نے سلطان کو زیبا کی طرف سے مشکوک کر دیا تھا لیکن زیبا

پر کوئی ظاہری پابندی نہ تھی۔ وہ ہر جگہ آنے جانے کی مجاز تھی۔ ضمنوں کے مطابق مجرے کے لئے طلب کی جاتی اور سلطان لطف و عنایت سے پیش آتا۔ زیبا بھی اپنے طور طریقے سے ظاہر نہ ہونے دیتی کہ وہ فردوسی کے جانے سے ملول ہے۔ اس طرح رقص کر کے حاضرین کو محظوظ کرتی اور شاہنامے کے شعر پڑھ کر داد لیتی ۔۔۔۔ دربار غزنی کا دستور بھی دنیا سے نرالا تھا۔ شاہنامہ کے اشعار سے حظ اٹھاتے ہیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر مصنف شاہنامہ کا خون مباح سمجھا جا رہا تھا۔

فردوسی نے غزنی کے دس سالہ قیام میں کتنے ہی دلوں کو جیت لیا تھا اور خلائق کے وہ نقوش چھوڑے تھے سلطان کا عتاب جن کو مٹا نہ سکا۔ اعجاز بیانی کے اثرات سے الگ ہو کر بھی قلوب اس کے نام کے سامنے جھک جاتے۔ اس عقیدت کو ختم کرنے کی قدرت نہ بزرگ احمد کی وزارت عظمیٰ میں تھی اور نہ ابو سہل کے قلم میں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے تو آل اندیشی کے تحت زبانیں بند رکھیں مگر عوام کو کوئی روک نہ سکا اور ہجو کے کتنے ہی اشعار زبان زد ہو گئے۔

زیبا ان اشعار کو پڑھتی اور قدرت کلام پر سر دھنتی۔ اس کا جی چاہتا کہ ہر در و دیوار پر ان کو کندہ کرا دے۔ اور دنیا کے ہر متنفس کے کان میں ان کی آواز گونجنے لگے۔ مگر مصلحت کسی اقدام میں مانع تھی۔ سلطان محمود سے فردوسی کی اہانت کا انتقام لینے کا ایک منصوبہ وہ بنا چکی تھی اس پر عمل کرنے کے لئے غزنی سے نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن قابوس کا خیال روکے ہوئے تھا کہ وفادار غلام آئے گا تو اس تک کیونکر پہونچے گا۔ علاوہ بریں ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید وہ اردوان کو لے کر آجائے تو اس کی مشکل آسان ہو جائے ۔۔۔۔ زیبائے فردوسی

سے اردوان کو نوازنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر یہ کئی سال پیچھے کی بات تھی اس مدت میں وہ پھر سابقہ جگہ پر آ گئی تھی اور اردوان کو ماہ رخ سے ربط دینے لگی تھی۔ فردوسی کے جانے کے بعد اس نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا عزم کر لیا۔ زیبا کے اس ارادے میں چند مجبوریاں بھی تھیں۔ ماہ رخ دستگیر کی نواسی تھی جس کو دستگیر کی وصیت کے بموجب اردوان یا اسی کے سے کسی شخص سے بیاہا جا سکتا۔ ماہ رخ کی عمر بائیس سال کی ہو چکی تھی دوسرے الفاظ میں جدائی کے دن گذر جانے کے قریب تھے۔ زیبا کا حشر تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ چھوٹی بہن کو وہ پھولتے پھلتے دیکھنا چاہتی۔ مگر اردوان کے علاوہ کوئی نجیب الطرفین نظر نہ آتا۔ ماہ رخ کا ہاتھ جس کے ہاتھ میں دے کر ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو سکتی۔ ماہ رخ ایک اطاعت شعار دوشیزہ تھی۔ زیبا کی مرضی کے خلاف قدم نہ اٹھاتی۔ پھر بھی اس کا شباب زیبا کو ہر وقت ایک خطرے میں مبتلا رکھتا۔ فردوسی کی موجودگی میں اردوان کے لئے اس کو تجویز کرنے میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ شب و روز کے تردد سے بچ جائے گی۔ فردوسی نے جب غزنی کو چھوڑ دیا اور زیبا اپنے کام پر ہو گئی۔ تو پھر ماہ رخ کا سوال سامنے آ گیا اور اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اگر قابوس اردوان کو لے کر آ گیا۔ تو وہ اس بوجھ سے نجات حاصل کرے گی۔ غزنی کی فضا فردوسی کے لئے مخالف سے مخالف تر بنتی گئی۔ اور زیبا قابوس کا انتظار کرتی رہی:۔

اس طرح چھ ماہ سے زائد مدت گذر گئی۔ فردوسی کا کوئی سراغ نہ لگا۔ اور نہ قابوس واپس آیا۔ زیبا کے لئے اتنا وقت کاٹنا آسان نہ تھا۔ مگر اس نے

ساعتیں گن گن کر گذار دیا۔ فردوسی کا چرچا کم ہو گیا تھا اور سلطان کو بظاہر اس سے پرخاش نہ رہی تھی۔ مگر بزرگ احمد اور ابوسہل اس کو ہوا دیتے رہتے۔ ابوسہل اس کے تذکرے کو کسی مقصد کے تحت کرتا اور اس کا حوالہ دے کر زیبا کا نام لیتا۔ ابوسہل کا منشا یہ تھا کہ سلطان کو زیبا سے منحرف کر کے زیبا کی بے چارگی سے فائدہ اٹھائے۔ سلطان اگر اس کے خلاف کوئی حکم دے دیتا تو وہ زیبا کو اس کا مطالبہ مان لینے کی شرط پر معافی دلا دیتا اور سلطان کے ناراض ہو جانے کی صورت میں زیبا کے لئے بادی النظر میں ابوسہل کی بات منظور کر لینا ہی دانشمندی ہوتی کیونکہ سلطان کو ہموار کرنے کے لئے ابوسہل یا بزرگ احمد کا واسطہ ہی کام دے سکتا مگر ابوسہل کی ترکیب چل نہ سکی۔ اس نے جب زیبا کی بابت کچھ کہا۔ سلطان نے بات کاٹ دی اور کہہ دیا کہ زیبا کے خلاف تادیبی کارروائی کے لئے اس کے پاس کوئی مواد نہیں ہے۔

کئی مہینے کے بعد ایک پنجشنبہ کو نماز جمعہ کے لئے سلطان نے جامع مسجد جانے کا پروگرام بنایا اور دوسرے دن معینہ وقت پر اس کی سواری مسجد کے پھاٹک پر پہونچ گئی۔ فردوسی دو شعر محراب عبادت کے اوپر لکھ گیا تھا۔ ان کو امام مسجد نے مٹوا دیا تھا۔ مگر سلطان جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی نظر پڑی فردوسی کے شعر دوسرے مقام پر لکھے ہوئے تھے۔ سلطان ان سے متاثر ہوا نماز سے فراغت کر کے جب وہ دار الامارہ میں آ کر بیٹھا تو ابوسہل نے کہا کہ ان شعروں کو سلطان کے علم میں لائے بغیر مٹوا دیا گیا تھا۔ لیکن کسی نے سلطان کو دکھلانے کے لئے لکھ دیا اور یہ کام زیبا کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ سلطان نے

اس کو کوئی اہمیت نہ دی اور ابوسہل کی خاطر زیبا سے پرسش کرنے کے لئے کہہ دیا۔ ابوسہل کو موقع مل گیا۔ اس نے زیبا کے نام حکم جاری کر دیا کہ اگلے دن جواب دہی کے لئے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہو۔

مالک کی آمدورفت زیبا کے وہاں جاری تھی۔ مگر وہ عتاب سلطانی کے خیال سے زیادہ دیر نہ بیٹھتا اور نہ زیبا اس کو بٹھاتی۔ جس روز یہ حکم جاری ہوا اسی روز شام کو مالک اتفاق سے پہونچ گیا۔ زیبا نے اس سے ذکر کیا اور مالک نے مشورہ دے دیا کہ عزت آبرو بچانے کے لئے وہ غزنی سے چلی جائے۔ مالک کا منشاء یہ تھا کہ وہ اطمینان سے غزنی کو خیرباد کہے تاکہ مخالف عنصر کو پریشان کرنے کا محل نہ رہے۔ زیبا نے اس کے کچھ اور معنی لئے اور اسی وقت سے روانگی کا منصوبہ بنانے لگی۔

سلطان کا عطا کردہ غلام رقاصاؤں سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس نے اس موقع پر ساتھ دیا اور اسی کی مدد سے زیبا ماہ رخ کے ساتھ پردۂ شب میں غزنی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

باب (۲۱)

روداد سفر

فردوسی کو ہرات تک پہونچنے میں جن جن دشواریوں کا سامنا ہوا اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو ایسے حالات پیش آئے ہوں۔ بن جانا بوجھا راستہ زادراہ کی قلت، ضعیفی اور تنہائی کا عالم۔ اس پر قدم قدم پر گرفتار ہو جانے کا خطرہ، مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور خدا پر بھروسا کرکے آگے بڑھتا رہا۔ حاکم نے روانگی کے وقت چند دینار جو دیے تھے وہ خچر خریدنے اور پہلی ہی منزل پر کھانے پینے میں صرف ہو گئے۔ دو چار درہم باقی رہ گئے۔ ان کو وہ احتیاط سے صرف کرنے لگا۔ جس وقت بھوک بہت پریشان کرتی کچھ خرید کر کھا لیتا اور پھر خچر پر سوار ہو جاتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح اس کی مشکل آسان ہو گئی اور وہ ہرات کے نزدیک پہونچ گیا۔

فردوسی نے انتہائی سرعت کے ساتھ راستہ طے کیا تھا۔ پھر بھی اندیشہ تھا کہ اس سے قبل ہرات میں اس کی گرفتاری کا فرمان پہنچ نہ چکا ہو۔ اس لئے شہر میں داخل ہونے کے لئے رات کا وقت تجویز کیا اور رفتار کچھ کم کر دی۔ سورج غروب ہونے

کے وقت وہ شہر کے سامنے تھا لیکن وقت گذاری کے لئے ایک باغ میں ٹھہر گیا۔ وہیں نماز مغرب ادا کی اور اندھیرا ہو جانے پر چل پڑا۔ اس کا راہوار اس سے زیادہ تھکا ہوا تھا مگر وقت کی نزاکت کا لحاظ کر کے اس نے اپنی تھکن کا احساس کیا اور نہ جانور کو دم لینے دیا۔ قدم قدم چلتا ہوا شہر کے پھاٹک میں داخل ہو گیا اور ایک شاہراہ پر ہو لیا۔

ہرات میں فردوسی کے بہت سے ایسے شناسا تھے۔ جن کے آڑے وقت پر کام آنے کی امید ہو سکتی۔ ان میں اس نے اسمٰعیل وراق کو منتخب کیا اور اسی کے عالی شان مکان کی سمت گھوڑے کی باگ موڑ دی۔

اسمٰعیل وراق غزنی کی روانگی کے وقت بھی فردوسی کا میزبان بنا تھا۔ اس کے بعد سے غزنی کے زمانہ قیام میں جب کبھی فردوسی کا ہرات آنا ہوا وہ اسمٰعیل ہی کا مہمان رہا اور اسمٰعیل نے ہر موقع پر خلوص اور عقیدت کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اسی توقع پر اس نے اسمٰعیل کے گھر پناہ لینے کی ہمت کی۔ مکان کے سامنے پہونچ کر وہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ ملازم اس کو پہچانتے تھے۔ ایک ملازم نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور فردوسی مردانہ نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

اسمٰعیل اس کو دیکھتے ہی بڑھ کر بغلگیر ہو گیا۔ فردوسی بہت پریشان اور تھکن سے چور چور رہا تھا مگر اس نے بیٹھنے کے بجائے اسمٰعیل کو علیحدہ لے جا کر مختصر سرگذشت سنائی۔ اسمٰعیل تھوڑی دیر کے لئے متفکر ہو گیا۔ فردوسی نے اس کو متامل پا کر کہا کہ اگر اس کو پناہ دینے میں پس وپیش ہے تو وہ کہیں اور چلا جائے۔ اسمٰعیل اس کی بابت ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ سردست وہ سرائے میں جا کر مقیم ہو اور رات گذر چکے

مکان پر آجائے۔ فردوسی نے اسمٰعیل کے کہنے پر عمل کیا۔ الٹے قدم واپس ہو گیا۔ ملازم اس کو پلٹتے دیکھ کر متحیر رہ گئے، لیکن پاس ادب میں کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ فردوسی وہاں سے سیدھا ایک سرائے میں پہونچا اور اپنا نام و پتہ لکھا کر مقیم ہو گیا۔

صبح کو جب سرائے کے مالک نے مسافروں کا جائزہ لیا تو فردوسی کو موجود نہ پایا وہ رات کے کسی حصے میں اسمٰعیل کے مکان پر آ گیا تھا۔ اور اسمٰعیل نے ایک تہہ خانے میں اس کے قیام کا انتظام کر دیا تھا۔ جس سے صرف اسمٰعیل اور اس کا ایک وفادار ملازم واقف تھا۔

اسمٰعیل وراق کی اس احتیاط کی بدولت فردوسی ماخوذ ہونے سے بچ گیا۔ غزنی سے جب اس کی گرفتاری کا حکم پہنچا تو اسمٰعیل یہ کہہ کر چھوٹ گیا کہ فردوسی اس کے در پر آیا تھا مگر اسی وقت واپس ہو گیا۔ سرائے کے رجسٹر نے ایک شب قیام کی تصدیق کی اور صبح کو بے پتہ ہو جانا ظاہر کیا۔ جس سے یہ رائے قائم کی گئی کہ فردوسی ہرات میں آیا ضرور تھا لیکن ایک رات ٹھہر کر چلا گیا۔ یہی اطلاع غزنی کو بھیجدی گئی اور فردوسی اسمٰعیل کے تہہ خانے میں وقت گذاری کرتا رہا۔

اسمٰعیل فردوسی کا مربی اور قدردان تھا۔ اس کے ساتھ محمود کے برتاؤ پر اس کو بہت غم و غصہ تھا مگر محمود کے جبروت کے سامنے حرف احتجاج بھی زبان سے نکال نہ سکتا۔ فردوسی کی اس نے بہت مدارات کی اور کوئی تکلیف ہونے نہ دی لیکن اس محبس میں فردوسی کا جی نہ لگتا وہ ہر ہفتہ عشرہ بعد نکل کھڑے ہونے کے لئے تیار ہو جاتا اسمٰعیل اس کو سمجھا بجھا کر روک لیتا اور فردوسی پھر کچھ دنوں کے لئے اپنے ارادے کو ملتوی کر دیتا۔

اسمٰعیل کو خوف تھا کہ فردوسی اس کے تہہ خانے سے نکل کر محمود کے جنگل میں نہ پھنس جائے جس سے رہائی ممکن نہ تھی۔ وہ اس کو بھی جانتا تھا کہ محمود کی مرضی کے خلاف ایشیا کا کوئی تاجدار فردوسی کو پناہ نہ دے گا۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ مدت تک اس کو روک رکھنا چاہتا تا کہ اتنے ہی دنوں فردوسی کی جان بچی رہے۔

فردوسی کے تاثرات اسمٰعیل سے متضاد تھے اس کو نہ محمود کا ڈر تھا نہ اس کی طاقت کا خطرہ وہ زندگی ہی سے بیزار تھا۔ کسی دنیاوی قوت سے خائف کیوں ہوتا۔ غزنی سے بھی وہ اس طرح فرار نہ ہوتا مگر بالآخر پیچھے پڑ گیا۔ اور فردوسی نے یہ بھی خیال کیا کہ خطرات کا یقین کر لینے کے بعد حفاظتی تدابیر اختیار نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا اس کے ماسوا محمود سے انتقام لینے کا جذبہ اس شدت سے ابھر رہا تھا کہ اس کی ہجو کہے بغیر فردوسی کو قرار نہ تھا اور اس مقصد کے لئے غزنی کو چھوڑ دینا ضروری تھا۔ اسمٰعیل کے تہ خانے سے بھی طبیعت اسی لئے اکتا رہی تھی کہ دہاں کے قیام سے وہ سلطان غزنی کو کوئی سبق نہ دے سکتا۔

تہ خانے کی پرسکون فضا میں فردوسی کو بہ اطمینان حالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ از اول تا آخر اس نے اپنی زندگی پر نگاہ ڈالی اور تھوڑی دیر کے لئے مہاتما گوتم کے نظریہ سے متفق ہو گیا کہ ہر ذی روح کی حیات دراصل ایک المیہ ہوتی ہے۔ مسرت اور انبساط کو جس سے تضاد ہے خوشی کی جو گھڑیاں انسان کی زندگی میں آتی ہیں وہ بھی کرب معکوس کہے جانے کے مستحق ہیں۔ جن کے پس پشت درد و اندوہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فردوسی کو ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کلیہ سے اختلاف تھا۔ مگر زندگی کا عملی تجربہ جو اس کو ہوا تھا۔ وہ ایسا ہی کچھ تھا۔ طوس میں جب تک

رہا مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ غزنی آکر آسائش کا سامان پیدا ہوگیا اور زیبا کی شکل میں دل کے قرار کی ایک صورت نکل آئی اس کا یہ انجام ہوا اور اس عجلت میں وہاں سے نکلنا ہوا کہ زیبا سے آخری ملاقات بھی نہ کر سکا۔

حسین رقاصہ نے صوری یکسانیت کے ساتھ نوشابہ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا تھا اور بعض لمحات میں غیر ارادی طور پر فردوسی کو جوانی کی یاد آجاتی۔ زیبا سے اس کا لگاؤ اگرچہ جنسی نظریات سے قطعی مختلف تھا پھر بھی وہ حیات کی باقی ساعتوں کے لئے اس کی ضرورت محسوس کرتا۔ لیکن یہ ایک انہونی سی بات معلوم ہوتی تھی اور بادی النظر میں غزنی کے ساتھ زیبا بھی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی فردوسی کو اس کا دکھ تھا مگر دل کے تقاضے کے خلاف وہ دوبارہ اس سے ملنا نہ چاہتا تھا اس کی دو وجہیں تھیں پہلی بات تو یہ کہ وہ اپنے ساتھ زیبا کو آوارہ گرد بنانا پسند نہ کرتا۔ دوسرے اس کو اندیشہ تھا کہ زیبا کو دیکھ کر اس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا نہ ہو جائے —— فردوسی کی زندگی تو حقیقت میں اسی روز ختم ہوگئی تھی جس روز نوشابہ نے اس کی آغوش میں دم توڑا تھا۔ لیکن وہ بعض مقاصد کے لئے زندہ تھا۔ وہ مقاصد بھی اب پورے ہوگئے تھے۔ نوشابہ کی لاڈلی فرنگیس کا جو انجام ہونا تھا وہ ہو چکا تھا در شاہنامے کی تکمیل کا مرحلہ فردوسی کے سر پہلے ہی ہو چکا تھا اس کو کوئی حسرت تھی اور نہ نوشابہ کی آرزو ہی پوری کرنے کو باقی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس کا وجود خود اس کی نگاہ میں دنیا پر بار تھا۔ اسی لئے وہ بار بار کھلی ہوئی فضا میں نکلنے کی ہمت کرتا تاکہ محمود کی عہد شکنی اور بخل کے واقعہ کو چار دانگ عالم میں پھیلا کر ذرے ذرے کو اپنی حق تلفی کا گواہ بنائے پھر اس کا

کوئی بھی تشریح ہو۔ فردوسی کو اس کی پرواہ نہ تھی۔

ایک روز اس نے ہرات سے چلے جانے کا عزم مصمم کر لیا اور اسمٰعیل جب دوپہر کو اس کے پاس آیا تو اس نے کہہ دیا کہ اگر وہ بخوشی اجازت نہ دے گا تو فردوسی چھپ کر نکل جائے گا۔ اسمٰعیل مجبور ہو گیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے کو کہہ کر چلا گیا آفتاب کو دامنِ مغرب میں منہ چھپائے ہوئے جب کئی گھنٹے گذر گئے اور عروس شب کا آنچل روئے زمین پر لہرانے لگا تو اسمٰعیل نے اس کو تہہ خانے سے باہر نکالا دیر تک بغلگیر رہا۔ پھر ایک وفادار غلام کو ہمراہ کر کے رخصت کر دیا۔ چلتے وقت کئی سو دینار کی ایک تھیلی زادِ راہ کے نام سے پیش کی۔ جس کو لے کر فردوسی نے ایک لفافہ اس کے سپرد کیا اور زیبا کے پاس بھجوا دینے کی التجا کی۔ اسمٰعیل نے وعدہ کر لیا اور فردوسی نے اسمٰعیل کو دعائیں دیتے ہوئے قدم بڑھا دیئے۔

شہر کے باہر ایک گھوڑا ساز و یراق سے آراستہ اس کا منتظر تھا۔ غلام نے سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھا دیا اور فردوسی نے غلام کے سلام کا جواب دے کر باگ ڈھیلی کر دی۔ غزنی سے فردوسی کے طوس جانے کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس نے وطن سے نکلنے کے بعد شاہنامے کے تکملے سے قبل ادھر کا رخ نہ کیا کیونکہ غیور باپ کو بیٹی سے نگاہ چار کرنے کا یارا نہ ہو گا۔ وہ خرنگیس کے عقد کے لئے دولت کی فراہمی کی خاطر نکلا تھا۔ جس میں کامیابی حاصل کئے بغیر اپنی باعث شرم تھی اگرچہ حسین قتیب نے اس کے فرض کو پورا کر دیا تھا۔ لیکن فردوسی کا کردار اس کی اجازت نہ دیتا کہ خالی ہاتھ طوس پلٹ کر جائے اور اہلِ وطن کو مذاق اڑانے کا موقع دے۔ نو دس سال کا زمانہ بھتیجی بیٹی کو دیکھے بغیر کس طرح گذرا ہو گا اس کو

باپ کا کلیجہ جانتا ہوگا مگر مستقبل کی امید نے شقاوت کو قابل برداشت بنا دیا اور وقت آخر کار کٹ ہی گیا۔ فردوسی شاہنامہ ختم ہونے کے دن بہت خوش تھا اور فرنگیس کا تصور کر کے نوشابہ کو پکار رہا تھا لیکن اس کی قسمت میں خوشی دیکھنا لکھا ہی نہ تھا قرآن العجم کا صلہ ملنے کے بجائے جان بچانا دشوار ہوگیا اور بساط ارض اس کے لئے تنگ ہوگئی۔

ہرات سے روانگی کے ہنگام فردوسی نے طے کیا تھا کہ طوس نہ جائے گا اور اسمٰعیل نے بھی یہی رائے دی تھی کیونکہ گمان غالب تھا کہ محمود نے عامل طوس کو اس کی گرفتاری کے لئے خاص ہدایات بھیجی ہوں گی۔ فردوسی کے لئے طوس کا عزم نہ کرنے میں اس سبب کے علاوہ ایک بات اور مانع تھی۔ وہ فرنگیس کے سامنے جانے سے ڈرتا تھا۔ اس کی ہمت ساتھ نہ دیتی کہ مدت مدید کے بعد بیٹی کے روبرو جائے بھی تو تنگدستی کے عالم میں کیا اس کو منہ دکھائے۔ فرنگیس کے تصور کے ہنگام اکثر اس کے آنسو نکل آتے مگر وہ شیت پر شاکر رہنے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے صبر و سکون کے ساتھ جو فیصلہ اس نے کیا تھا۔ وہ یہی کہ باقی عمر ادھر ادھر گھوم پھر کر گزار دے گا اور مسافرت کی کسی ساعت میں قید ہستی سے آزاد ہو جائے گا۔

ہرات سے چل کر ایک منزل تک وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ مگر فردوسی بھی آخر کو ایک انسان تھا۔ ایک رات محبت پدری نے اس قدر غلبہ حاصل کر لیا کہ فرنگیس کے سوا وہ کائنات سے بے خبر ہوگیا۔ سونے کا وقت خیال ہی خیال میں گذر گیا اور دوسری رات جانے پر وہ چلنے کے لئے آمادہ ہوا تو تصور میں طوس کے در و دیوار منڈلا رہے تھے اور اس کے گھوڑے کا رخ وطن کی طرف تھا۔

ایک منزل طے کرکے عاقبت اندیشی پھر مانع ہوئی۔ فردوسی نے کسی دوسری سمت کا ارادہ کیا اور دیر تک ایک ششں و پنج میں پڑا رہا۔ آخر کار قرعۂ فال فرنگیس کے حق میں نکلا۔ اس لئے منتظر بیٹی کو ایک نظر دیکھ لینے ہی کا فیصلہ کرلیا اور گھوڑے کی رفتار کچھ تیز کردی۔

فردوسی کی زندگی میں وہ لمحات یادگار تھے جب دس سال کے بعد اس نے طوس کی عمارتوں کے کنگرے دیکھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور تنفس کی رفتار دو چند ہو گئی تھی روا داری کرتا ہوا وہ بڑھتا رہا۔ مگر شہر کے قریب پہنچ کر خیال آیا کہ وہ سلطنت غزنی کا مجرم ہے۔ عامل طوس اس کو گرفتار نہ کرلے رات ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے فردوسی قریب کے ایک موضع کی طرف مڑ گیا مگر چند ہی قدم چل کر ٹھہر گیا اور قریب کے کسی دوسرے قریہ کی طرف جانے کے بجائے "شاداب" کا رخ کردیا۔

فردوسی نے جب اجداد کی جاگیر کی حد میں قدم رکھا تو شام ہونے کے قریب تھی۔ سورج تیزی سے ڈوب رہا تھا۔ اس کی آخری کرنیں فضائے آسمانی میں تھرک تھرک کر غائب ہو رہی تھیں۔ فردوسی نے گرد و پیش پڑے ہوئے سبزہ زار پر نظر ڈالی۔ سر اٹھا کر آسمان کی دلفریبی کو دیکھا اور اس کے آنسو نکل آئے۔ وطن کی محبت بھی عجیب شے ہوتی ہے اسی بیاسی سال کا شاعر ایک طفل بے شعور کی طرح بلک رہا تھا۔ انھیں کھیتوں اور انھیں باغات کے درمیان بچپن کی فردوسی زندگی گذر رہی تھی وہاں ماحول کے ایک ایک ذرے سے مانوس تھا۔ ہر شے اس کو قدموں سے لپٹتی محسوس ہونے لگی۔ فردوسی نے ان کے خلوص پر عقیدت کے موتی نچھاور کئے اور گھوڑے کو قدم قدم بڑھاتا ہوا قریہ میں داخل ہو گیا۔

جاگیردار کی حویلی سنسان اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ چند پشتینی ملازم فخر الدین احمد کے وقت سے چلے آ رہے تھے وہ اس کے ایک حصے میں رہتے۔ گاؤں کے بعض بوڑھوں نے فردوسی کو پہچان لیا اور اس کے گرد گھیرا بنا لیا۔ فردوسی گھوڑے سے اتر کر ان سے پرت گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے موضع میں خبر پھیل گئی اور تمام چھوٹے بڑے جمع ہو گئے۔ فردوسی ایک ایک سے گلے ملا۔ اندھیرا ہونے تک موضع میں ٹھہرا، پھر گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر پا پیادہ طوس کی طرف چل پڑا۔

اس نے اپنے چہرے کو چھپانے کے لئے سر پر ایک رومال ڈال لیا تھا۔ اور پھاٹک سے داخل ہو کر غیر معروف گلیوں میں جا رہا تھا تاکہ شناخت کئے جانے کا امکان کم ہو جائے اس احتیاط کے باوجود بعض مقامات پر اس کو نظریں اپنی طرف اٹھتے معلوم ہوئیں فردوسی نے رفتار کچھ تیز کر دی اور حسین قتیب کے مکان کے سامنے پہنچ گیا طوس کا امیر زادہ رئیسانہ شان کے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ بو دلف اور علی دیلم بھی اتفاق سے موجود تھے۔ فردوسی تھوڑے فاصلہ پر ٹھہر گیا۔ حالانکہ مخلص احباب کو دیکھ کر ضبط دشوار تھا۔ لیکن مصلحت اپنے پر جبر کرنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ فردوسی کو ایک مقام پر ساکت پا کر حسین قتیب نے کوئی شریف سائل تصور کیا اور اٹھ کر قریب آ گیا۔ چند درہم اس کی مٹھی میں تھے جن کو وہ راز داری کے ساتھ پیش کرنا چاہتا تھا۔ فردوسی نے منہ دیوار کی جانب پھیر کر رومال ہٹا دیا اور حسین قتیب مضطر ہو کر لپٹ گیا۔ پھر اس کو فردوسی کی موجودہ حیثیت کا خیال آ گیا اور کسی خدائی مظاہرے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر زنانی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

بو دلف، علی دیلم اور دوسرے لوگ حسین قتیب کے ایک اجنبی سے ملاپ

پر متعین تھے۔ مگر ان کو کسی پرسش کا موقع نہ ملا۔ اور حسین قتیب فردوسی کو اندر لئے چلا گیا چند منٹ کے وقفے سے وہ باہر آیا تو بودلف نے پوچھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن حسین قتیب بودلف اور علی دیلم کے علاوہ باقی لوگوں سے معذرت کرنے لگا۔ کہ وہ اس وقت کچھ گھریلو مصروفیت میں ہے ان سے معافی چاہتا ہے۔ وہ لوگ اٹھ کر کھڑے ہوگئے تو اس نے بودلف اور علی دیلم کو عقب میں آنے کا اشارہ کیا۔ اور خود زنانے مکان میں چلا گیا۔

بودلف اور علی دیلم فردوسی کو دیکھ کر ایک ساتھ دوڑ پڑے اور فردوسی کے دونوں پہلو دو دوستوں کی آغوش میں آگئے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور جذباتی ماحول چھایا ہوا تھا۔ فردوسی نے مختصر سی نشست میں اپنی ساری روداد سنا دی۔ طوس میں محمود کی فردوسی سے ناراضگی کی خبر گشت کر رہی تھی لیکن اسکے اسباب معلوم نہ تھے۔ حسین قتیب محمود کی پیمان شکنی پر برہم ہوگیا۔ مگر فی الفور محمود کے مقابلہ میں اپنی حیثیت یاد آگئی۔ اور وہ بے بسی کا احساس کرکے رہ گیا۔

فردوسی کا طوس میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بالخصوص حسین قتیب کے مکان پر کیونکہ وہ فردوسی کا خاص دوست سمجھا جاتا۔ عامل طوس کو فردوسی کے ورود کی خبر لگ جاتی تو سب سے پہلے حسین قتیب کے مکان کی تلاشی لی جاتی۔ اس لئے حسین قتیب نے بلا توقف بودلف اور علی دیلم سے مشورہ کیا کہ اس کو کس مقام پر ٹھہرایا جائے؟ فردوسی کسی رائے زنی سے قبل بول اٹھا کہ وہ صرف ایک رات قیام کرے گا۔ اس لئے کسی دوسرے مسکن کی تجویز

بے سود ہوگی۔ اس کے دوستوں نے بھی اصرار نہ کیا۔ کیونکہ وہ حالات سے کماحقہ واقف تھے۔ ان کے نزدیک طوس میں اس کا قیام دانشمندی کے خلاف تھا تاہم یہ سوال حل طلب تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔؟ چنانچہ بودلف فوراً پوچھ بیٹھا کہ طوس سے وہ کس طرف کو روانہ ہوگا؟ فردوسی نے فوراً اپنے وطنی فرمانرواؤں کے نام لے لئے۔ حسین قتیب نے اس سے اتفاق کیا، اور دو چار روز ٹھہر کر اس کا چلا جانا طے ہوگیا۔

فردوسی کے احباب اس کو بہت عزیز رکھتے مگر وقت ایسا آپڑا تھا کہ ان کی کوئی کوشش فردوسی کے کام نہ آسکتی۔ جی نہ چاہتا تھا کہ اتنی جلد وہ اس کو رخصت کردیں۔ لیکن سلطان محمود کا خوف روکنے کی اجازت نہ دیتا۔ دو تہائی رات گزرنے تک وہ بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد بودلف اور علی دیلم رخصت ہوگئے۔ اور فردوسی و حسین قتیب بھی آرام گاہ میں داخل ہوگئے۔

صبح کو فرنگیس آکر میکے گئی۔ حسین قتیب نے اشتیاق سے باپ بیٹی کو ملنے کا موقع دیا۔ یہ ایسا وقت آخر ساں تھا کہ حسین قتیب اپنے آنسو روک نہ سکا۔ باپ کو بیٹی سے محبت تھی اور بیٹی کو باپ سے فراموش کردینے کا شکوہ مگر وہ گھڑیاں ایسی تھیں کہ کسی کو کوئی شکوہ شکایت نہ رہی تھی۔ جذبات شدت کے ساتھ امنڈ رہے تھے۔ حسین فرنگیس کے رخسار اور بوڑھے فردوسی کی ریش سفید اشکوں سے تر تھی اور دونوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

فردوسی نے تین شبانہ روز طوس میں قیام کیا۔ اس دفعہ میں فرنگیس تھوڑی دیر کے لئے سسرال گئی اور پھر حسین قتیب کے گھر آگئی۔ فردوسی نے

اب تک نوشابہ کی کنیز کو نہ دیکھا تھا۔ ایک شام کو خود بخود اس کا خیال آ گیا۔ اس نے نرگیس سے دریافت کیا۔ نرگیس نے آبدیدہ ہو کر بتایا کہ چند روز قبل وہ سفرِ آخرت کر گئی۔ فردوسی کو وفادار کنیز کی موت کا صدمہ ہوا مگر ایک آہ بھر کر رہ جانے کے سوا اس نے کچھ نہ کہا۔ کسی کی موت کا زیادہ غم زدہ کیوں کرتا جبکہ خود مرنے کی تیاری کر رہا تھا اور آنے والا کوئی لمحہ اس کو کشمکش حیات سے نجات دلا سکتا۔

فردوسی کی روانگی میں چند گھنٹے باقی تھے مگر اب تک وہ داماد سے نہ ملا تھا۔ نرگیس کو اس نے اول دن منع کر دیا تھا کہ وہ اس سے تذکرہ نہ کرے۔ اس ممانعت میں اس کے اس جذبہ کو دخل تھا کہ بے بسی کے عالم میں وہ اس سے کیا ملاقات کرے۔ بیٹی کے بارے میں تو فطری محبت سے مجبور ہو گیا اور تھوڑی سی خفیف سی ہتک برداشت کر لی۔ لیکن داماد کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت اس کو نہ ہوتی۔ نرگیس نے باتوں باتوں میں کئی مرتبہ کہا کہ بات رہ جائے گی۔ فردوسی ہر بار روٹھا اور نرگیس چپ سی بن کر رہ گئی۔

چلنے کا وقت قریب آیا تو حسین قتیب نے محسوس کیا کہ نرگیس کے رفیقِ زندگی کو اگر فردوسی سے نہ ملایا گیا اور بعد میں اس کو فردوسی کے آنے کا حال معلوم ہوا تو تکلیف ہو گی۔ اس نے اسی وقت سو پچاس دیناروں کا انتظام کیا۔ کچھ رقم اسمٰعیل کے دیے ہوئے زادِ راہ میں باقی تھی۔ ان دیناروں کو اس میں شامل کیا۔ اور ایک مخصوص آدمی بھیج کر نرگیس کے شوہر کو بلا بھیجا۔ وہ فوراً آ گیا تو حسین قتیب نے زنان خانے میں لے جا کر فردوسی کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ذکی الحس شاعر داماد کے یکایک آ جانے سے گھبرا گیا مگر اخلاقاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے اور اس رشتہ سے الگ ہو کر بھی آپس میں خلوص رکھتے۔ فردوسی کی آنکھیں بھر آئیں۔ کسی رکا لمہ

کے شروع ہونے سے قبل حسین قتیب آگیا اور ایک رومال میں بندھے ہوئے دینار فردوسی کی طرف سے داماد کو پیش کر دیئے۔

وقت مختصر سے مختصر تر ہوتا جارہا تھا۔ اور فرنگیس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ فردوسی نے اس کو قریب بٹھا کر تسکین دی کہ اب وہ اس سے زیادہ دنوں کے لئے جدا نہ ہوگا اور جس مقام پر ٹھہرے گا۔ وہاں سے اس کو بلوائے گا۔ اس کے لئے اس نے داماد سے وعدہ لیا کہ اس کی طلبی پر فرنگیس کو بھیجنے میں عذر نہ کرے گا۔ فرنگیس کی کسی طرح تسلی نہ ہوتی اور وہ ایک تسلسل سے روئے جارہی تھی ایک بیٹی کے لئے واقعی رونے کا محل بھی تھا۔ ماں صغیر سنی میں مرچکی تھی آنکھ کھول کر اس نے باپ ہی کو دیکھا تھا۔ وہ یک بار بچھڑ کر دس سال بعد ملا تھا۔ اور وہی باپ دوبارہ کسی لا انتہا ہی مدت کے لئے جارہا تھا۔ فرنگیس کا دل امنڈا آرہا تھا۔ اور روتے ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ حسین قتیب نے سمجھا بجھا کر دھیما کیا اور فردوسی محبوبہ کی یادگار پر ایک یاس انگیز نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔

طوس کا ذرہ ذرہ فردوسی کے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ احباب سے اس قدر جلد جدا ہو جانے پر دل میں تڑپ ہو رہی تھی مگر حاکم طوس کی طرف سے گرفتاری کے خطرے کے سوا فردوسی کو ایک کام ابھی کرنا تھا۔ جس کے لئے طوس سے چلا جانا ضروری تھا۔ یہ کام تھا عالم اسلام میں محمود کی رسوائی کرنا۔ شاعر کی بوڑھی رگوں میں انتقام کا ایک جذبہ موجزن تھا۔ اور وہ اپنی محرومی اور سلطان غزنی کی پیمان شکنی کی داستان سارے عراق اور وسط ایشیا میں پھیلا دینے کو بے چین تھا۔ حسین قتیب علی دیلم اور بودلف نے آبدیدہ ہو ہو کر اس کو رخصت کیا۔ اور رات کے سناٹے میں اس نے

وطن کی سرزمین کو الوداع کہہ دیا۔

فردوسی کی زندگی میں زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی آفتاب کے گرد اسی بیاسی چکر کر چکی تھی۔ اس نے زمانے کے گرم و سرد کا اچھی طرح تجربہ حاصل کیا تھا۔ طوس سے روانہ ہو کر جس مقام پر پہونچا بے خوف و خطر وہ جو کے اشعار پڑھ کر سناتا رہا اور ایک روز قیام کر کے آگے بڑھ گیا۔

اس کو جان کی پرواہ نہ تھی پھر بھی وہ زائد سے زائد دنوں تک ماخوذ ہونے سے بچتا جاتا تھا اس لئے ہر منزل پر نڈر ہو کر اپنی محرومی کے واقعات بیان کرتا۔ شاہنامے کے شعر پڑھتا اور کوئی گرفت ہونے سے پہلے کوچ کر دیتا۔ اس طرح منزلوں پر منزلیں کرتا ہوا قہستان تک پہنچ گیا۔ ناصر لک وہاں کا فرمانروا تھا۔ اس نے شاہنامہ کے مصنف کا استقبال کیا اور شایان شان مہمان نوازی کی۔ فردوسی کا ارادہ کسی ایک جگہ پر زیادہ دن ٹھہرنے کا نہ تھا۔ مگر ناصر لک کی قدردانی نے مجبور کر دیا اور وہ قہستان میں مقیم ہو گیا۔

عاقل کو فردوسی کی روانگی کے بعد اس کے طوس آنے کی خبر ہوئی۔ اس نے اسی وقت حسین قتیب، بودلف اور علی دیلم کو طلب کر کے دریافت کیا۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ عاقل نے تعاقب میں سوار دوڑا دیئے۔ لیکن کوئی امید دجہ کو پسند نہ ہوئی۔ کیونکہ فردوسی قہستان پہنچ چکا تھا۔

ناصر لک فردوسی کا مخلص میزبان ثابت ہوا۔ اخزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ ایک مختصر سی حکومت کا مالک تھا۔ مگر چند روز کے برتاؤ سے اس نے فردوسی کی دل شکستگی کو کم کر دیا اور فردوسی کو عرصہ کے بعد قہستان میں اطمینان

کا سانس لینا نصیب ہوا۔ تاہم وہ ایک بے چینی سی محسوس کرتا رہا۔ اس کی زندگی کا وقفہ مختصر ہوتا جا رہا تھا۔ اور ابھی اس کو وسط ایشیا اور عراق کا دورہ کرنا تھا جو اس کا آخری مقصد حیات رہ گیا تھا۔

باب (۲۲)

باوفا غلام

فردوسی جس عالم میں غزنی سے نکلا تھا، زیبا اور ماہ رخ کے فرار کی نوعیت بھی ویسی ہی تھی مگر وہ نہ فردوسی کی طرح بے مایہ تھیں نہ بے سروسامان۔ ان کے ساتھ زرو جواہر اور دیناروں کی ایک معقول تعداد تھی اور اکل و شرب کا واجبی انتظام بھی جس کو غلام نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ کچھ دور پیدل چل کر گھوڑوں کا بندوبست ہو گیا اور فردوسی کی تقلید میں وہ غیر معروف راستوں پر ہرات کی سمت بڑھنے لگیں۔

دوسرے دن وزیر اعظم کے حضور میں زیبا کی پیشی کا بلاوا تھا۔ جب وہ معینہ وقت پر حاضر نہ ہوئی تو جستجو کی گئی اور مکان پر ایک کنیز کے سوا کوئی موجود نہ ملا۔ کنیز ان کی فراری سے لاعلم تھی۔ اس کا خیال تھا کہ غلام کے ساتھ کہیں گئی ہوں گی کیونکہ اس کو کسی نے کچھ نہ بتایا تھا۔ صبح کو وہ بیدار ہوئی تو سب کو غائب دیکھ کر سمجھی کہ کہیں اچانک تفریح کو نکلی ہیں۔ جب دوپہر گزر گئی اور واپسی نہ ہوئی تو یہ رائے قائم کی کہ کسی کے وہاں دعوت میں مدعو ہوں گی۔ سرکاری آدمیوں کی پرسش پر یہی اس نے کہہ دیا اور سارے غزنی میں رقاصاؤں کے یکایک روپوش ہو جانے کا چرچا ہونے لگا۔

سلطان کو اطلاع کی گئی۔ اس نے تلاش کرنے کا حکم دیا۔ شہر کا چپہ چپہ چھان ڈالا گیا اور کوئی پتہ نہ چلا تو سوار تعاقب میں دوڑائے گئے۔ مگر زیبا کو آدھی رات اور پورے دن کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دو منزلیں طے کر چکی تھی۔

بزرگ احمد اور ابوسہل کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی اور فردوسی کے بعد ماہ رخ بھی ان کو فریب دے کر نکل گئیں۔

زیبا، ماہ رخ اور وفا غلام کی قیادت میں شب و روز چلتی رہیں اور جلد ہی ہرات کے قریب پہونچ گئیں۔ شہر جب ایک منزل کی مسافت پر رہ گیا تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر گرفتاری کا خطرہ ابھی دور نہ ہوا تھا اس لئے وہ عام نگاہوں سے بچتی ہوئی جا رہی تھیں اور شاہراہ کو چھوڑ کر ایک نزدیک ترین راستہ اختیار کر لیا تھا۔

آفتاب کے نصف النہار تک پہونچنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ ہرات کا فاصلہ صرف چند میل رہ گیا تھا۔ زیبا اور ماہ رخ نے اپنی رفتار کچھ دھیمی کر دی تھی۔ محمود کا خوف کلیتہً دور نہ ہوا تھا تاہم جلد ہی ان کو ایک مامن مل جانے کی امید تھی۔ اس لئے کسی حد تک وہ مطمئن تھیں۔ غزنوی غلام ان کے قدم بقدم تھا اور وفادار محافظ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ان کے گھوڑے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ زیبا راستے سے واقف تھی اور سب سے آگے چل رہی تھی۔ یکایک اس کو سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دی۔ زیبا کو اس سے کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ شہر نزدیک آ چکا تھا۔ ہرات کے کسی رئیس کا گذر غیر متوقع نہ تھا۔ پھر بھی اس کو تجسس پیدا ہو گیا۔ ماہ رخ اور غلام کی نظریں بھی پڑ گئیں۔ ایک نے دوسرے کو توجہ دلائی

اور گھوڑا گاڑی کے قریب پہونچنے کا انتظار کیا جانے لگا۔

گاڑی ان کے مقابل آکر رک گئی۔ زیبا نے اپنا گھوڑا گاڑی کے برابر کر لیا اور جیسے ہی اس نے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"ارے اردوان تم ______ !"

گاڑی کی ایک سیٹ پر اردوان بیٹھا ہوا تھا دوسری پر ایک شخص چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ زیبا کی چیخ پر اس نے چادر منہ سے ہٹا کر دیکھا۔ اور زیبا اس کو پہچان کر دوبارہ چیخ پڑی۔ "قابوس بابا ______ !"

زیبا کو دیکھ کر قابوس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بے پناہ جذبات میں ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے اٹھ کر بیٹھ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر سر کو جنبش دے کر رہ گیا۔ اس وقت میں زیبا گھوڑے سے اتر کر گاڑی کے اندر آ گئی تھی۔ آتے ہی قابوس کا حال پوچھا اسکو نقل و حرکت دشوار ہو رہی تھی۔ اس نے نحیف آواز میں کچھ کہا۔ جس کو زیبا سن نہ سکی۔ اردوان بیان کر رہا تھا۔ وہ کئی مہینے سے بیمار ہے اور ہرات میں جب صحت ہوتے نظر نہ آئی تو اردوان اسکو لیکر غزنی جا رہا تھا۔

غزنوی غلام اور ماہ رخ بھی گھوڑوں سے اتر کر گاڑی کے دونوں طرف آ کر کھڑے ہو گئے تھے زیبا نے چند ضروری باتیں پوچھیں اور دو چار منٹ کے توقف سے ہرات واپس چلنے کو کہہ دیا۔ ایک گھوڑا گاڑی اور تین گھوڑوں کا قافلہ پھر ہرات کی جانب چل پڑا۔ زیبا نے اردوان کو اپنا گھوڑا دے دیا اور خود اس کی جگہ گاڑی پر بیٹھ گئی۔ قابوس کے چہرے سے انتہائی نقاہت ٹپک رہی تھی۔ مگر زیبا کو دیکھ پاکر ایک رونق آ گئی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کے راستہ کو کتراکر بچ نکلے گی

کی منزل کی سمت بڑھ رہا تھا۔

راستہ میں زیبا نے قابوس سے اس کی روداد سفر دریافت کی اور قابوس نے دم لے لے کر ایک لمبی چوڑی داستان کو مختصر کرنے لگا۔

زیبا کے نزدیک اس عالم میں قابوس کو کسی طول طویل بیان کی تکلیف دینا مناسب نہ تھا لیکن وہ اس کی سرگذشت سننے کو اس قدر مضطرب تھی کہ اس خطرے کو نظر انداز کر گئی۔

زیبا کو اس کی غائت سفر صرف اس قدر معلوم تھی کہ وہ اردوان کی تلاش میں نکلا تھا لیکن قابوس نے اس کو بتایا کہ وہ ماہ رخ کے لئے کسی موزوں شوہر کی جستجو میں بلخ، بخارا اور ماوراء النہر کے دوسرے شہروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اور وہ دونگیر کے نظریات سے بے داغ خون کے کسی نوجوان کی فکر میں رہا۔ جس سے اپنی آقا زادی کا دامن وابستہ کر سکے۔ اسی سلسلہ میں اس نے اردوان کا بھی خیال رکھا۔ مگر شومی قسمت سے نہ اردوان کا پتہ چلا اور نہ سام بن نریمان کی نسل سے کوئی فرد ایسا ملا جس کی نجابت پر یقین کیا جا سکتا۔ بخارا میں ایک شخص نے اردوان کے بارے میں اطلاع کی کہ وہ ہرات کے قریب کسی قریہ میں مقیم ہے۔ قابوس فی الفور وہاں پہنچ گیا۔ اور اردوان کو پا لیا۔

اردوان غزنی سے جان بچانے کے لئے نکلا تھا۔ مگر آزادی کی فضا میں پہنچ کر اس نے اپنے آقا اسمٰعیل بن سبکتگین کے لئے کچھ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بلخ اور ہرات کے مضافات میں لوگوں کو سلطان محمود سے بغاوت پر آمادہ کیا اور ایک مدت تک اسی دوڑ دھوپ میں لگا رہا۔ مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ سلطان کے جبروت کے سامنے بہت کم لوگ سر اٹھانے کی جرأت کر سکے۔ آخر مایوس ہو کر اردوان ہمت ہار بیٹھا اور گمنامی

میں زندگی گذار دینے کا عزم کر لیا۔

اسمٰعیل کے لئے جدوجہد میں اردوان کا جی بہلا ہوا تھا۔ مگر یہ مشغلہ ترک ہو جانے سے وقت کاٹنا دشوار ہونے لگا۔ اور زیبا کی یاد پریشان کرنے لگی۔

یہ حقیقت ہے کہ اردوان زیبا کو بہت چاہتا اور اس کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا کوئی مرد کسی عورت کے لئے جو کر سکتا ہے۔ جس وقت تک بغاوت کرانے کی سعی اس کا نصب العین رہی اس وقت تک تو محبت کا جذبہ اعتدال سے متجاوز نہ ہو سکا۔ لیکن جب تمام مشاغل ترک ہو گئے۔ اور بادی النظر میں زندگی کا کوئی مقصد باقی نہ رہ گیا۔ تو ہمہ وقت ایک تصویر حافظہ میں گردش کرنے لگی۔ اور اردوان شب و روز اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

زیبا اس کی دسترس سے باہر تھی۔ اردوان اتنا ناسمجھ نہ تھا جو اب بھی زیبا کو حاصل کر سکنے کی امید کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے فردوسی پر حملہ کر کے حسین رقابت کو پانے کا رہا سہا امکان ختم کر دیا۔ قوت ارادی کے بل پر وہ زیبا کو بھول جانے میں کوشاں ہوتا۔ مگر محبت آپ ہو تو بھی محبت کی [illegible] مجبور بے بس ہو گئی تھی۔ جو ارادے کی تابع نہ تھی۔ اور نہ بھولنے کی کوشش سے بھلائی جا سکتی۔ نتیجہ میں وہ جب جذبے پر قابو نہ پا سکا تو [illegible] کی طرف نکل گیا [illegible] نظر نہ آئی تو ہرات کی سمت بھاگ نکلا۔ اور شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہوا ایک محلہ میں کسی شناسا کے یہاں جا کر ٹھہر گیا۔

اردوان ایک مضبوط قویٰ کا انسان تھا۔ مگر ذہنی اور جسمانی تکلیف میں اس کا جسم متاثر ہونے لگا۔ اور آخر کار وہ پلنگ سے لگ گیا۔ قابوس جب اس کا

پتہ پاکر موضع میں پہنچا تو اس کی حالت خیر تھی۔ قابوس نے دل لگا کر تیمارداری کی اور اس کی توجہ سے چند ہی روز میں اردوان کو افاقہ ہونے لگا۔ وہ زندگی سے مایوس نہ ہوا تھا۔ مگر درحقیقت جینے کی تمنا اس کو نہ رہی تھی۔ ایک روز اس نے تنہائی میں قابوس سے کہا کہ اگر وہ مر جائے اور جیتے جی زیبا سے نہ مل سکے تو قابوس اس کی غلطیوں کو زیبا سے معاف کرا دے۔ قابوس نے اس کو تسلی دی کہ وہ اچھا ہو جائے گا اور زیبا سے ملے گا۔ اسی سلسلے میں اس نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ زیبا اس کو اپنا بنانے پر تیار ہے اور وہ اسی کی تلاش میں غزنی سے نکلا ہے۔ قابوس کے ان فقروں نے اردوان کے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑا دی اور وہ اس دن سے کھوئی ہوئی تندرستی کو بسرعت حاصل کرنے لگا۔ حتیٰ کہ چار پانچ ہفتوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

اردوان کو فردوسی سے ندامت تھی اپنے فعل کی نامعقولیت کا احساس تو حملہ کرنے کے فوراً بعد سے ہونے لگا تھا اور اس کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا رہا وہ جذبۂ انتقام کو برا کہتا رہا۔ جب بھی تذکرہ ایک دن اس نے قابوس سے اظہار خجالت کیا۔ قابوس نے اس کے جواب میں فردوسی اور زیبا کے درمیان ہونے والے واقعات کو دہرا دیا اور اردوان شاعر اعظم کو انسانیت کی حدوں سے بلند دیکھنے لگا۔ اس کا دل فردوسی کے تصور کے سامنے جھک گیا اور فردوسی اس کو پیکر انسانیت میں کوئی آسمانی مخلوق نظر آنے لگا۔

اردوان کے صحت یاب ہونے پر قابوس اس کو لے کر ہرات آ گیا۔ اسی زمانے میں فردوسی کے معتوب ہونے کا شہرہ ہوا اور یہ خبر بھی سنائی دی کہ وہ غزنی

سے فرار ہو گیا۔ قابوس اور اردوان دونوں فردوسی کے لئے تڑپ اٹھے۔ وہ صبح و شام غزنی کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ لیکن فردوسی کی مفروری کی اطلاع پاکر کچھ دنوں کے لئے عزم سفر ملتوی کر دیا۔ تاکہ ہرات ہی میں فردوسی سے ملاقات کر کے حالات معلوم کر لیں۔ قابوس کو یقین تھا کہ فردوسی غزنی سے بھاگ کر ہرات ہی آئے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے شہر کے مقابلہ میں ہرات اس کے لئے محفوظ تھا کم تھا۔ وہاں کئی آدمی تھے جو فردوسی کے لئے اپنی جانیں تک نچھاور کر سکتے قابوس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ فردوسی ہرات آیا۔ اس کی خبر اردوان اور قابوس کو ہوئی مگر اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ سرائے میں ایک شب قیام کر کے کسی جگہ کو چلا گیا۔ ان کو فردوسی سے مل نہ سکنے کا افسوس ہوا۔ لیکن کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ فردوسی نہ جانے کس طرف کو گیا تھا۔ تعاقب بھی کیا نہ جا سکتا۔ اردوان نے تلاش میں جانے کی تجویز کی۔ مگر قابوس نے اس کوشش کو بے سود قرار دیا۔ بغیر پتہ نشان کے وہ کہاں جاتے ؟

قابوس اور اردوان کے دل زیادہ ہی لگے ہوئے تھے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے کہ فردوسی کے مفرور ہو جانے کے بعد نہ جانے اس پر کیا گذری ہوگی آخر ایک روز آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے غزنی کا رخ کرنے کا ارادہ کر لیا مگر خیال کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہ آئی اور قابوس کی اچانک علالت نے پروگرام ملتوی کرا دیا۔

قابوس کم و بیش عمر کی سو بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس کے قویٰ عمر طبعی کو پہنچ جانے کے باعث کمزور ہو گئے تھے۔ معمولی بیماری نے کافی اثر کیا اور اس کی حالت روز بروز

بروز بگڑنے لگی ابھی چند روز قبل اس نے زیبا کے منگیتر کی حیثیت سے اردوان کی تیمارداری کی تھی۔ اب اردوان کی باری تھی وہ اس کی خدمات کا بدل کرنے لگا۔ مگر ساعی بے نتیجہ ہوئیں۔ قابوس کی صحت جواب دیتی رہی اور نقل و حرکت دشوار ہوگئی

قابوس کو جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اردوان سے کہا کہ وہ اس کو اسی حالت میں غزنی تک پہنچا دے تاکہ قابوس مرنے سے قبل اپنی آزادی کو دیکھ لے ایسے مریض کے لئے اتنا دور دراز کا سفر اندیشے سے خالی نہ تھا۔ مگر اردوان قابوس کی آرزو پوری کرنے کو تیار ہو گیا۔ اور ایک گھوڑا گاڑی کا انتظام کر کے آہستہ آہستہ راستے طے کرنے لگا۔ لیکن ان کو زیادہ دور جانا نہ پڑا اور دستگیر کی خواہشیں اپنے وفادار غلام سے آملیں۔

قابوس نے ہرات پہنچتے پہنچتے اپنی سرگزشت زیبا کو سنا دی۔ زیبا اکثر مقامات پر آبدیدہ ہوگئی۔ مگر آنسوؤں کو پیتی رہی۔ قابوس کی نازک حالت اس سے چھپی نہ تھی اور بوڑھے غلام کی دائمی جدائی کے خیال سے وہ اپنے دل میں افسردہ رہتی تھی قابوس طبعی عمر سے تجاوز کر کے مرنے جا رہا تھا اور زیبا جانتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ پھر بھی قابوس کی موت کا تصور اس کو بے چین کئے ہوئے تھا۔

قابوس و اردوان پہلے جس مکان میں رہے تھے۔ ہرات پہنچ کر اسی میں مقیم ہو گئے یہ ایک مختصر سی جگہ تھی۔ مگر زیبا کو وقت کاٹنا تھا اس نے قیام میں کوئی رد و بدل نہ کیا۔ اور اسی کو غنیمت سمجھ کر بسر کر لیا۔

زیبا کے سامنے یوں تو بہت سے مسائل تھے اور صحیح معنی میں اندرونی وہ پیچیدگیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ لیکن سب سے بڑا سوال اس کے لئے قابوس کے علاج معالجہ کا

تھا جتنا کہ اس فکر کے سامنے وہ اپنی گرفتاری کی پرواہ بھی نہ کرتی۔ اقامت پذیر ہونے کے بعد سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ قابوس کو دکھانے کے لئے شہر کے سب سے بہتر طبیب کو بلا بھیجا۔ سفر کے تکان سے قابوس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ طبیب نے دیکھ بھال کر دوا تجویز کر دی۔ وہ اسی وقت پلا دی گئی۔ اور قابوس کو کچھ افاقہ ہونے لگا۔

اس دوران خواجہ وزیر نے قابوس اور اردوان کو اپنے حالات سے باخبر کر دیا۔ اور قابوس نے فی الفور رے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ مگر اس پر عمل کرنے کی نوبت نہ آئی اور قابوس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ زیبا کو وقت کی اہمیت کا احساس تھا۔ گرفتاری کا خطرہ اطراف میں منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن قابوس کو موت و حیات کی کشاکش میں چھوڑ کر اس مقام سے دور جانا ممکن نہ تھا۔ آخر شب وہ پھر [illegible] نظام کی خدمت میں پہنچ گئی۔

زیبا کی حالت کا اندازہ لگانا دشوار ہو رہا تھا۔ [illegible] زندگی ایک ٹھہری ہوئی [illegible] ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ بڑی ہمت سے [illegible] تھی اور اس کی خفیف سی مسکراہٹ اردوان کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے کو کافی تھی۔ اردوان قابوس کی زبانی غزنی کے حالات معلوم کرنے کے بعد سے [illegible] ہوائی قلعے بنانے لگا تھا اور بے تابی سے ان لمحات کا انتظار کر رہا تھا جبکہ زیبا ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جانے والی تھی۔ زیبا بھی اردوان کے احساسات سے انجان نہ تھی اور سب سے پہلے موقع پر اس کی غلط فہمی دور کر دینا چاہتی۔ لیکن قابوس کی حالت کسی بات کی اجازت نہ دیتی اور وہ اردوان کی آنکھوں سے کوئی پیغام سن کر خاموش ہو جاتی۔

کئی روز اسی عالم میں گذر گئے اور قابوس کی حالت بد سے بدتر ہوتی رہی۔ جب اس کو موت کا بالکل یقین ہو گیا تو ایک روز اس نے زیبا کو تنہائی میں بٹھا کر دنیا کے نشیب و فراز سمجھائے، صبر و سکون سے کام لینے کی تلقین کی اور کہا کہ اس نے ماہ رخ کے لئے کسی شوہر کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر وقت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اب اس کام کو وہ زیبا کے سپرد کر کے جا رہا ہے۔ اردوان کی مدد سے وہ دستگیر کی اس حسرت کو پورا کرے۔ زیبا وفور جذبات میں رونے لگی۔ پھر اس نے آنسو پونچھ کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ماہ رخ کے قدموں کی چاپ پا کر خاموش ہو گئی۔ قابوس نے ماہ رخ کی طرف دیکھ کر پیار سے قریب بلایا۔ پدرانہ محبت میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند دعائیں کیں اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ ماہ رخ کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ لیکن قابوس کی فہمائش پر اس نے آنسو پی کر ڈالے اور ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گئی۔

قابوس ان کو داہنے بائیں بٹھا کر سمجھاتا رہا۔ ماہ رخ کو زیبا کی اطاعت سے باہر نہ ہونے کی نصیحت کرتا رہا۔ پھر اس کو نیند آنے لگی۔ زیبا ماہ رخ کو بٹھا کر کسی ضرورت سے اٹھ آئی۔ مگر ماہ رخ کی آواز پر جلد ہی اس کو واپس ہونا پڑا۔ وہ دوڑی ہوئی گئی تو قابوس کو بے حال پایا۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ زیبا نے اس کو بابا کہہ کر آواز دی قابوس کے حواس ابھی کچھ کچھ باقی تھے۔ اس نے یاس آمیز نگاہ سے زیبا کی سمت دیکھا جس سے ایک مجبوری اور حسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ زیبا چیخ کر رو پڑی۔ اردوان اور غزنوی غلام دوڑ کر آ گئے۔ مگر ان کو زیبا سے پرسش کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ان کے پہونچنے سے قبل دستگیر کا رفیق زندگی کی آخری منزل طے کر چکا تھا۔

زیبا اس کی موت پر جس طرح بھی روتی کم تھا۔ مگر چند یوم کے بعد اس کی

آواز نہ تھی۔ فرائض کے احساس نے شانہ پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ زیبا آنسو پونچھ کر اردوان کی طرف متوجہ ہو گئی اور تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے کو کہہ دیا۔ ماہ رخ پچھاڑیں کھا رہی تھی قابوس کی موت اس کے لئے داغ یتیمی سے کم نہ تھی۔ زیبا نے اس کو تسلی دی تو وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ضبط زیبا کو بھی دشوار ہو گیا اور ایک بار پھر قابوس کی میت پر دلگیر نوحوں کے نالے سنائی دینے لگے۔

قابوس کا انجام عام مجوسیوں کی طرح ہوا اور اس کے جسم خاکی کی خاک جزو کائنات بن گئی۔ مگر زیبا کے لئے ایک لمحۂ فکر پیدا کر گئی۔ وہ دس بارہ سال تک اہل اسلام کے درمیان رہی تھی اور مسلمانوں کی صداقت اور تمدن نے اس پر اثر کیا تھا۔ بالخصوص فردوسی کی صحبت میں وہ اسلام کی افادیت کی معترف ہو گئی تھی۔ قابوس کی لاش پر پہلی مرتبہ اس کو خیال آیا کہ اس کا انجام بھی اسی طرح ہو گا؟ زردشت نے وحدانیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ اسلام سے ملتا جلتا ہے۔ اس اعتبار سے زیبا مسلمانوں کے مسلک سے زیادہ دور نہ تھی۔ فردوسی سے تبادلۂ خیال کے دوران میں بارہا اس نے اصول اسلام پر غور کیا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ عقیدے میں بھی مصنف شاہنامہ کی مقلد بن جائے مگر خیال پر عمل کرنے کی نوبت نہ آئی اور فردوسی کی فراری ظہور پذیر ہو گئی۔ قابوس کی تدفین سے فراغت کر کے گھر پر آ کر بیٹھی تو پھر یہی سوال دماغ میں گونجنے لگا اور اس نے طے کر لیا کہ سب سے پہلی فرصت میں اس ذہنی انتشار سے نجات حاصل کرے گی۔

زیبا فردوسی کے مسئلہ میں بظاہر منہ بند کئے ہوئے تھی مگر اس کا دل و دماغ ایک لمحہ کے لئے اس کی فکر سے خالی نہ تھا۔ غزنی سے چلنے کے ہنگام تو اس نے اس وقت تک دم نہ لینے کا تہیہ کیا تھا جب تک فردوسی مل نہ جائے۔ ہرات میں قابوس کی علالت نے

چھپنا لیا۔ یہ دشواری اب رفع ہو گئی تھی۔ زیبا خدا کا نام لے کر قدم بڑھا سکتی مگر ایک تسلسل میں اس نے تمام ذمہ داریوں سے چھٹکارا کر لینے کا عزم کر لیا۔ اردوان اور ماہ رخ دو ذاتیں اس سے وابستہ تھیں، جن کی بابت اس کو کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اور جن کے لئے اس نے ایک رائے قائم کر لی تھی۔

ماہ رخ بھرپور جوانی سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر زیبا کا خون خشک ہو جاتا اور بعض اوقات وہ سوچنے لگتی کہ کیا اس کا شباب بھی یونہی گزر جائے گا؟ دیگر کی شرائط پر اس کی طبیعت مشغوش ہونے لگتی اور وہ ہر پابندی سے آزاد ہو کر بہن کا ہاتھ کسی توانا اور قابل اعتبار ہاتھ میں دینے پر تیار ہو جاتی، پھر قابوس کا خیال آجاتا قابوس کی موجودگی میں زیبا ماہ رخ کے لئے کسی فیصلہ کی مجاز نہ تھی۔ وہ اس کا اور ماہ رخ دونوں کا بزرگ تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قابوس حق بزرگی ادا کر رہا تھا۔ لیکن زیبا جب قابوس کی جگہ پر آگئی تو قابوس کی وصیت نسل و رنگ کے بندھن توڑنے میں مانع ہو گئی۔ اور ماہ رخ کے شوہر کے لئے خالص ایرانی خون کا التزام ناگزیر بن گیا۔

فردوسی کی ضد پر زیبا نے اردوان کے ساتھ شادی کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ اور یہی کے اقبال کو بنیاد قرار دے کر قابوس اردوان کی تلاش میں نکلا تھا۔ مگر حالات کی تبدیلی نے زیبا کو پھر اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔ کئی سال پہلے کی بات ناقابل قبول بن گئی اور زیبا نے اردوان کے لئے اپنا زاویہ نظر بدل دیا۔

زیبا کی جوانی کا دور گزر رہا تھا۔ مزاج میں پختہ کاری اور سنجیدگی کی بہتات ہو گئی تھی۔ ماہ رخ کی ذمہ داری کے احساس نے ایک بار پھر اس کو سابقہ ارادے پر نظر ثانی کرنے پر توجہ دلائی۔ اور فردوسی کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے

پردہ کمر بستہ ہوگئی اس لئے طے کر لیا کہ اگر فردوسی نے وعدہ شکنی کی شکایت کی تو وہ اس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی خواہ ہو جائے گی۔ اعتراف کر لے گی کہ اس سے قصور ہو گیا اور وہ جان بوجھ کر اپنی خواہشات کا گلا نہ گھونٹ سکی۔ فردوسی کی طرف سے اس کو امید تھی کہ وہ اس کو معاف کرے گی۔ اسی تقویت پر قابوس کا غم ہلکا ہونے کے بعد سے وہ اردوان اور ماہ رخ کو ایک سطح پر دیکھنے لگی۔

زیبا کو اردوان سے اب بھی محبت تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ شاہنامہ اور اس کا مصنف مقصد حیات بن کر رہ گیا تھا۔ فردوسی کو دیکھنے کے لئے اس کا دل تڑپ رہا تھا اور وہ اضطراب میں ایک لمحہ کے لئے قرار نہ تھا مگر زیبا کو افکار مسلسل نے طبیعت پر اتنا قادر کر دیا تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ سمجھ نہ سکتا کہ اس کے دونوں پہلو جل رہے ہوں گے۔ قابوس کی موت کے تین چار روز بعد ایک رات وہ اردوان کے کمرے میں گئی۔ اردوان نے اس کو دیکھ کر آنکھیں بچھا دیں اور خوشی میں باؤلا ہو گیا۔ مگر زیبا کے چہرے کی متانت نے ہزاروں وسوسے پیدا کر دیئے زیبا اس کے پلنگ کے برابر ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور اردوان اس کی طرف ہمہ تن گوش بن گیا۔

اردوان خواب و خیال کی دنیا میں تھا۔ وہ گمان بھی نہ کر سکتا کہ کوئی رات ایسی بھی آ سکتی ہے۔ جب سناٹے کے عالم میں خود سر تا صد اس طرح اس کو نوازے گی۔ اس کی نگاہیں مدہوش زیبا کے ملائک فریب چہرے پر جھک کر رہ گئیں۔ سن کے تقاضے سے آنکھوں کی چمک دمک اور رخساروں کی آب و تاب پھیکی پڑ رہی تھی۔ مگر حقیقتاً وہ اب بھی اس قدر خوبرو تھی کہ نسائیت کا شاہکار کہی جا سکتی۔ اردوان پر مدہوشی طاری تھی۔ زیبا چند لمحات تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی

"تم اس وقت میرے آنے کی غرض سمجھ نہ سکے ہو گے۔"

اردوان ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس نے استفسارانہ انداز میں اس کو دیکھا اور زیبا نے کہا۔

"میں ماہ رخ کو اپنی نشانی قرار دے کر تم کو سونپنے کے لئے آئی ہوں۔"

اردوان اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ مگر ایک بار اس نے کانوں کو جھٹلانے کی کوشش کی

"ماہ رخ کو سونپنے کے لئے آئی ہو۔ کیا تمھارا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟"

ہاں میں فردوسی کی جستجو میں جاؤں گی۔ اور اس کو پا کر پھر کبھی واپس نہ ہوں گی ______" زیبا نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہہ دیا اور پورے نسائی وقار کے ساتھ الفاظ پر زور دے کر بولی۔

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو اردوان۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ تمھارے لئے میرا فیصلہ تم کو قبل سے معلوم ہے۔ اب اس میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے کہ میں اپنے بجائے ماہ رخ کو تمھاری دلجوئی کے لئے پیش کرتی ہوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکے گا ______ ماہ رخ کو میں تمھاری چھوٹی بہن کی حیثیت سے دیکھتا رہا کیا یک لخت میں اس قدر تبدیلی کس طرح کر لوں؟"

اردوان نے ذہنی اذیت میں جواب دیا۔ اور زیبا نے اس کو سمجھایا۔

"بات بالکل ذرا سی ہے۔ اب تک تم ماہ رخ کو میری بہن قرار دیتے رہے آج سے مجھ کو ماہ رخ کی بہن سمجھو اور اس کو میری یادگار سمجھ کر عزیز بنا لو۔"

قابوس کے بیان سے اردوان کی مردہ امیدیں پھر زندہ ہو گئی تھیں۔ زیبا کی گفتگو سے اچانک آرزوؤں کا قلعہ منہدم ہو گیا۔ مگر وہ ایک عقیل و فہیم انسان تھا

زیبا کی مستقل مزاجی اس سے چھپی نہ تھی جانتا تھا کہ اس کو ارادے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اوائل عمر سے اس وقت تک کا بنا ہوا نظریہ اکدم کیسے بدل دیتا۔ زیبا نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"اردوان میرا تم پر حق ہے۔ اس حق کو درمیان میں دے کر کہتی ہوں کر کہنا مان لو۔ اس سے نہ صرف میرے دل کو سکون ملے گا۔ بلکہ تمھاری تسکین کی صورت بھی نکل آئیگی"

اردوان کا سر جھک گیا اور زیبا اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول سمجھ کر کھڑی ہو گئی۔ چلتے وقت اس نے پھر اردوان کو مخاطب کر کے کہا۔

"اس وقت تم کو میری تجویز سے اختلاف ہوگا۔ مگر مستقبل اس کا یقین دلائے گا۔ کہ میں جو کچھ کرنے جا رہی ہوں۔ یہی برمحل تھا۔"

زیبا نے اردوان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور چلنے کے لئے قدم اٹھا دیئے۔ اردوان نے اس کے قدموں کی آہٹ پر نگاہ اٹھائی۔ زیبا دروازے سے نکل رہی تھی اردوان نے اس کے سراپا کو دیکھا۔ منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ چند لمحات میں کتنا انقلاب آ گیا تھا! وہ حسین و نازک پیکر تھوڑی دیر قبل تک جس کا تصور دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتا اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مگر وہ اس کو جذبات کی گہرائی میں جگہ دینے کے بجائے احترام کی نظر سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

ماہ رخ کے لئے یہ رشتہ اردوان سے زیادہ اذیت رساں تھا اور ایک جہت سے سوہان روح بھی۔ غزنی کے زمانۂ قیام میں جب زیبا نے اس کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا تھا اور وہ کچھ دنوں تک اردوان کو ایک مخصوص نگاہ سے دیکھتی رہی تھی تو اس کو اردوان کے خد و خال سے ایک مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر فردوسی کے

اصرار پر جب زیبا نے سر تسلیم خم کر دیا اور اردوان کا نام ماہ رخ کے بجائے پھر زیبا سے منسوب ہو گیا تو اطاعت شعار بہن نے بے چینی کا احساس ہونے کے باوجود خیال کو بھٹکنے نہ دیا، حالانکہ اس کو اس کوشش میں بہت دشواری پیش آئی. بالخصوص ان حالات میں جبکہ دستگیری کی نوبیوں کے لئے سرزمین فارس پر گنتی کے رشتے ممکن تھے. ماہ رخ دیکھ رہی تھی کہ اردوان کے زیبا سے منسوب ہو جانے کے بعد اس کے لئے روشن مستقبل کی توقع نہیں ہو سکتی. غزنی اور اس کے مضافات میں زرد ہشتوں کی آبادی ہی کم تھی اور جو لوگ تھے بھی ان کا خون مخلوط تھا. شباب ماہ رخ کی رگوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا. جوانی کا تقاضا مضبوط بازوؤں کی ضرورت پر توجہ دلا رہا تھا مگر ماہ رخ نے بہن کے عیش کے لئے اپنے جذبات کو کچل دیا اور اردوان کو زیبا کا منگیتر قرار دے لیا اس وقت سے ہرات کی اس یادگار شب تک وہ اس کو ایک خرد کی نگاہ سے دیکھتی رہی. اردوان کے پاس سے آ کر زیبا نے جب اس کو جگا کر بتایا کہ آنے والی صبح ایک حیات نو کا نوید لے کر آئے گی. تو وہ متحیر رہ گئی. زیبا نے خواہرانہ محبت میں آغوش اس کے لئے وا کر دی اور ماہ رخ کے سر کو سینے میں چھپا کر کہنے لگی کہ دو روز بعد اردوان کے ساتھ اس کا عقد ہو گا. ماہ رخ اچانک اس خبر پر کچھ سوچنے کے قابل نہ رہی. اس کا دل دھڑک رہا تھا. اور آنسو آنکھوں میں امنڈ آئے تھے زیبا نے آہستہ آہستہ پوری تفصیل بیان کر دی اور ماہ رخ کو کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر آرام کے لئے چلی گئی.

ماہ رخ کے لئے انتہائی مسرت کا محل تھا. وہ صحیح معنی میں زندگی کا آغاز کرنے جا رہی تھی مگر اس کی ماں سے زیادہ شفیق بہن کا کیا ہو گا؟ یہ سوال تھا جو رہ رہ

گراہ رخ کو پریشان کر دیا۔ زیبا نے پہلے پہل جب اردوان کو اس کے لئے تجویز کیا تھا تو بتایا تھا کہ وہ شاہنامہ اور شاہنامہ کے خالق کے لئے وقف رہنا چاہتی ہے ماہ رخ بھی ایک ایرانی دوشیزہ تھی۔ اس کا دل بھی دہقانیت کے جذبے پر تھا۔ اس کی نگاہ میں بھی فردوسی لائق پرستش تھا۔ لیکن زندگی کو صرف اس کی سمت میں گزار دینے کے لئے مخصوص کر دینا ماہ رخ کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ اس نے ادب کے ساتھ زیبا کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر زیبا کا فیصلہ اٹل تھا ماہ رخ کی جد و جہد رائگاں گئی اور اس نے بڑی بہن کی مرضی کے سامنے سر خم کر دیا اتنے دنوں کے بعد اس تجویز پر عمل کرنے کا محل آیا تو پھر وہ اسی انداز میں سوچنے لگی۔ لیکن کسی رد و قدح کا موقع نہ مل سکا۔ صبح کو وہ سو کر اٹھی تو غزنوی غلام زیبا کی ہدایت کے تحت شادی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔

زیبا اور ماہ رخ کی شہرت صرف غزنی تک محدود نہ تھی۔ سارے وسط ایشیا میں ان کے رقص و موسیقی کا آوازہ گونج رہا تھا اور ہرات میں تو خصوصیت کے ساتھ پرستاروں کی کثرت تھی زیبا کو اس کا احساس تھا۔ اسی لئے وہ بند گاڑی میں داخل شہر ہوتے ہی جو مکان منتخب کیا اس مکان میں جانے کے بعد قدم باہر نہ نکالا۔ پوری احتیاط سے روپوش رہیں۔ باہر کے کام اردوان اور غزنوی غلام انجام دیتے اور وہ چہار دیواری تک محدود رہتیں۔ قابوس کی دعوت پر بھی رازداری سے کام لیا گیا۔ مگر شادی کا موقع ایسا نہ تھا جس میں وہ اپنے کو چھپا سکتیں۔ اس کے لئے زیبا نے بہت غور کیا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آسکا پہلی اور آخری شکل یہی تھی کہ شادی میں صرف ان لوگوں کو مدعو کیا جائے۔ جن پر بھروسہ کیا جا سکے۔ یہی اس نے اردوان سے

کہہ دیا اور مزید احتیاط یہ کی کہ ہرات میں صرف ماہ رخ کے وجود کو ظاہر کیا اپنی بابت مشتہر کرا دیا کہ وہ ہرات تک ساتھ آئی تھی۔ چند روز رہ کر کسی نامعلوم مقام کو چلی گئی۔

اسمٰعیل وراق سے فردوسی کے تعلقات زیبا کے علم میں تھے۔ چنانچہ ماہ رخ کی شادی میں جہاں اردوان نے بہت سے آتش پرستوں اور مسلمانوں کو دعوت دی اسمٰعیل سے بھی بدات خود شرکت کرنے کی استدعا کی۔ اسمٰعیل نے اردوان سے زیبا کو دریافت کیا اور اردوان نے زیبا کے بتائے ہوئے جملوں کو دہرا دیا۔ اسمٰعیل چند منٹ تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اردوان کا ہاتھ پکڑ کر تخلیہ میں لے گیا اور کہنے لگا کہ اس اعلان کے بعد زیبا کے لئے ہرات کے قیام کا ہر لمحہ مخدوش ہے وہ ایک سکنڈ ضائع کئے بغیر اس کو کسی سمت کو روانہ کردے۔ زیبا نے اردوان کو اسمٰعیل سے فردوسی کے تعلقات کی ابتدا بتا دیا تھا۔ اس لئے اردوان نے اس کی رائے کو خلوص پر مبنی قرار دیا اور شادی ہونے تک زیبا کا ٹھہرنا ضروری بیان کیا مگر اسمٰعیل نے اپنے الفاظ میں ترمیم نہ کی اور دوبارہ انھیں جملوں کا اعادہ کردیا۔

اسمٰعیل کو غزنی کے حالات سے پوری واقفیت تھی اور ابوسہل وبزرگ احمد کی ریشہ دوانیوں کا کما حقہ علم۔ فردوسی اس کو زیبا کے نام ایک لفافہ دے گیا تھا جسکو اسمٰعیل نے مخصوص قاصد کے ذریعہ غزنی روانہ کیا۔ مگر زیبا قاصد کے پہنچنے سے قبل غزنی کو چھوڑ چکی تھی۔ اسمٰعیل کے قاصد نے کئی روز غزنی میں قیام کیا اور واپس آکر سارے حالات بیان کئے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے زیبا کی گرفتاری کے لئے بزرگ احمد کے کئی فرمان آئے اور اسمٰعیل اُن سے زیبا کے متعلق بزرگ احمد کے

عناد کا اندازہ کر رہا تھا۔ اس کو زیبا کے ہرات آنے کی توقع تھی۔ اسی لئے جیسے ہی اردوان نے ماہ رخ سے اپنی شادی کا تذکرہ کیا۔ اسمنے زیبا کے ہرات میں ہونے کا یقین کرلیا۔ اور اس کو اندیشہ پیدا ہوگیا کہ فردوسی کی پرستار قانون کی گرفت میں نہ آجائے۔ اردوان کو شامل دیکھ کر اسمٰعیل نے تاکید کی کہ وہ زیبا کو اس کو پیغام پہنچادے اور اسکو ہرات سے چلے جانے پر مجبور کرے اسی تسلسل میں اس نے غزنی سے آنے والے عشراہین کا حوالہ دیا۔ اور اردوان کو خطرات سے آگاہ کیا۔ اردوان نے حسب ہدایت عمل کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اور واپس ہونے کے لئے اٹھ گیا۔

اسمٰعیل کی رائے اردوان کے نزدیک ہر اعتبار سے مناسب تھی۔ مگر زیبا کے کہیں تنہا جانے کا سوال ہی کیا تھا۔ ماہ رخ اور خود وہ اس کے دم کے ساتھ تھا لہذا اسمنے سردست یہی فیصلہ کیا کہ شادی کو ملتوی کرادے۔ اس طرح جس بات کو وہ بادل ناخواستہ قبول کر رہا تھا۔ وہ تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی ہوئی جارہی تھی اور زیبا کے لئے پھر ایک امید قائم کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اسمٰعیل کے مکان سے نکلتے نکلتے اس نے ایک پختہ ارادہ کرلیا۔ لیکن دروازے سے نکل کر تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اسمٰعیل کا غلام پکارتا ہوا آگیا اور اس کو لوٹا لے گیا اردوان واپس ہوکر جب اسمٰعیل کے سامنے پہونچا تو اس نے کہا کہ وہ اس کی گھوڑا گاڑی کو اپنے مکان تک لے جائے اور زیبا کو پردے میں بٹھا کر اس کے وہاں بھیجدے۔ اس تجویز سے اردوان کا ایک بوجھ ہلکا ہوگیا۔ جس بات کو وہ زیبا سے کہنے میں تامل کر رہا تھا۔ اسمٰعیل اس کو اپنی زبان سے کہنے کے

لئے زیبا کو طلب کر رہا تھا۔ اردوان نے تعمیل میں سر جھکا دیا اور اسمٰعیل کی گاڑی پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

زیبا اسمٰعیل سے واقف تھی اس کی طرف سے اس کو فریب کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ بلا توقف سوار ہو گئی۔ اور اسمٰعیل کے مکان پر پہنچ کر گاڑی سے اتر گئی

اسمٰعیل نے زیبا کی اٹھتی جوانی دیکھی تھی اور پیکر انسانی میں حوروں کے جمال کا مشاہدہ کیا تھا۔ جاتے ہوئے شباب کے نظارے نے اس کو استعجاب میں ڈال دیا اور وہ زیبا کے روبرو پہونچتے ہی متحیر رہ گیا۔ خوبصورت رقاصہ کے لئے اس کے دل میں کسی جنسی جذبہ کی کارفرمائی نہ تھی اور ہوتی بھی تو فردوسی سے اس کے رابطہ کا حال معلوم کر کے ایسے خیال کی گنجائش نہ رہتی وہ تو صرف زمانے کے تغیر پر غرق حیرت تھا کہ ایک وقت زیبا کا وہ بھی تھا۔ جب آنکھوں کو اس کی طرف نگاہ اٹھانے کی تاب نہ ہوتی۔ ایک وقت یہ ہے کہ اس کا شالیہ محضر انقلاب نظر آرہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ زیبا اس وقت اندوہ الم کی تصویر بنی ہوئی تھی اردوان سے اس کو طلبی کی غرض معلوم ہو گئی تھی اور اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے بہن کو دلھن بنتے نہ دیکھ سکے گی۔ ______

جہاں تک زیبا کے احساسات کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک جوان عورت کو بوڑھی بنا دینے کے لئے کافی تھے۔ زیبا اگرچہ بہت ضبط سے کام لے رہی تھی۔ لیکن ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ فردوسی اس کی نئی زندگی کا خالق تھا۔ وہ کسی لا متناہی مدت کے لئے چھوٹ گیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ زیبا کو یقین نہ تھا کہ وہ دوبارہ اس سے مل سکے گی۔ فردوسی اس کا پہلا اور آخری سہارا

تھا اس نے پردیس میں دم توڑ دیا۔ اردوان کی محبت پر بھروسا کیا جا سکتا۔ اس سے وہ بہن کے حق میں دستبردار ہوگئی تھی اور کنعان سے قدم نکالنے کے ہنگام اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اردوان اور ماہ رخ سے بھی جدا ہونے جا رہی تھی۔ اسمٰعیل کے پھاٹک تک پہونچتے پہونچتے احساس نامرادی نے پورا غلبہ حاصل کر لیا۔ زیبا کی آنکھوں میں حلقے اور چہرے پر ناتوانی کی علامات آشکار ہو گئیں اور وہ اس پژمردہ پھول کی نظیر نظر آنے لگی، چمن کو جس کے نکھار پر ناز تھا اور تازگی جس کی پنکھڑیوں کی قسم کھا سکتی تھی۔

زیبا نے اسمٰعیل کو زیادہ دیر متحیر نہ رہنے دیا اور اپنے بلانے کی غرض دریافت کر لی۔ اسمٰعیل نے بھی بغیر کسی تمہید کے کہہ دیا کہ فردوسی کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے وہ اس کو ہرات میں ٹھہرنے نہ دے گا۔ زیبا کو ہرات سے چلے جانے میں کوئی اعتراض نہ تھا وہ پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ ماہ رخ اور اردوان کے عقد سے فراغت پا کر تن تنہا فردوسی کی تلاش میں جائے گی اور زن و شوہر کو کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے ہرات میں چھوڑ جائے گی۔ مگر شادی سے قبل ایسے سفر پر روانگی میں اس کو دکھ ہو رہا تھا۔ اسمٰعیل ایک بہن کے واردات قلب سے انجان نہ تھا۔ لیکن مآل اندیشی کو پس پشت ڈال نہ سکا۔

غمزدہ زیبا کی بھولی صورت نے اس کا دل ہلا دیا۔ تاہم اس نے فرض کو فراموش نہ کیا اور ملائمت کے ساتھ زیبا کو بتایا کہ اگلے دن تک ہرات میں موجود ہونے کی خبر پھیل جائے گی۔ اور سلطان غزنی کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی۔ اس لئے یہ حالات پیش ہونے سے قبل اس کو کسی جانب روانہ ہو جانا چاہیئے۔ زیبا نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اسمٰعیل نے اس کو ایک بند کمرے میں ٹھہرا دیا۔

سورج چھپنے میں دو گھنٹے باقی تھے اسمٰعیل زیبا کو بٹھا کر انتظام میں لگ گیا

اور مغرب کے وقت زیبا سے آکر کہنے لگا کہ اردوان نے اس کے غزنوی غلام کو خیریت کے لئے بھیجا ہے۔ زیبا اسمٰعیل کا منہ تکنے لگی۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ غلام کو کیا جواب دے؟ اسمٰعیل نے اس کو خاموش پاکر کہا کہ جانے سے قبل وہ اردوان اور ماہ رخ سے ملنا چاہے تو ان کو بلوا لیا جائے۔ زیبا نے بلا پس وپیش انکار میں سر ہلا دیا اور اسمٰعیل نے باہر جاکر غلام سے کہہ دیا کہ اس کی مالکہ رات کے خود مکان پر پہنچ جائے گی۔ غلام واپس چلا گیا اور زیبا اپنے پھوٹے مقدر کا شکوہ کرنے کے لئے بیٹھی رہ گئی۔

اسمٰعیل نے سفر کی مکمل تیاری کر دی تھی۔ اندھیرا ہونے پر اس نے زاد راہ کے لئے ایک رقم زیبا کو پیش کی۔ زیبا نے ایک خط اردوان کے نام کا اس کے حوالے کیا جس کے جواب میں اسمٰعیل نے فردوسی کا خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور زیبا نے فردوسی کے سواد تحریر کو پہچان کر آنکھوں سے لگا لیا۔

گھوڑا گاڑی پھاٹک پر آکر لگ چکی تھی۔ اسمٰعیل نے زیبا کو خط پڑھنے کا وقت نہ دیا اور باہر آ جانے کی تاکید کر دی۔ زیبا لفافہ کو چاک کر چکی تھی۔ فردوسی کا خط ہاتھ میں لیتے ہی اس کے آنسو نکل آئے مگر اس نے آنکھیں صاف کر کے خط پڑھنا شروع کر دیا اور اس میں اس قدر مستغرق ہوئی کہ اس کو اسمٰعیل کے کہنے پر توجہ نہ ہوئی اسمٰعیل نے چند منٹ کے وقفہ سے متوجہ کیا۔ زیبا خط تمام کر چکی تھی۔ اس کا رنگ متغیر تھا۔ تنفس تیز تیز چل رہا تھا اور آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا تھی۔ اسمٰعیل نے وقت جاتے دیکھ کر تیسری بار مخاطب کیا۔ زیبا ایک لمحہ تک سودائیوں کی طرح اس کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک فیصلہ کن انداز میں قدم اٹھا دیئے

زیبا کی رخصتی کا ہنگام اسمٰعیل کو تا مدت العمر فراموش نہ ہو سکا اور جب اس نے

بلانصیب رقاصہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھیں نم ہوئے بغیر نہ رہیں۔ فردوسی اس کا دوست تھا اور قابل قدر شاعر بھی۔ اسمٰعیل کی نگاہ میں وہ پوجے جانے کے لائق تھا اور وہ اس سے ایک بھائی سے زیادہ محبت کرتا۔ ایک رات کے سناٹے میں اس نے اسی طرح فردوسی کو رخصت کیا تھا۔ مگر اسمٰعیل کا دل اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس کے جانے کے بعد گھنٹوں آنکھیں نہ سوکھتیں۔ زیبا کی الوداعی نگاہوں نے جانے کیا جادو کر دیا کہ ہر رات کا رنگین تصور سے ان کو نکال نہ سکا اور اس کے دل میں رہ رہ کر ٹیسیں سی اٹھنے لگیں

زیبا کی زندگی از اول تا آخر ایک المیہ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصیبتوں میں اس نے آنکھ کھولی۔ فقر و فاقہ میں پل کر جوان ہوئی اور نامرادی کے سلسلے میں شباب کے نازک ترین لمحات گذار دیے۔ یوں تو اس کی عمر کا ہر لمحہ درد انگیز تھا مگر بعض راتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں جن میں تحمل برقرار رکھنا زیبا ہی کا کام تھا۔ ہر رات، سے رخصت ہونے کے وقت ناہ رخ سے نہ ملنا ہر بہن کی برداشت کی بات نہ تھی لیکن زیبا اس امر کو سمجھتی تھی کہ اگر وہ چند منٹ کے لیے بھی مکان کو گئی تو اس کا جانا نہ ہو سکے گا یا ناہ رخ اور اردوان بھی ساتھ لگ جائیں گے اور ان کی شادی التوا میں پڑ جائے گی۔ جو زیبا کو منظور نہ تھا۔ اس لئے اسنے دل پر پتھر رکھ کر ایک تحریر ان کے نام لکھ دی جس میں اپنے ناخوش ہو جانے کی دھمکی دے کر شادی کر لینے کی تاکید کی اور تحریر کیا کہ اس کی جستجو میں وقت ضائع نہ کیا جائے بلکہ وہ دونوں ہرات میں رہ کر اس کی واپسی کا انتظار کریں۔ زیبا جانتی تھی کہ وہ ایسی مہم پر جا رہی ہے۔ جہاں سے پلٹ کر آنا یقینی نہیں تاہم اس نے غریب تسلی دے کر اپنے کو بھی لیا اور ناہ رخ کے مستقبل کے لئے اس سے نہ ملنا ہی مصلحت قرار دے دیا۔ بات اتنی

حد تک رہتی تو تاب ضبط جواب نہ دیتی۔ مگر فردوسی کے خط میں جانے کیا لکھا تھا کہ صبر کا یارا نہ رہا اور وہ اس طرح تڑپ کر روئی کہ اسمٰعیل دراق کچھ اس کا بلکنا فراموش نہ ہو سکا۔

فردوسی کے لئے اسمٰعیل کی یہ آخری خدمت تھی۔ دوست کی محبوبہ کو اس نے دو وفادار غلاموں کے ساتھ ہرات کے باہر پہنچوا دیا۔ ان کے سامنے زیبا طوس کی سمت روانہ ہو گئی۔ اور انھوں نے واپس آکر اپنے آقا کو اس کے بعافیت نکل جانے کا اطمینان دلا دیا۔ اسمٰعیل نے زیبا کی طرف سے مطمئن ہو کر خط پر توجہ کی اور بہ نفس نفیس اس کو لے کر اردوان کے مکان پر پہونچ گیا۔

ماہ رخ۔ اردوان اور غزنوی غلام زیبا کا انتظار کر رہے تھے۔ اسمٰعیل کو تنہا دیکھ کر وسوسوں نے گھیر لیا۔ اور آخر کار ان کے بدترین اندیشے صحیح نکلے۔ ماہ رخ زیبا کے خط کو پڑھتے ہی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ غلام نے بڑھ کر سہارا دیا۔ اردوان بھی زط غم میں بے قابو ہو رہا تھا۔ مگر اسمٰعیل کی موجودگی کے باعث وہ ڈاڑھیں مار کر رو نہ سکا۔ اسمٰعیل حالات سے کما حقہ واقف تھا۔ اس نے ماہ رخ کو سمجھایا! اور بڑی بہن کی نصیحت پر عامل ہونے کی تلقین کی۔ ماہ رخ بہت مضطرب تھی لیکن اسمٰعیل کی دلاسہ نے ... آنسو خشک کرا دئیے اور وہ اسمٰعیل کی اجازت لے کر آرام گاہ میں جا کر ...

اسمٰعیل نصف شب کے بعد اردوان کے مکان سے واپس ہوا اور دوسرے دن پھر علی الصباح پہنچ گیا۔ اردوان کی زبانی اس کو ماہ رخ کے روتے رہنے کا حال معلوم ہوا۔ اسمٰعیل نے ماہ رخ کے پاس جا کر پھر تسکین دی اور زیبا کے جلد ہی واپس ہو جانے

کی امید دلادی۔ ماہ رخ اس کے الفاظ سے کسی حد تک بہل گئی، مگر گھنٹوں کے وقفہ سے اس کے اشک بہتے رہے۔

اسمٰعیل کی کوششوں سے دوسرے دن پروگرام کے بموجب زیبا کا منصوبہ پورا ہو گیا اور ماہ رخ فارس کے پرانے رواج کے مطابق اردوان کی رفیقہ حیات بن گئی۔

حجلۂ عروسی میں ماہ رخ کے چہرے کا نکھار حوروں کو شرما رہا تھا۔ اردوان کی زبان پر بےساختہ زیبا کا نام آ گیا اور واقعی وہ اس وقت بالکل زیبا ہی معلوم ہوتی تھی۔ ناک نقشہ یوں ہی زیبا سے بہت مشابہ تھا۔ رنگ روپ میں فرق تھا۔ وقتی طور پر یہ فرق بھی جاتا رہا تھا اور ماہ رخ زیبا کی جوانی کے سانچہ میں ڈھل گئی تھی۔

اردوان نے ماہ رخ کو زیبا کی خوشی کے لئے قبول کیا تھا۔ لیکن ماہ رخ کو اس عالم میں دیکھ کر وہ بھول گیا کہ زیبا کے علاوہ کوئی دوسری دوشیزہ اس کی شریک زندگی بنی تھی۔ لمحات تک مسحور ہو کر اس کو دیکھتا رہا۔ ماہ رخ نے ایک بار آنکھیں کھول کر اردوان کے تحیر پر استعجاب کیا اور شرما کر گردن جھکا لی۔ اردوان اس ادا پر باؤلا ہو گیا۔ اس کی آغوش وا ہو گئی۔ اور ماہ رخ کو اس نے زیبا سمجھ کر سینے میں چھپا لیا۔

اردوان و ماہ رخ کی ازدواجی زندگی ایک تمثیلی زندگی تھی۔ زیبا کے لئے اردوان کی محبت ماہ رخ کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور وہ اس کو اسی طرح چاہتا، چاہنے والے کا جو حق ہے اس کی دلجوئی کا اتنا ہی خواہاں رہتا۔ پرستاری کا جو تقاضا ہے۔ ماہ رخ اردوان کی محبت پر نازاں تھی اور اپنے مقدر پر فخر

کرتی۔ ان کے شب و روز میں عیش و عشرت کے نغموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ البتہ زیبا کی آوارہ گردی کا خیال کسی کسی وقت دلوں کو مسوسنے لگتا۔ ماہ رخ کی آنکھیں امڈ پڑتیں۔ اور زیبا تصور میں غزنوی سپاہیوں سے بچتی ہوئی فردوسی کی تلاش میں ایران کے غیر معروف راستوں پر سرگرداں نظر آتی۔ اردوان خود زیبا کے لئے تڑپ رہا تھا۔ ماہ رخ کی حالت اس کو اور متاثر کر دیتی۔ وہ زیبا کی جستجو میں جانے کا ارادہ کرتا۔ مگر ماہ رخ اسکو روک دیتی۔ بہن نے اس کو تعاقب نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ماہ رخ کو زیبا کے الفاظ کا احترام تھا۔ ساری زندگی میں وہ کبھی نافرمانی کی مرتکب نہ ہوئی تھی۔ زیبا کی تاکید کے خلاف اردوان کو کیونکر جانے دیتی؟ اردوان نے کئی بار کہا بھی کہ وہ نہ جائیں تو غلام کو بھیج دے۔ مگر ماہ رخ نے نہ مانا اور وقت کٹتا رہا۔

زیبا غزنی کی ساری کمائی ماہ رخ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اردوان کی کئی نسلوں کی بسر اوقات اس سے ہو سکتی۔ پھر بھی اس نے ہرات میں تجارت کا ایک سلسلہ قائم کر لیا۔ اور زندگی امن و چین سے گذرنے لگی۔

اسمٰعیل سے ان کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ وہ جب کبھی یکجا ہوتے زیبا ہی کا تذکرہ ہوتا رہتا۔ زیبا نے اسمٰعیل سے کہا تھا کہ فردوسی کو پا کر وہ جس مقام پر ٹھہرے گی وہاں سے ماہ رخ کو بلوائے گی یا خود آکر لے جائے گی۔ یہی اسمٰعیل نے ماہ رخ سے کہہ دیا تھا۔ ماہ رخ زیبا کے الفاظ کو پتھر کی لکیر سمجھ کر چشم براہ تھی مگر مہینوں پر مہینے گذرتے چلے گئے اور زیبا کا کوئی قاصد نہ آیا۔ ماہ رخ کی امیدیں یاس میں بدلنے لگیں۔ اور سال ڈیڑھ سال بعد آخر کار وہ خود اس عمل پر کمربستہ ہو گئی جس کے لئے اردوان کو روکتی رہی تھی۔

تین نفوس کا مختصر سا قافلہ ہرات سے نکلا اور طوس کی سمت روانہ ہو گیا۔ ماہ رخ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھی۔ اردوان اور غزنوی غلام آگے پیچھے گھوڑوں پر تھے اور گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ ماہ رخ کے دل میں چاہنے والی بہن کے لئے ہزاروں اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کیونکہ اس مدت میں اس کو زیبا کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تھی۔ طولانی مسافت کو سرعت سے طے کرتی ہوئی ایک شام کو وہ منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ لیکن اس کا آنا اس وقت ہوا جب تاریخ میں ایک اندوہناک باب کا اضافہ ہو چکا تھا اور زیبا ایک نیا راستہ اختیار کر چکی تھی۔

دستگیر کی وصیت پوری ہو گئی۔ اس کی نواسی کو سام بن نریمان کی نسل سے بے داغ خون کا شوہر مل گیا۔ مگر ماہ رخ کی اولاد جب اجداد کے وطن میں متوطن ہوئی تو نہ اس کی مذہبیت برقرار رہی اور نہ نسل مخلوط ہونے سے بچ سکی اسلام کی صداقت نے زردہشت کی تعلیمات کو باطل کر دیا اور وہ وقت جلد ہی آ گیا جب خود ماہ رخ اور اردوان تاجدار مکہ کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

باب (۲۳)

غزنی چھوڑنے کے بعد

فردوسی نے غزنی سے روانگی کے بعد ایک مثنوی لکھنا شروع کی تھی۔ جس میں حاسدوں کی دراندازی اپنی مظلومی، سلطان محمود کی بدعہدی اور ناقدری کا ذکر تھا۔ قہستان میں کچھ اطمینان میسر آیا تو اس کی تکمیل پر توجہ کی اور ناصر لک کی فرمائش پر اس کے اشعار ناصر لک کو سنائے۔

بہ غزنی مرا گرچہ خوں شد جگر	ز بیداد آں شاہ بیدادگر
اگرچہ غزنی میں ظالم بادشاہ کے ظلم	سے میرا کلیجہ پیپ ہو گیا
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام	شنید از زمیں آسماں نالہ ام
تیس سال کی محنت برباد ہوئی	میرے نالے آسمان تک پہنچ گئے
ہمی خواستم تا فنا نہا کنم	بہ گیتی از و داستانہا کنم

تاہم میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تک زندہ رہوں جب تک عالم میں میری داستان کا شہرہ نہ ہو جائے۔

بگویم ز مادرش وہم از پدرش	نترسم بغیر از خداوند عرش
میں بادشاہ کی ماں اور اس کے باپ کو کہونگا	کیونکہ مجھ کو بجز خدا کے کسی کا خوف نہیں ہے

چو دشمن نداند از دوست باز — به تیغ زبانش کنم پوست باز

بادشاہ جب دوست اور دشمن کی تمیز نہیں کر سکتا تو میں زبان کی تلوار سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا

ولیکن ز فرسودهٔ محتشم — ندانم گزین پیش چون سرکشم

لیکن میں نہیں جانتا کہ میں نے — پیشکش میں کوئی کوتاہی کی ہے

فرستادم از گفتهٔ داشتم — به نزدیک خود هیچ نگذاشتم

جو کچھ میسر ہے بھیج رہا ہوں — اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑتا

اگر باشد این گفتها ناصواب — بسوزان به آتش بشو آن در آب

اگر میرے الفاظ غلط ہیں تو انکو آگ میں جلا دیا جائے یا پانی میں غرق کر دیا جائے

گزشتم ایا سرور نیک رائے — ازین داوری تا بدیگر سرائے

(اگر اپنی دانست میں) اے نیک بادشاہ میں انکو اس دنیا سے عالم ثانی تک کیلئے چھوڑے جاتا ہوں

رسد لطف یزدان بفریاد من — ستاند بمحشر ازو داد من

خدا میری فریاد کو سنے گا — اور محشر میں اس کی داد دے گا۔

ناصر لک فردوسی کا بہی خواہ تھا۔ ([illegible]) مگر اس نے فردوسی کو سمجھایا کہ بدگوئی اہل کمال کے شایان شان نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک لاکھ درہم کی پیشکش کی کہ مثنوی کو منظر عام پہ لایا نہ جائے۔ فردوسی نے اس کو منظور کر لیا مگر عملی طور پہ اشعار کا اخفا کیا نہ جا سکا۔ شاعر کی زبان سے جو شعر نکل گئے تھے وہ زبان زد ہو کے رہے۔

ناصر لک نے ایک طرف فردوسی کی زبان بندی کی دوسری طرف سلطان محمود کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔ جس میں فردوسی کے حالات کا

تذکرہ کرکے تحریر کیا کہ اس پر بڑا ظلم کیا گیا۔ فردوسی کو اس عریضہ کا علم ہوگیا اور وہ قہستان میں اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ چند روز مزید قیام کرکے اس نے ناصر لک سے اجازت طلب کی۔ ناصر لک کا جی نہ چاہتا تھا کہ اتنی جلد فردوسی کو رخصت کردے لیکن وہ بھی سلطان کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ اور مشوش تھا کہ مبادا سلطان اس کو گرفتار کرکے بھیجدینے کا حکم ارسال کردے۔ اسلئے اس نے ٹھہرنے کے لئے اصرار نہ کیا۔ اور فردوسی قہستان سے مازندران کی طرف روانہ ہوگیا۔

سپہبد مازندران کا فرمانروا تھا اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور دربار میں باریابی کا موقع دیا۔ فردوسی قہستان اور مازندران کے زمانہ قیام میں شاہنامہ پر نظر ثانی کرچکا تھا۔ اس میں مدحیہ اشعار کا اضافہ کرکے اس نے سپہبد کی خدمت میں پیش کیا۔ سپہبد نے اس کو خوشنود ہوکر قبول کیا۔ مگر فردوسی کو زیادہ قیام کی اجازت نہ دی۔ اور سلطان محمود کی ناراضگی کا حوالہ دے کر ایک گرانقدر عطیہ کے ساتھ رخصت کردیا۔

فردوسی کے لئے اس زمانہ میں زمین تنگ اور آسمان دور تھا۔ سلطان محمود اس سے کیا خفا ہوگیا تھا۔ معلوم ہوتا کہ خلاق عالم کی دنیا میں جگہ ہی نہ رہی تھی لیکن وہ اس دور کو بھی ثابت قدمی سے گذارے گیا۔ زیبا سے چھوٹ جانے کا ملال فرنگیس سے جدا ہونے کا غم کسی پہلو قرار لینے نہ دیتا۔ تو شاید کی تصویر اور اس کی نشانی مختلف خوشیوں سے بے چین کرتی۔ مگر وہ زیادہ دیر کے لئے افسردہ نہ تھا۔ فرنگیس کے لئے تو چنداں فکر نہ تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ جس مقام پر سکون میسر آگیا۔ وہیں فرنگیس کو بلالے گا۔ زیبا البتہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی فردوسی

کو اس کی مفارقت کا بہت قلق تھا۔ غزنی کے زمانہ قیام میں لباد وقات زیبا نے بوڑھے فردوسی کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا کر دی تھی اور وہ خائف ہو گیا تھا کہ زیبا درحقیقت نوشابہ کی جگہ نہ لے لے جس سے نوشابہ سے اس کی محبت پر حرف آجائے اور خود زیبا کی زندگی بھی برباد ہو جائے۔ اسی اندیشہ کے تحت اور وہ ان سے زیبا کو وابستہ کر دینے میں اس کو عجلت تھی۔

ماژندران سے کوچ کے دن فردوسی نے زیبا کو بہت یاد کیا۔ یاد تو وہ اکثر کیا کرتا لیکن ماژندران میں پناہ نہ ملنے سے اس پر مایوسیوں کا غلبہ ہونے لگا اور اذکار مسلسل میں قوئ کی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ سلطان محمود سے خوف زدہ نہ تھا اور نہ اس کے انتقام سے ڈرتا بلکہ اپنے جسم میں اس کو اس قدر انحطاط معلوم ہوتا کہ موت قریب ہونے کا یقین سا ہونے لگا تھا اور مرنے سے قبل زیبا کو دیکھ لینے کی آرزو پیدا ہو گئی تھی مگر کہن سال شاعر اپنے کو فریب نہ دے سکتا۔ جانتا تھا کہ زیبا کا دیکھنا ممکن نہیں اس لئے اس کی یاد شدت اختیار کر رہی تھی اور فردوسی درد و کرب کی ایک دنیا پہلو میں چھپائے ہوئے بغداد کی سمت بڑھ رہا تھا۔

قاسم کی موت کے بعد جب فردوسی نے اپنے کمال کی داد خواہی کے لئے کسی دربار کا رخ کرنے کا ارادہ کیا تو طبرستان۔ قہستان۔ ماژندران اور بغداد کتنے ہی مقامات سامنے آئے مگر ان سب کو چھوڑ کر وہ غزنی کا عازم ہو گیا۔ غزنی میں اسکو فن کا صلہ تو نہیں ملا مگر درد و غم کی لا محدود مملکت ہاتھ آگئی۔ فردوسی کو اپنے غلط انتخاب پر تاسف تھا۔ اور ذہن میں آنے والے باقی تمام مقامات کو وہ یکے بعد دیگرے آزما رہا تھا۔ بغداد اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ سپہبد نے جب

دربار غزنی کے ڈر سے دستگیری نہ کی تو فردوسی نے ادھر کا رُخ کیا اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر منزل کرتا ہوا بغداد پہنچ گیا۔

فردوسی اب طوس کا غیر معروف شاعر نہ تھا، شاہنامہ کا مصنف تھا۔ جس نے سلطان محمود کے بخل اور عہد شکنی پر سبق آموز طمانچہ مارا تھا۔ اس کے وارد سے قبل اس کی غمناک داستان بغداد کے گلی کوچوں میں مشتہر ہو چکی تھی۔ جیسے ہی وہ شہر میں پہنچا، عوام و خواص میں خبر پھیل گئی۔ لوگ اس کے استقبال کو دوڑ پڑے اور فی الفور دربار خلافت تک رسائی ہو گئی۔

سلطان محمود کو فردوسی سے ذاتی عناد نہ تھا مگر وہ بہرحال ایک بادشاہ تھا ابو سہل اور بزرگ احمد کے کہنے میں آگیا۔ پھر بھی اکثر اوقات اس کو اپنے فعل پر پچھتاوا ہوا۔ لیکن حاشیہ نشینوں نے ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دی کہ شاہانہ مزاج چڑھ گیا، اور فردوسی کے خلاف اس کا غم و غصہ کم نہ ہو سکا۔ ناصر لک نے فردوسی کے متعلق جو خریطہ بھیجا تھا۔ اس نے بھی سلطان پر اچھا اثر ڈالا اور وہ ان لوگوں سے خفا ہو گیا۔ جنہوں نے اس کو فردوسی سے بدظن کیا تھا مگر اس کا یہ تاثر دیرپا نہ رہ سکا۔ گرد و پیش بیٹھنے والوں نے ہجو کا ذکر کر کے برہمی پیدا کر دی چنانچہ جب فردوسی کے بغداد پہنچنے کی خبر غزنی پہنچی تو ابو سہل کے اکسانے پر سلطان نے ایک تہدید آمیز خط خلیفہ کو روانہ کیا اور لکھا کہ فردوسی کو گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا جائے ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا۔ دربار خلافت سے اس کے جواب میں تین حرف الف لام میم موصول ہوئے، جن کا اشارہ سورہ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ کی طرف تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سلطان محمود کو یاد کرنا چاہیے

کہ خانہ کعبہ کو ڈھانے کو آنے والے اصحاب فیل کا کیا حشر ہوا؟ سلطان پر ان مخفف الفاظ نے بہت اثر کیا۔ اور وہ خوف خدا میں لرزہ براندام ہو گیا۔ پھر اس نے فردوسی کی ایذا رسانی میں کد نہ کی۔

بغداد میں فردوسی کو آسودہ حالی تو حاصل نہ ہوئی، لیکن خلیفۃ المسلمین کی پناہ میں سلطان غزنی کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہا۔ وہ بے خوف و خطر زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ دربار خلافت میں اس کی خاص قدر و منزلت کی جاتی۔ اہل بغداد عزت سے ساتھ پیش آتے۔ انھیں کی فرمائش سے اس نے یوسف زلیخا نظم کی اور عربی کے چند قصائد لکھکر خلیفہ کے حضور میں پیش کئے۔

طوس سے مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ سابقہ خط میں فرنگیس نے شکایت کی تھی کہ اس نے اپنے وعدہ کو فراموش کر دیا اور بغداد پہنچکر اس کو طلب نہیں کیا فردوسی خود بیٹی کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھا۔ مگر نجانے کیوں اس کا دل فرنگیس کو بلانے کے لئے نہ اٹھتا اور وہ التوا پر التوا کرتا جاتا۔ زیبا کا حال معلوم کرنے کے لئے البتہ ایک اضطراب اور طبیعت میں عجیب قسم کی بے کلی رہتی جس کا سبب خود اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اسی طرح فردوسی کو بغداد میں ایک مدت گذر گئی اور ذہنی پریشانیاں مختلف بیماریوں کی شکل میں نمودار ہونے لگیں۔

فردوسی صبر و تحمل کا ایک کردار عظیم تھا۔ بڑی بڑی مصیبتوں کو وہ مردانہ وار جھیل لے گیا تو جسمانی تکالیف کا شمار ہی کیا تھا۔ مگر اس علالت نے چند ہی روز کے بعد سے اس کو زندگی سے مایوس کر دیا اور بغداد میں اس کی طبیعت الجھنے لگی وقت کے بہترین طبیب اس کے معالج تھے۔ لیکن اس کو صحتیاب ہونے کی امید

نہ رہی اور حیات کی آخری ساعتیں گزارنے کے لئے وہ طوس جانے کو تیار ہو گیا۔

ہمدردوں نے سمجھایا بجھایا کہ اس حالت میں سفر مناسب نہیں مگر فردوسی کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، دوسرے اس سے واقف نہ تھے۔ فردوسی نے کسی کے کہنے پر اعتنا نہ کی اور ایک روز ایک گھوڑا گاڑی پر بغداد سے طوس کی سمت روانہ ہو گیا۔

باب (۴۲)

جنونِ محبت

گھوڑا گاڑی اندھیری رات میں جا رہی تھی زیبا فردوسی کا خط ہاتھ میں لئے خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ ہر چند لمحات کے بعد خط کو لفافہ سے نکالتی اور آنکھوں کے قریب لے جاتی۔ مگر حروف تاریکی میں نظر نہ آتے۔ بوڑھا فردوسی تصور میں انہیں الفاظ کو دہراتے دکھائی دے رہا تھا۔ زیبا نے جن کو ابھی خط میں پڑھا تھا۔ بعض بعض جملے خود زیبا کی زبان سے ادا ہو رہے تھے اور وہ متضاد کیفیتوں میں مستغرق تھی۔ کبھی فردوسی سے ملنے کی امید سے چہرے پر ایک رنگ آجاتا اور کبھی کسی اندیشے سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ ساری رات کا سفر اسی طرح گذر گیا اور صبح کے دھندلکے میں وہ ایک منزل پر قیام پذیر ہو گئی۔

ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے ناشتہ کیا اور فردوسی کے خط کو لے کر پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ فردوسی نے لکھا تھا۔

عزیزہ زیبا۔

خدا تعالیٰ ماہ پارہ کی طرح ضمیر کو روشن کرے۔

غزنی سے روانگی کے وقت مجھے تم سے مل نہ سکنے کا افسوس ہے۔ لیکن اچھا ہی ہوا کہ ایسی مجبوریاں حائل ہوگئیں تھیں چند ساعت بعد میرے فرار کی اطلاع مل سکی اور اسی قدر، وقفہ تک جدائی کے صدمہ سے بچی رہیں۔

تم کو مجھ سے شکایت ہوگی کہ میں نے غزنی سے چلتے وقت تم کو ساتھ کیوں نہ لے لیا لیکن غور کروگی تو تمہارے لئے کسی رنج کا محل نہیں ہے۔ تم میری رفیقۂ حیات کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ آہ رفیقۂ حیات کی تصویر جس نے زندگی کے سفر میں میری تنہائی کا خیال نہ کیا اور اکیلا چھوڑ کر چلی گئی نوشابہ کی عمر نے بیوفائی کر کے نوشابہ کو بیوفا کہلا دیا تو تم تو اس کی نقل ہو جس سے مطابقت کہاں تک نہ کروگی اور اپنی طرف سے تم عورت کی وفاداری پر حرف نہ بھی آنے دو تو میرا ایمان ہے کہ میرا مقدر ایسے حالات پیدا کر دیگا کہ تم مجھ سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔

زیبا دنیا کا دستور ہے کہ ساتھ ان عورتوں اور مردوں کا ہوتا ہے جن کے سن و سال میں مناسبت ہو اس اعتبار سے تم کو مجھ سے تضاد ہے۔ تم ایک جوان سال اور خوبرو دوشیزہ میں اسی سال کا ایک بوڑھا انسان مجھ کو تم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ مگر مجھے اس سے انکار نہیں کہ مجھ کو تمہاری شکل و صورت سے لگاؤ ہے ایسا لگاؤ جس کو مجنونانہ محبت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جو ہر قدم پر ایک آرزوئے تازہ کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن آرزو اور ارمان جوان دلوں کا کام ہے۔ میں پیرانہ سالی کی تحریف میں نہ بھی ہوتا تو بھی بھول کر کسی تمنا کو جگہ نہ دیتا؛ پچھلی زندگی کے تلخ تجربات کے علاوہ ذاتی طور پر میں محبت کے مقدس جذبہ کو حسرتوں کا پابند بنا کر محبت کی توہین نہیں کر سکتا۔ محبت کسی رجحان کی تابع ہو کر محبت کہے جانے کی مستحق نہیں

رہتی زندگیوں کی وابستگی کا سوال اس رشتہ کا ایک ضمنی پہلو ہے جو عمروں کی ہم آہنگی کے باعث پیدا ہو جاتا ہے اور مستقل یکجائی کا جواز نکل آتا ہے۔ میں نے تم کو کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ حالانکہ میرے لئے تم کو نوشابہ سمجھ لینے کے اسباب موجود ہیں۔ مگر میرا یہ عزم نہ صرف تمہاری ناقدری ہوگی بلکہ تمہارے ساتھ انتہائی ظلم ——— میں نے تمہارے انداز سے محسوس کیا ہے کہ تم نے واقعی اپنے کو نوشابہ قرار دے لیا ہے اور اوائل عمر میں تمہاری دل شکستگی تم کو اس سطح پر لے آئی ہے۔ تم میری مردہ آرزوؤں کا خواب ہو مگر اپنے کو حقیقت کر دکھانا چاہتی ہو۔ اور میرے کلام کی عقیدت میں اپنی جوانی کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو۔ لہذا میرا فریضہ ہے کہ تم کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دوں اور جہاں تک میرا خیال ہے میں نے اس کی ادائی میں کوتاہی نہیں کی۔ تم میری دلجوئی کے لئے یا اپنی دوشیزگی مجروح ہو جانے کے احساس میں اردوان کی محبت سے منہ پھیرے رہی تھیں۔ میں نے اپنی شخصیت کا اثر ڈال کر تم کو تمہارے غلط ارادے سے باز رکھا۔ لیکن قسمت کوئی اور گل کھلانا چاہتی ہے۔ میں تمام عمر مقدر کی برگشتگی کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس معاملہ میں بھی سینہ تان کر مقابل ہونے کا عزم رکھتا ہوں اور تم سے غیر معینہ مدت کے لئے جدا ہو رہا ہوں تاکہ تم اردوان کو تلاش کر کے اس کی رفاقت حاصل کر لو۔ اگر تم نے اس فرض کو پورا کرنے سے قبل مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو تم کو ملاقات نہ ہونے کی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔

تم ایک عقیل و فہیم لڑکی ہو۔ اچھا اور برا سمجھتی ہو۔ پھر زمانے نے تم کو کچھ تجربہ کار بھی بنا دیا ہے۔ کوئی اہل نظر ایسی کشتی پر بیٹھنے کے لئے قدم نہیں بڑھاتا جس کی پیندی میں چھید ہو گئے ہوں اور جو دھارے پر پہونچنے سے قبل ڈگمگا کر بیٹھ جانے

والی ہو۔ تم کو طوفانِ حیات میں دو مضبوط بازوؤں والے ملاح کی ضرورت ہے جس کے ہاتھوں کا چپو تمہاری زندگی کے بیڑے کو پار لگا دے۔ اس لئے میری محبوبہ کی جانشین! میں تم کو اپنے مقدس رجحان کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری اس تمنا کو پورا کر دو تاکہ مجھے نوشابہ سے خجل نہ ہونا پڑے

اردوان کی شریک زندگی بن کر اگر کبھی تم میرے سامنے آئیں تو میری نگاہوں میں اپنے لئے نوشابہ کا اخلاص اور ایک چاہنے والے کا پیار موجود پاؤ گی ورنہ میں دل پر پتھر رکھ کر تم کو دیکھنے سے بھی انکار کر دوں گا۔ تمہارا

"فردوسی"

زیبا فردوسی کے خط کو بار بار پڑھتی اور رکھ دیتی۔ کچھ دیر سوچتی رہتی پھر ایک مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتی اور اس کے چہرے پر ایک مایوسی جھلکنے لگتی۔ اسکے فردوسی کی نافرمانی کی تھی اور اس کے منشا کو پورا کئے بغیر اس سے ملنے جا رہی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں واقعی وہ ملاقات سے انکار نہ کر دے۔ فردوسی کی طبیعت کے انداز سے اس اندیشے کو تقویت پہنچ رہی تھی مگر اپنی مجبوریاں زیبا کو امید دلا رہی تھیں کہ وہ ان کو بیان کر کے اس کو رضامند کرلے گی اور کچھ اور نہ بنا تو اشکوں کو آخری حربے کے طور پر استعمال کرے گی۔

زیبا نے جن حالات میں ماہ رخ کو اردوان سے منسلک کیا تھا ان میں قربانی کا ایک پہلو تھا اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ معاملہ کو اسی نوعیت سے فردوسی کے سامنے رکھے گی اور کہے گی کہ اگر وہ اردوان سے دست بردار نہ ہو جاتی تو ماہ رخ کے لئے موزوں شوہر ملنا دشوار ہو جاتا اور ہو سکتا تھا کہ اس کی جوانی کے باقی دن

اسی طرح گذر جاتے. ہرات سے روانگی کے ہنگام جب اس نے فردوسی کا خط پڑھا تھا تو ایک بار اس کے قدم ڈانواڈول ہو گئے تھے لیکن اسی خیال نے ہمت بندھائی اور ہر چہ بادا باد کہہ کر وہ گاڑی پر جا کر بیٹھ گئی۔

اسمٰعیل زیبا کو فردوسی کا کوئی پتہ نہ بتا سکا تھا اور حقیقتاً اس کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کس طرف کو گیا۔ اس لئے زیبا اپنے سفر کے لئے کسی سمت کا انتخاب نہ کر سکتی ایک منزل پر تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ سیدھی سڑک پر چل پڑی اور رات ایک بڑے قریے میں گذارنے کے لئے مقیم ہوئی تو اطمینان سے غور کرنے لگی آخر ایک نتیجہ پر پہونچ گئی۔ اس کا سفر طویل تھا۔ اس لئے اسی مقام سے گاڑی والے کو اس نے رخصت کر دیا اور کرایے کے اونٹ پر آگے کے لئے روانہ ہو گئی۔

مختلف مقامات پر گھومتی پھرتی ہوئی قہستان پہونچی۔ وہاں فردوسی کے آنے اور چلے جانے کا حال معلوم ہوا اور ماژندران کی طرف روانہ ہونے کا پتہ چلا زیبا کے لئے یہ خبر کچھ سکون بخش ثابت ہوئی۔ اب تک وہ فردوسی کے بارے میں بالکل تاریکی میں تھی۔ اب ایک راستہ معلوم ہو گیا تھا۔ وہ اس کو اختیار کر سکتی۔ فردوسی کو قہستان سے گئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کو توقع ہو گئی کہ جلد ہی اس سے جا ملے گی۔ ایک انجانے سرور کی سرخی زیبا کے رخساروں پر نمودار ہو گئی اور دل میں عجیب قسم کی دھڑکن محسوس ہونے لگی۔

فردوسی بوڑھا تھا یا جوان۔ بہرحال وہی ایک مرد تھا زیبا جس کا تصور کر سکتی اور جس کی ذات سے اپنے کو منسوب کر کے خوش ہو سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ خیالات کی پاکیزگی نے جنسی میلان کی گنجائش باقی نہ رکھی تھی، پھر بھی گرم خون کا تقاضا

اگر زیبا کے خیال کو کسی جانب منتقل کر سکتا تو وہ فردوسی تھا۔

قہستان سے ماژندران کی مسافت فردوسی نے کافی مدت میں طے کی تھی مگر زیبا کو دل سے لگی تھی۔ وہ چند ہی روز میں ماژندران پہنچ گئی۔ وہاں بھی مایوسی کا سامنا ہوا۔ مگر زیبا نے ہمت نہ ہاری اور ایک دن قیام کر کے رخت سفر باندھ لیا۔

فردوسی سلطان محمود کا قصوروار تھا تو زیبا سلطنت غزنی کی مجرم۔ دونوں کی گرفتاری کے فرمان اطراف واکناف میں پہنچ چکے تھے مگر مملکت غزنی کی حدود سے نکل کر محمود کے دونوں مجرموں نے خوف و ہراس کو کنارے رکھ دیا اور سلطان غزنی کی بدعہدی کی تشہیر میں زبان کھولی تو لب بند نہ کئے۔ محمود نے فردوسی سے وعدہ شکنی کی تھی۔ لیکن زیبا فردوسی سے زیادہ محمود سے برہم تھی۔ قہستان تک تو وہ جن لوگوں سے ملی سرسری طور پر دربار غزنی کی بدگوئی کرتی رہی مگر ماژندران آ کر اس نے نیا طریقہ اختیار کیا اور ایک بار پھر اہل فن مغنیہ کے چولے میں نظر آنے لگی۔

دربار غزنی نے زیبا کا دل و دماغ بدل دیا تھا۔ ہرات میں وہ ایک بازاری رقاصہ بن کر ابھری تھی۔ غزنی پہونچ کر فن کار بن گئی۔ شاہنامہ کی موسیقیت نے واقعی اس کو فن سے لگاؤ پیدا کر دیا اور اشعار کا ایسا چسکا ڈال دیا کہ بغیر گائے ہوئے قرار نہ آتا۔ غزنی سے ماژندران تک چنگ کو اس نے ہاتھ نہ لگایا تھا لیکن فردوسی کے اشعار کو صبح سے شام تک ہر وقت گایا کرتی۔ ماژندران میں لوگوں نے ایک فنی مظاہرے پر مجبور کیا تو ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ گئی۔ چنگ کے بجتے سروں کے ساتھ شاہنامہ کے کچھ شعر سنا کر ہجو کے اشعار پڑھنا شروع کر دیے

جواس نے ہرات میں سنے تھے۔ حاضرین اس کی نغمہ بار آواز اور فنی مہارت پر سَر دھننے لگے اور رقص کے اختتام پر اکثر لوگ محمود کو بُرا کہنے سے باز نہ رہے۔

زیبا اس مجلس کے دوسرے روز ماژندران سے روانہ ہوگئی۔ کیونکہ اس کو سپہبد والی ماژندران کی طرف خطرہ تھا۔ ماژندران والوں کے علم میں فردوسی بغداد میں تھا۔ لہٰذا زیبا وہاں سے بغداد کی عازم ہوگئی۔ مگر اس کی قسمت میں شاید دوبارہ فردوسی سے ملنا لکھا ہی نہ تھا۔ فردوسی بغداد میں اس کے ورود سے قبل طوس کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

باب (۲۵)

انجام کار

فردوسی طوس پہنچتے پہنچتے بالکل صاحب فراش ہو گیا۔ شہر میں داخل ہو کر گاڑی بان نے مکان کا پتہ دریافت کیا تو اس نے حسین قتیب کا نام لے لیا اور گاڑی ایک عالی شان مکان کے سامنے پہونچ کر رک گئی۔

حسین قتیب محبوب دوست کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا اور فرط جذبات میں اس کے دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ فردوسی اس کا سہارا لے کر گاڑی سے نیچے آ گیا اور حسین قتیب نے مردانہ بیٹھک میں ایک مسہری پر لیجا کر لٹا دیا۔

آناً فاناً میں خبر گشت کر گئی۔ حاکم طوس کو بھی اطلاع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی شدید علالت کا حال بھی معلوم ہوا۔ دربار غزنی سے ایک عرصے سے فردوسی کے متعلق کوئی ہدایت نہ ملی تھی اس لئے اس نے فردوسی سے کوئی تعرض نہ کیا۔ تاہم ایک عریضہ غزنی کو روانہ کر دیا اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔ مگر نہ غزنی سے کوئی فرمان صادر ہوا اور نہ اس کو فردوسی کو ماخوذ کرنے کی ضرورت پڑی۔

فردوسی ایک شاعر کی حیثیت کے علاوہ طوس میں کچھ اخلاقی اثرات بھی رکھتا۔ جیسے

ہی لوگوں کو اس کے وردد کا علم ہوا وہ جوق درجوق آنے لگے۔ علی دیلم اور بودلف تو خبر ملتے ہی دوڑ پڑے۔ فردوسی مسہری پر ایک گاؤ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا مخلص دوستوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور بچھڑوں کے ملاپ نے ایک رقت انگیز سماں پیدا کر دیا۔

فرنگیس کی آمد اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ بیٹی باپ کو دیکھتے ہی بلک پڑی اور فردوسی نے بھی پوری محبت میں آغوش اس کے لئے کھول دی دونوں کی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ فردوسی کا شانہ فرنگیس کے آنسوؤں سے تر ہو گیا اور اس نے تشفی و تسلی دے کر اس کو الگ کر دیا۔

فرنگیس کو اتنے دنوں تک خبر نہ لینے کی شکایت تھی۔ فردوسی نے مجبوریوں کا حوالہ دیکر روٹھی ہوئی بیٹی کو منایا اور داماد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے فردوسی کو اپنے وہاں چلنے کی دعوت دی۔ فردوسی نے اس کو جواب دینے کے بجائے حسین قتیب سے کہا کہ اس کا آبائی مکان صاف کرا دیا جائے وہ اسی میں قیام کرے گا۔ حسین قتیب اس کو اپنا ہی مہمان رکھنا چاہتا۔ اس نے وہیں رہنے پر اصرار کیا۔ لیکن فردوسی نے ضد کی اور حسین قتیب نے دو چار دن میں منتقل کرا دینے کا وعدہ کر لیا۔

فردوسی کو بظاہر کوئی مہلک مرض نہ تھا۔ کئی بیماریوں نے مل جل کر پلنگ لگا دیا تھا۔ حسین قتیب نے اسی دن ایک طبیب حاذق کو بلا کر معائنہ کرایا اور علاج شروع کرا دیا۔

حسین قتیب اور دوسرے احباب فردوسی کے وجود کو ظاہر کرنا خلاف مصلحت قرار دیتے مگر فردوسی کو زندگی سے اس قدر مایوسی ہو گئی تھی کہ اس نے کوئی احتیاط

فضول سمجھی اور احباب اس کی مرضی سے مجبور ہو گئے۔ پھر بھی حسین قتیب نے عامل طوس سے مل کر یقین دلا دیا کہ فردوسی بغیر اس کی اطلاع کے طوس سے باہر نہ جائے گا۔ عامل یوں بھی اپنے کو کسی کارروائی کا مجاز نہ سمجھتا۔ حسین قتیب کے کہنے پر اس نے اطمینان دلا دیا کہ اس کی طرف سے فردوسی کے خلاف شان کوئی عمل ظہور میں نہ آئے گا۔

تین چار روز قیام کے بعد فردوسی اپنے مکان کو منتقل ہو گیا۔ قہستان، ماژندران اور بغداد وغیرہ سے اس کو جو عطائے ملے تھے۔ وہ مل جل کر ایک خاصی رقم ہو گئی تھی۔ فردوسی نے اس کو نرگیس کے ہاتھ میں دے دیا اور نوشابہ کا گھر ایک بار اس کی بیٹی کے زیر انتظام پھر آباد ہو گیا۔

فردوسی نے برسوں کے بعد ان در و دیوار کو دیکھا۔ جن کے گوشہ گوشہ سے دل کی دھڑکنوں کو ربط رہا تھا بشرؔ پچھتر سال میں گذرنے والی ایک ایک بات حافظہ میں گشت کرنے لگی۔ خصوصیت کے ساتھ وہ ایام نگاہوں میں پھرنے لگے۔ جو اس نے نوشابہ کے ساتھ گذارے تھے۔ حرماں نصیب محبوبہ کا آبانی چہرہ ماضی کے پردوں سے جھانکنے لگا۔ اور فردوسی تھوڑی دیر کے لئے حال و استقبال سے غافل ہو گیا۔

علی دیلم اور بودلف اس کو پہنچا کر واپس ہو گئے تھے کیونکہ نرگیس اور اس کا شوہر تیمارداری کے لئے کافی تھا۔ نرگیس کی عمر تیس بتیس سال کی ہو چکی تھی اس کو صحن مکان میں، دیکھ کر فردوسی نوشابہ کو نہ بھولتا۔ بیٹی ماں کی صحیح جانشین تھی نشست و برخاست، رفتار گفتار کسی بات میں فرق نہ تھا اور عمر بھی اتنی آ گئی تھی جو فردوسی کے لئے یادگار رہ گئی۔ اور جس عمر میں پہنچ کر باوفا رفیقہ نے ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ دیا

احباب کی دیکھ بھال بیٹی کی تیمارداری اور معالج کی توجہ سے فردوسی کو افاقہ ہونے لگا۔ جسمانی شکایات میں کمی ہوگئی۔ مگر اس کا چہرہ بشاش نہ ہوسکا۔ دیکھنے والے مطمئن تھے لیکن فردوسی ان کی فریب خوردگی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ فن طبابت کا ماہر تھا اپنے نظام جسم کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ان کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوگا۔ اور جسم خاکی سے پاک روح کے جدا ہونے کا وقت قریب آجائے گا۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ اس طرح کٹ گیا۔ آخر فردوسی کا قیاس صحیح نکلا۔ بیماریاں پھر سے عود کر آئیں، اور ادویہ نے اپنے اثرات چھوڑ دیے۔

فردوسی شاہنامہ کا مصنف ہونے سے قبل بھی طوس میں ہر دلعزیز تھا اور اب جو اس نے ملک و قوم پر احسان کیا تھا سارا ایران اس کے نام کو عقیدت اور احسان کی نگاہ سے دیکھتا اور متعلق لوگ تو جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے۔ حسین قتیب، بو دلف اور علی دیلم اس کی علالت بڑھ جانے سے گھبرا گئے۔ اور انھوں نے دوڑ دھوپ میں اضافہ کر دیا۔

فرنگیس کی تڑپ کا عجیب عالم تھا۔ اس غریب نے تو آنکھیں کھول کر صدمات کے سوا کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ ماں کا مرنا صغر سنی کی بات تھی۔ فردوسی تنہا اس کے لئے والدین کی تعریف میں آتا۔ فرنگیس کے جوان ہونے تک اس نے اپنے فرض کو ادا کیا۔ اس کے بعد جو باپ بیٹی میں جدائی ہوئی تو اس کا اختتام اب جا کر ہوا جب فردوسی کی شمع حیات بجھ جانے کے لئے جھلملا رہی تھی۔ فرنگیس کا دل وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر باپ کے چہرے پر نگاہ ڈالتی اور سوچتی کہ کیا اس کا یہ سہارا بھی چھن جائے گا؟ دل خود بخود بھر آتا اور وہ تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر

پھوٹ کر رونے لگتی۔

فردوسی کو اپنی حالت کا پورا اندازہ تھا۔ ایک روز اس نے فرنگیس کو قریب بلاکر بٹھایا، پیار سے دیکھتا رہا اور نقیہہ آواز میں ہر ذی حیات کی فنا پر روشنی ڈالنے لگا۔ فرنگیس اس کے اشارے کو سمجھ کر رو پڑی۔ فردوسی نے استعجاب سے اس کو دیکھا اور کہا کہ وہ اس باپ کی بیٹی ہے جو بڑی سے بڑی مصیبت پر مسکراتا رہا۔ اس کو ایک بوڑھے کی موت کے اندیشے پر صبر نہیں آسکتا؟ فرنگیس نے فردوسی کی دلجوئی کے خیال سے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور فردوسی اس کو دنیا کی بے ثباتی کی تلقین کرتا رہا۔

دوسرے دن اس نے حسین قتیب، علم دیلم اور بودلف کو یکجا کیا۔ فرنگیس کی خبر گیری کرتے رہنے کا وعدہ لیا اور زیبا رخ کا تعارف کرا کے کہا کہ اگر وہ اس کی موت کی خبر پاکر دوڑی ہوئی آئے تو اس کو زیادہ غمزدہ نہ ہونے دیں اور صبر وسکون کی تلقین کریں۔ بودلف نے فردوسی کے یاس انگیز جملوں پر دلدہی کی کہ وہ اس قدر مایوس نہ ہو انشاء اللہ صحتیاب ہو جائے گا۔ فردوسی اس کی طرف دیکھ کر تلخی کے ساتھ مسکرایا جس کا مطلب یہ تھا کہ

مجھے زندگی کی دعا دینے والے ہنسی آرہی ہے تیری سادگی پر

تیمارداروں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا اور حسین قتیب نے موضوع بدلنے کے لئے زیبا کا ذکر چھیڑ دیا۔ فردوسی نے غزنی میں اس کی اتفاقیہ ملاقات سے لے کر روانگی تک کے واقعات مختصراً بیان کر دئے اور آخر میں ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ زیادہ باتیں کرنے سے اس کو کچھ کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ آنکھیں بند کر کے پڑ گیا اور حسین قتیب اس کے

آرام کے خیال سے سب کو لے کر باہر چلا گیا۔

اس کی حالت بظاہر مخدوش نہ تھی۔ حواس خمسہ برابر کام کر رہے تھے مگر وہ وقت کو غنیمت سمجھ رہا تھا اور عزیز ترین دوستوں اور فرنگیس کو جو نصیحتیں اور وصایا کر سکتا کرتا رہتا۔ تین چار دن اسی طرح کٹ گئے۔ چوتھے روز شام سے حالت کچھ بگڑنے لگی۔ فرنگیس نے گھبرا کر حسین قتیب کو بلا بھیجا وہ اسی وقت آ گیا۔ فردوسی کے ہوش و حواس درست تھے۔ مگر گویائی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اکھڑی اکھڑی زبان میں اس نے حسین قتیب کے سلام کا جواب دیا اور اشاروں میں دم واپسیں قریب ہونے سے باخبر کیا۔ حسین قتیب کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اس کا محبوب رفیق اور فخر ملک و ملت ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ لیکن حسین قتیب نے فرنگیس کی طرف دیکھ کر ضبط کیا اور اس کو اطمینان دلا کر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

بودلف اور علی دیلم بھی فوری طلبی پر آ گئے۔ حسین قتیب نے ان کو خدشہ سے آگاہ کیا اور تینوں دوست یکے بعد دیگرے فردوسی کے کمرے میں داخل ہو گئے اس عرصہ میں اس کا نظام جسم کچھ اور بگڑ چکا تھا۔ اس نے تینوں کو گردش دے کر ادھر ادھر دیکھا۔ بودلف نے کچھ سمجھ کر فرنگیس کو آواز دی۔ وہ چہرے پر نقاب ڈال کر آ گئی بودلف اور علی دیلم اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ان کی نگاہیں فرنگیس کے چہرے پر نہ پڑیں۔ فرنگیس نے پلنگ کے قریب پہنچ کر نقاب اٹھا دیا۔ فردوسی نے ایک بار نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور آنکھیں ایک حرکت کر کے ساکت ہو گئیں۔

شاداب کے جاگیردار کے مکان پر اداسی برسنے لگی۔ در و دیوار سے نالہ و شیون

کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ نرگیس پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ حسین قلیب۔ بودلف اور علی دیلم
چیخ چیخ کر رونے لگے۔ صرف وہی نہ رو رہے تھے۔ طوس کا ذرہ ذرہ اشک فشاں
تھا بلکہ سرزمین ایران ماتم کر رہی تھی اور اپنے کئے پر نالاں تھی کہ اس نے اس فرزند
یگانہ کی قدر نہ کی۔ جس نے فارس کی عظمت کو خاک میں ملنے سے بچایا۔ سہراب کی طاقت
اور رستم کی شجاعت سر در گریباں ہو گئی، کہ وہ اپنے بانی کی کوئی مدد نہ کر سکی۔ غزنی
میں محمود کے محل کے کنگرے ندامت میں سرنگوں ہو گئے کہ باایں سطوت و جبروت
وہ ایک مردِ حق گو کی زبان کو روک نہ سکے حتیٰ کہ وہ ان کی دسترس سے باہر ہو گیا

باب (۲۶)

فنکار کی جیت

محمود بلا شبہ ایک اہل سیف اور صاحب علم سلطان تھا اس کے کارنامے صفحۂ تاریخ میں فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ جود و سخا کی بعض مثالیں بھی اس کے نام کو سربلند کرتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ اس نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہیں کیا اور اس کا دامن بخل و پیمان شکنی کے دھبوں سے داغدار رہے۔

فردوسی کے واقعہ میں اگرچہ وہ اپنے مشیروں کی غلط رائے کی بدولت بدنام ہوا تاہم اس کی ذمہ داری خود اسی کے سر عاید ہوتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خواجہ بزرگ احمد اور ابوسہل فردوسی کی بیخ کنی میں ساعی نہ ہوتے تو نہ فردوسی صلے سے محروم رہتا اور نہ محمود رہتی دنیا تک کے لئے متہم کیا جاتا۔

ابوسہل کو تو فردوسی سے عناد کا ایک سبب تھا وہ اس کو زیبا کی راہ میں روڑا سمجھتا۔ بزرگ احمد کے لئے عداوت کا کوئی محل نہ تھا وہ صرف ابوسہل کی دوستی نباہ رہا تھا۔ اسی کی خاطر فعل شنیع کا مرتکب ہو گیا اور اپنے آقا کی رسوائی کا باعث بن گیا۔

فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ انتقام لے لینے کے بعد غم و غصہ فرد ہو جاتا ہے اور کسی مخالف کو نیچا دکھا کر مخالفت کا جذبہ دل سے نکل جاتا ہے۔ مگر بزرگ احمد اور ابو سہل کے قلوب جانے کس طرح کے تھے کہ فردوسی کو اوارہ گرد بنا کر بھی نہ پسیجے اور محمود جب کبھی راہ راست اختیار کرنے پر مائل ہوا انھوں نے بات کی بیچ میں ایسے فقرے چسپ کر دیے کہ مزاج سلطانی برہم ہو گیا اور فردوسی کا مقدر بگڑ کر بن نہ سکا۔

فردوسی کو غزنی سے گئے ہوئے جتنے دن گذرتے گئے۔ محمود کا دل اس کی طرف سے اتنا ہی صاف ہوتا رہا۔ حتی کہ اس نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ محمود کو مہمات ملکی سے اتنا شغف تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھنا پسند نہ کرتا تھا اور انتقام سے درگذر کو بہتر سمجھتا۔ یہی روش اس نے فردوسی کے مسئلہ میں بھی اختیار کی اور امور سلطنت میں اس قدر منہمک ہوا کہ بھول کر فردوسی کا نام نہ لیا۔ گویا فردوسی نام کا کوئی شاعر کبھی غزنی میں رہا ہی نہ تھا۔

ابو سہل کو زیادہ صورت نہ بھاتی اور احساس ناکامی میں فردوسی کے خلاف شہتعال پیدا ہو جاتا۔ مگر عمر طبعی کو پہنچ جانے کے سبب اس کے جذبات بھی سرد پڑ گئے اور اس کے لیے بھی فردوسی اور زیادہ ایک بھولی ہوئی بات بن گئے۔

مالک اور ابو نصر فردوسی کے سچے دوست تھے۔ ان کو فردوسی سے تا قیامت مل سکنے کی امید نہ تھی پھر بھی ان کے دل اس کی بہی خواہی کے جذبہ سے پر تھے۔ انھوں نے سوتی ہوئی بھڑوں کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور جان بوجھ کر فردوسی کا نام نہ لیا۔ انھیں خاموش رکھنے میں شاید قدرت کی یہ مصلحت تھی کہ وہ فردوسی کو مستحق ثابت کرنے کے

لئے بدترین دشمن سے دوست کا کام لینا چاہتی۔ جس کا ظہور فردوسی کی روانگی کے کئی سال بعد ہو کے رہا ——— ایک بار محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آرہا تھا۔ راہ میں ایک دشمن کا قلعہ تھا۔ محمود نے پڑاؤ ڈال دیا اور قاصد بھیج کر قلعہ دار کو اطاعت بجا لانے کا حکم دیا۔ قاصد دوسرے دن جواب لے کر واپس آگیا۔ محمود نے بزرگ احمد سے کہا کہ خط کھول کر پڑھے قاصد کیا جواب لایا ہے؟ بزرگ احمد نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا اور اس کی زبان پر ایک شعر آگیا۔

اگر جز بکام من آمد جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود بر محل شعر پر پھڑک اٹھا اور پوچھ بیٹھا کہ کس کا شعر ہے؟ بزرگ احمد نے بلا ارادہ شعر پڑھ دیا تھا۔ محمود کی پرسش پر سٹ پٹا گیا اور وہ نام اس کو زبان پر لانا پڑا جس کو اس کا دل نہ چاہتا یا دل ناخواستہ اس نے کہہ دیا "حکیم ابوالقاسم فردوسی"! فردوسی کے نام پر محمود کا سر جھک گیا۔ عرقِ انفعال پیشانی پر نمودار ہو گیا اور اس کو محسوس ہوا کہ اس نے فردوسی کی بہت ناقدری کی۔

غزنی پہنچ کر سب سے پہلا کام جو محمود نے کیا۔ وہ یہ تھا کہ ساٹھ ہزار دینار بلا توقف طوس بھیجنے کی تاکید کی اور ابوسہل کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ وہ بذاتِ خود ان کو لے کر جائے اور فردوسی کو رضامند کر کے واپس ہو۔

محمود کا یہ عطیہ واقعی احساسِ ندامت کے تحت ہو یا فردوسی کی زبان بندی کا معاوضہ مگر واقعہ یہی ہے کہ ابوسہل ساٹھ ہزار دینار یا بعض روایات کے بموجب اس کا نیل خرید کر غزنی سے روانہ ہوا اور سرعت کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا طوس

کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ شہر کے اندر وہ تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ مخالف سمت سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا اور یہ جنازہ تھا حکیم ابوالقاسم منصور الفردوسی کا ابوسہل احترام میت میں اونٹ سے اتر پڑا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے کاندھا دینے کے لئے بڑھا۔ قریب پہنچکر ایک شخص سے مرنے والے کا نام پوچھا۔ اس نے کچھ ایسا جواب دیا کہ ابوسہل کو کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مگر کہنے والے نے صاف لہجہ میں فردوسی کا نام لیا تھا کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی ——— وہ ابوسہل جو فردوسی کے خون کا پیاسا اور عزت کا درپے تھا۔ اس کی موت کی خبر پر سناٹے میں رہ گیا۔ محمود نے اس سے کہا تھا کہ فردوسی کی رضا حاصل کرکے واپس ہو۔ فردوسی اس دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر چکا تھا۔ ابوسہل کس سے معافی حاصل کرتا؟ اس کو فردوسی کے مرنے کا ملال نہ تھا۔ فکر اس بات کی تھی کہ محمود کو کیا جواب دے گا؟ ابوسہل کو خدشہ تھا کہ سلطان اظہار پشیمانی میں اس کو فردوسی کی محرومی اور موت کا ذمہ دار قرار نہ دے دے۔ لیکن قضا وقدر پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ ابوسہل نے ساتھ والوں کے اونٹ اسی مقام پر ٹھہرا دیے اور خود جنازے والوں کے ہمراہ ہولیا۔

"باغ فردوس" نوشاہ کا دائمی آرام گاہ تھا۔ فردوسی کی قبر بھی اسی کے پہلو میں کھودی گئی تھی۔ ابوسہل میت کے ساتھ باغ میں داخل ہوا اور قبر کے قریب پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔

خلقت اس کے لئے رو رہی تھی۔ احباب رنج وغم میں نڈھال تھے۔ حسین قتیب کا بُرا حال تھا۔ گروہ دوست کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے آگے آگیا اور فردوسی کے

جسدِ خاکی کو ہاتھوں ہاتھ قبر میں اتارنے لگا۔ ابھی اس فرض سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ مجمع میں ایک انتشار کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی اور ایک عورت لوگوں کے بیچ سے گذرتی ہوئی لحد کے کنارے آکر کھڑی ہو گئی۔ ابو سہل کی نگاہ پڑ گئی اور وہ بے ساختہ زیبا کہہ کر چیخ اٹھا۔

زیبا بغداد میں فردوسی کی بیماری کی خبر پاکر طوس کی طرف چل پڑی تھی۔ شہر میں داخل ہو کر ایک شخص سے اس نے فردوسی کے مکان کا پتہ پوچھا اس نے بتا دیا کہ طوس کا فنکار عالمِ باقی کی طرف سدھار گیا۔ زیبا کے حواس اس اطلاع پر جاتے رہے۔ مگر اس نے باغ فردوس کی سمت قدم اٹھا دیے اور گرتی پڑتی اس مقام تک پہنچ گئی جہاں چند منٹ میں فردوسی مٹی کے انبار کے نیچے چھپ جانے والا تھا۔

زیبا اب تک اپنے کو روکے ہوئے تھی لیکن فردوسی کی میت کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکی اور پچھاڑ کھا کر مٹی کے ڈھیر پر گر پڑی۔ ابو سہل کی زبان سے زیبا کا نام سن کر حسین قتیب بودلف اور علی دیلم متوجہ ہو گئے۔ نسائیت کا ایک تماشا کارخاک کے انبار پر فردوسی کا نام لے رہا تھا اور مٹی اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔

بودلف نے بڑھ کر اس کو اٹھانا چاہا۔ مگر زیبا کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ وہ کسی کے سمجھانے بجھانے کا اثر کیا لیتی۔ خاک پر پڑی ہوئی اشکباری کرتی رہی۔ اس کی زبان پر "ہجو" کے اشعار تھے اور ایک جوش کے ساتھ وہ ان کو پڑھ رہی تھی۔

مجمع فردوسی کے دفن ہونے کا منتظر تھا۔ اس لئے حسین قتیب نے تھوڑے وقفہ سے زیبا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کہا کہ بہت سے لوگوں کو اس کے سبب زحمت ہو رہی ہے۔ زیبا اس کے کہنے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن ایسی نگاہ سے حسین قتیب کو

دیکھا کہ اس کا دل ہل گیا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور آنکھوں میں آجانے والے اشک آستین سے پونچھ لئے۔

فردوسی کی لاش قبر میں اتار دی گئی۔ حسین قتیب نے کفن سرکا کر آخری دیدار کے لئے بوڑھے فنکار کا منہ کھول دیا۔ زیبا نے جھک کر دیکھا۔ فردوسی کے چہرے پر ایک نور برس رہا تھا اور وہ ابدی نیند میں غافل تھا۔ زیبا ایک لمحہ کے لئے اس حقیقت کو فراموش کر گئی کہ شاہنامہ کا مصنف مر گیا تھا۔ از خود رفتگی میں اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، مگر قریب کھڑے ہوئے کسی شخص نے روک لیا اور وہ چیخ مار کر رہ گئی۔

علی دیلم نے اس کو سہارا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور فردوسی کے جسد خاکی کو خاک کے سپرد کر دیا گیا۔

زیبا عقل و ہوش کی صلاحیتوں سے عاری ہو چکی تھی اور بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ اہالیان طوس جب یکے بعد دیگرے چلے گئے۔ اور فردوسی کے مخصوصین باقی رہ گئے تو زیبا نے مٹی کے ڈھیر پر ایک نگاہ ڈال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ نوشابہ اور شمس افروز کی روحیں مسکرا رہی تھیں اور زیبا کی طرف اشارہ کر کے فخر و مباہات کر رہی تھیں۔ شمس افروز کی بیٹی نے ایرانی عورت کی وطنیت کو سربلند کر دیا تھا اور نوشابہ کی قائمقامی کر کے نوشابہ پر احسان کیا تھا جو دونوں کے لئے موجب مسرت تھا۔ زیبا کی آنکھیں ایک طرف یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ دوسری طرف انجانے طریقہ پر ایک درد انگیز نغمہ کانوں میں گونجنے لگا۔ موسیقی کی فنکار اس کی تاب نہ لا سکی۔ دیوانگی طاری ہو گئی۔ اور خود بخود اس کے قدم اٹھنے لگے۔

بو دلف کی نظر اس پر اس وقت پڑی جب وہ کئی سو گز جا چکی تھی۔ اس نے بڑھ کر

روکا۔ زیبا نے ہاتھ چھڑا کر نکل جانے کی سعی کی۔ اس عرصہ میں حسین قتیب اور علی دیلم بھی آگئے انھوں نے ملائمت سے کام لے کر زیبا کو ساتھ لیا اور فردوسی کے مکان پر پہنچ گئے۔

زیبا اور فرنگیس کی ملاقات ایک غم انگیز نظارہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے صورت آشنا نہ ہونے کے باوجود واقف تھیں۔ دستگیر سے زیبا کا رشتہ روشنی میں آچکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فردوسی کی ذات سے ربط رکھنے کے باعث وہ آپس میں مربوط ہوگئی تھیں فرنگیس اس سے لپٹ لپٹ کر رو دی مگر وہ تصویر غم بنی کھڑی رہی اس کو جیسے ان باتوں سے سروکار رہی نہ رہا تھا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ حسین قتیب نے اس کی حالت سے خطرے کا احساس کیا اور فرنگیس سے جدا کرکے علیحدہ لے جا کر بٹھا دیا۔

ابو سہل کے آنے کی خبر طوس میں عام ہوگئی تھی۔ وہ عامل طوس کا مہمان تھا۔ رات گذار کر صبح کو حسین قتیب سے ملا اور اس کے اثرات سے کام لے کر فرنگیس سے صلہ قبول کر لینے کی خواہش کی۔ حسین قتیب، فرنگیس کی غیور بیٹی کی افتاد طبیعت سے واقف تھا اور خود اس کا جی بھی نہ چاہتا کہ دوست جس چیز کی آرزو میں دنیا سے اٹھ گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کو قبول کیا جائے۔ لیکن عقل کا تقاضا اس کے برعکس تھا۔ ساٹھ ہزار دینار کو ہاتھ سے دے دینا کوئی دانشمندی نہ تھی۔ حسین قتیب نے بو دلف اور علی دیلم سے مشورہ کیا۔ ان کے دل بھی محمود کی طرف سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے فرنگیس کے دنیاوی مفاد کا لحاظ کیا۔ اور ابو سہل کو لے کر فردوسی کے مکان پر پہنچ گئے۔

فرنگیس ایک ذی فہم لڑکی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا باپ مر کر زندہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی جیسے ہی ابو سہل کا پیغام کانوں میں پڑا اس کے تیوروں پر بل آگئے۔ آنکھیں

ڈبڈبا آئیں اور ہونٹ کانپنے لگے لرزتی ہوئی آواز میں اس نے کہا ـــــــ "محمود سے کہہ دینا کہ اس کا پورا خزانہ بھی فردوسی کا بدل نہیں کرسکتا اور نہ فرنگیس اتنی کوتاہ ظرف ہے کہ باپ کا خون بہا لے لے" ابوسہل نے منت سماجت کو دخل دیا۔ لیکن بنت فردوسی کی خودداری نے سلطان غزنی کا عطیہ قبول کرنے کی اجازت نہ دی۔ مایوس ہو کر ابوسہل نے درخواست کی کہ وہ عطیے کو منظور نہیں کرتی تو ابوسہل کی ذات کے لئے معافی نامہ لکھدے۔ فرنگیس کی رگوں میں عالی نسب فردوسی کا خون تھا۔ ابوسہل نے فردوسی کے لئے کچھ ہی نہ کیا ہو مگر وہ اس سے عفو کا طلب گار تھا۔ اس لئے بلاتوقف اسنے لکھ کر دے دیا۔ اور ابوسہل بے نیل و مرام غزنی کو واپس ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے صلہ کی رقم سے مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ایک کارواں سرائے تعمیر کرادی تھی جو فردوسی کے نام سے منسوب تھی اور ایک مدت تک مسافروں کو اس سے آرام پہنچتا رہا۔

ابوسہل کی طوس سے روانگی تک زیبا فردوسی کے مکان میں مقیم تھی۔ اسنے زیبا سے ملنے کی کوشش کی مگر زیبا نے انکار کر دیا۔ اس کا توازن عقل و ہوش درست نہ تھا۔ لیکن دوست دشمن کو پہچانتی تھی۔ ابوسہل کے نام سے اس کو نفرت تھی۔ صورت دیکھنا کیونکر گوارا کرتی؟ حالانکہ زیبا کی بدگمانی غلط تھی۔ ابوسہل کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اس کو اپنے اعمال پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ زیبا سے ملاقات کر کے وہ معافی مانگنا چاہتا تھا۔ زیبا نے جب کسی طرح وقت نہ دیا تو وہ ایک پرچہ اس کے نام چھوڑ گیا۔ جس میں ماضی کو بھول جانے کی استدعا کی۔ زیبا نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔ اور صدق دل سے معاف کر دیا۔

ابوسہل غزنی پہنچ کر زیادہ دن جی نہ سکا اور جلد ہی منصف حقیقی کے دربار میں جواب دہی کے لئے حاضر ہو گیا۔

زیبا کے شب و روز ایک سناٹے میں کٹ رہے تھے آنسو تو اس کی آنکھوں میں بہت کم دکھائی دیتے۔ مگر ہونٹ مسکراہٹ سے بھی آشنا نہ ہوتے۔ سارا سارا دن وہ ایک مقام پر دیوار کے کسی نقطہ پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہتی۔ گنگنانے کی آواز سنائی دیتی اور قریب جاکر سنا جاتا تو شاہنامہ کے اشعار معلوم ہوتے۔ حسین قتیب کا زیادہ وقت فردوسی کے مکان پر گزرتا۔ وہ زیبا کا خاص طور پر خیال رکھتا۔ گھر کے تمام افراد کو اس نے منع کر دیا تھا کہ زیبا سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور جس حال میں وہ رہنا چاہے۔ رہنے دیا جائے۔

فردوسی کے انتقال کے دو ہفتے بعد ایک صبح کو وہ موجود نہ ملی۔ فرنگیس نے فی الفور حسین قتیب کو اطلاع دی۔ اس نے چار طرف آدمی دوڑا دیے لیکن کوئی سراغ نہ ملا ایک شخص نے باغ فردوس کی سمت جانے کا پتہ دیا۔ حسین قتیب خود دوڑا گیا۔ نگراں باغ سے استفسار کیا اس نے بتا دیا کہ فردوسی کی قبر کی طرف سے صبح ہونے سے قبل کسی عورت کے گانے کی آواز آئی تھی۔ لہجہ انتہائی پر درد تھا۔ لیکن وہاں جاکر دیکھا تو کوئی موجود نہ ملا۔ حسین قتیب مایوس ہو کر پلٹ آیا۔ بودلف اور علی دیلم خود اطراف میں تلاش کرنے کے لئے گئے۔ مگر وہ شاید بہت دور جا چکی تھی۔

شاداب کے جاگیردار کا گھر طوس میں ایک باعزت گھر تھا۔ فرنگیس اس کی واحد نشانی تھی۔ باپ دادا کی چوکھٹ آباد رکھنے کے لئے اس نے شوہر کی اجازت سے فردوسی کے مکان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فردوسی کے دوست حسین قتیب

بو دلف اور علی دیلم جب تک بقید حیات رہے انھوں نے اس کو بیٹی کی طرح سمجھا مگر فردوسی کی موت سے اُنکی زندگیوں کا وقفہ زیادہ نہ رہا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک ایک کرکے وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اور فرنگیس بے سرپرست کے رہ گئی۔

تاب ضبط اور متحمل مزاجی اس کو ورثہ میں ملی تھی۔ زمانے نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ زمانہ کے ساتھ چلتی رہی اور حیات کی معینہ ساعتوں تک گذار کر لے گئی۔ اس کو زندگی میں باپ کی سی صعوبتیں تو برداشت کرنا نہ پڑیں مگر قلب میں تیر و نشتر چبھتے رہے بالآخر فارس کا ایک نامور خاندان بے چراغ ہو گیا فردوسی آخری سانس تک افلاس کا شکار رہا تھا۔ بیٹی گمنامی کی موت مر گئی اور جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا۔ جب اس حقیقت کا کوئی جاننے والا نہ رہا کہ نامراد فردوسی کی حرماں نصیب بیٹی کا کیا حشر ہوا۔؟

زیبا زیادہ دنوں تک طوس سے غائب نہ رہی۔ فردوسی کی موت سے ایک سال بعد باغ فردوس میں چنگ کے تاروں پر اس کے قلب کی آوازیں سنی گئیں۔ جو شاہنامہ کے اشعار کی صورت میں نکل رہی تھیں۔ اس عرصہ میں وہ خراسان سے ہرات تک کا ایک دورہ مکمل کر چکی تھی اور محمود کی ہجو میں کہے ہوئے فردوسی کے اشعار مسلسل لبوں پر آتے رہے تھے۔ ہرات میں اس کی ابتدا اور ایک بازاری رقاصہ کی حیثیت سے ہوئی۔ انتہا اس سے مختلف نہ رہی فرق صرف اس قدر تھا کہ ابتدا اس نے کسب معاش کے لئے کی تھی انتہا ایک مقصد کی تابع ہو گئی۔ اس نے فردوسی سے کہا تھا کہ وہ شاہنامہ اور

مصنف شاہنامہ کے لئے جینا چاہتی ہے۔ فردوسی بساط ہستی سے اٹھ چکا تھا شاہنامہ باقی تھا۔ لہذا زیبا نے شاہنامہ کی تبلیغ کو نصب العین بنا لیا۔ اس کی پر درد آواز چنگ کے تاروں کی ہم آہنگ ہو کر کسی شعر کو ادا کرتی تو سننے والے مسحور ہو جاتے۔ اور ہجو کے شعر پڑھ دیتی تو زبانوں سے محمود کے خلاف شان الفاظ نہ نکلنا ممکن نہ رہتا۔

فردوسی کے دوست اس وقت تک زندہ تھے۔ انھوں نے زیبا کو طوس میں رہ جانے پر مجبور کیا۔ مگر ان کی دعوت پر اس کے لبوں پر اتنا تلخ تبسم نمودار ہوا کہ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے خود حسین قتیب کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ نہم وادراک کی صلاحیتوں سے خالی نہیں بلکہ اس کی روش دانشمندی کی حدود سے آگے ہے اور اگر اس کے پاس یہ شغل باقی نہ رہا تو شاید زندگی بھی نہ رہے گی کیونکہ وہ بے ضرورت ہوگی۔ حسین قتیب نے پھر اس سے کچھ نہ کہا اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا

دوسرے سال اس نے عراق و ایران کے باقی شہروں کا گشت کیا اور فردوسی کے مزار کی زیارت کے لئے واپس آئی۔ اب کی اس کا جسم کافی متاثر نظر آرہا تھا مگر اس کو فکر نہ تھی بشریت کے تقاضے سے جو کچھ میسر آتا کھا لیتی اور جہاں جگہ ملتی پڑ رہتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کو کسی مقام پر تکلیف نہ ہوتی اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ جس شہر میں پہونچتی لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور خاطرداری سے پیش آتے۔ اس کا مقصود بادی النظر میں شاہنامہ کی تبلیغ تھا مگر دراصل وہ محمود کی رسوائی کے در پے تھی اور اپنی مساعی میں کامیاب تھی

محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں۔ ملک کے ملک غارت کر دئے لیکن یہ فردوسی کے کلام کی جہانگیری تھی کہ اس کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے ان کو وہ دبا نہ سکا۔ اور اس کی زندگی ہی میں سارے ایشیا میں ان کا آوازہ گونجنے لگا۔ زیب داستان کے لئے جس کی شہرت میں زیبا کا نام لیا جا سکتا ہے۔

زیبا کو اردوان اور ماہ رخ سے چھوٹے ہوئے ڈھائی تین سال ہو چکے تھے اس کا جی بہن اور بہنوئی کو دیکھنے کے لئے چاہتا مگر اس کو ان کی کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کس عالم میں اور کہاں تھے؟ اور نہ وہ ان کی بابت کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتی۔ کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ مبادا وہ اس کو جانے نہ دیں۔ دوسرے سال جب طوس میں اسکے آنے کا چرچا ہوا تو ایک روز شام کے وقت جبکہ وہ باغ فردوس میں فردوسی کو چنگ کے تاروں پر خراج عقیدت دے رہی تھی ماہ رخ اور اردوان خاموشی سے آکر داہنے بائیں بیٹھ گئے۔ زیبا نے گھنٹوں کے بعد چنگ رکھا۔ تو ماہ رخ پر نگاہ پڑ گئی۔ اور وہ ماہ رخ کہہ کر چیخ پڑی۔ ماہ رخ دفور جذبات میں لپٹ گئی اور رونے دھونے سے فرصت ہوئی تو زیبا کی پرسش پر اس نے بتایا کہ وہ اجداد کے موضع میں آکر آباد ہو گئی ہے۔ زیبا بودلف کی مہمان تھی۔ اردوان اور ماہ رخ بھی اس کے ساتھ وہیں چلے گئے اور ایک دوسرے کے حالات دریافت کرنے لگا۔ زیبا کی بابت ماہ رخ کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اپنے متعلق اس نے تفصیل سے واقعات بیان کئے زیبا کو ان دونوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر نتیجہ میں وہی بات پیش آئی جس کا اس کو خطرہ تھا۔ ماہ رخ بضد ہو گئی کہ وہ اس کو جانے نہ دے گی لیکن

زیبا کا فیصلہ اٹل ہو چکا تھا۔ ماہ رخ اور اردوان کی جد و جہد رائیگاں گئی اور زیبا طوس میں مقررہ وقت گذار کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئی۔

وقت ایک رفتار سے گذرتا رہا۔ خزاں بہار کے تعاقب میں دوڑتی رہی طوس کی زمین پر پھولوں کی کئی کئی فصلیں کٹ گئیں۔ زیبا ہر مرتبہ ایک سال کے بعد آتی۔ فردوسی کی آرام گاہ کا طواف کرتی۔ دل کے تاروں کو نغموں کا رنگ دیکر ستاتی۔ ماں جائی بہن کے گلے مل کر تسلی دیتی اور چند ہفتے ٹھہر کر چلی جاتی۔

صنف نازک کا نحیف پیکر ہر گرم و سرد کو برداشت کر رہا تھا۔ ماہ وشِ زیبا کسی فردوسی مخلوق کے بجائے ایک بوڑھی عورت کے سانچے میں ڈھل رہی تھی لیکن اس کا چہرہ آب و تاب سے جتنا خالی ہو رہا تھا۔ ضمیر اتنا ہی روشن ہوتا جا رہا تھا اور عمر جتنی گھٹ رہی تھی۔ ظرف میں وسعت اور آواز میں درد پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ فردوسی کی موت کے پانچ سال بعد آخر اس کی مراد بر آنے کے آثار نمودار ہو گئے اور خراساں کے قیام میں وہ نقل و حرکت کے قابل نہ رہی۔ جب اس کو موت کا پورا یقین ہو گیا تو ایک اونٹ پر سوار ہو کر مرنے کے لئے بہن کے مکان پر پہونچ گئی۔ ماہ رخ اس کو دیکھ کر خواہرانہ محبت میں بے چین ہو گئی۔ مگر زیبا کے چہرے پر اطمینان اور تیوروں سے بشاشت جھلکتی رہی۔ اس نے ماہ رخ کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی اور خندہ پیشانی سے دم واپسیں کا انتظار کرنے لگی۔

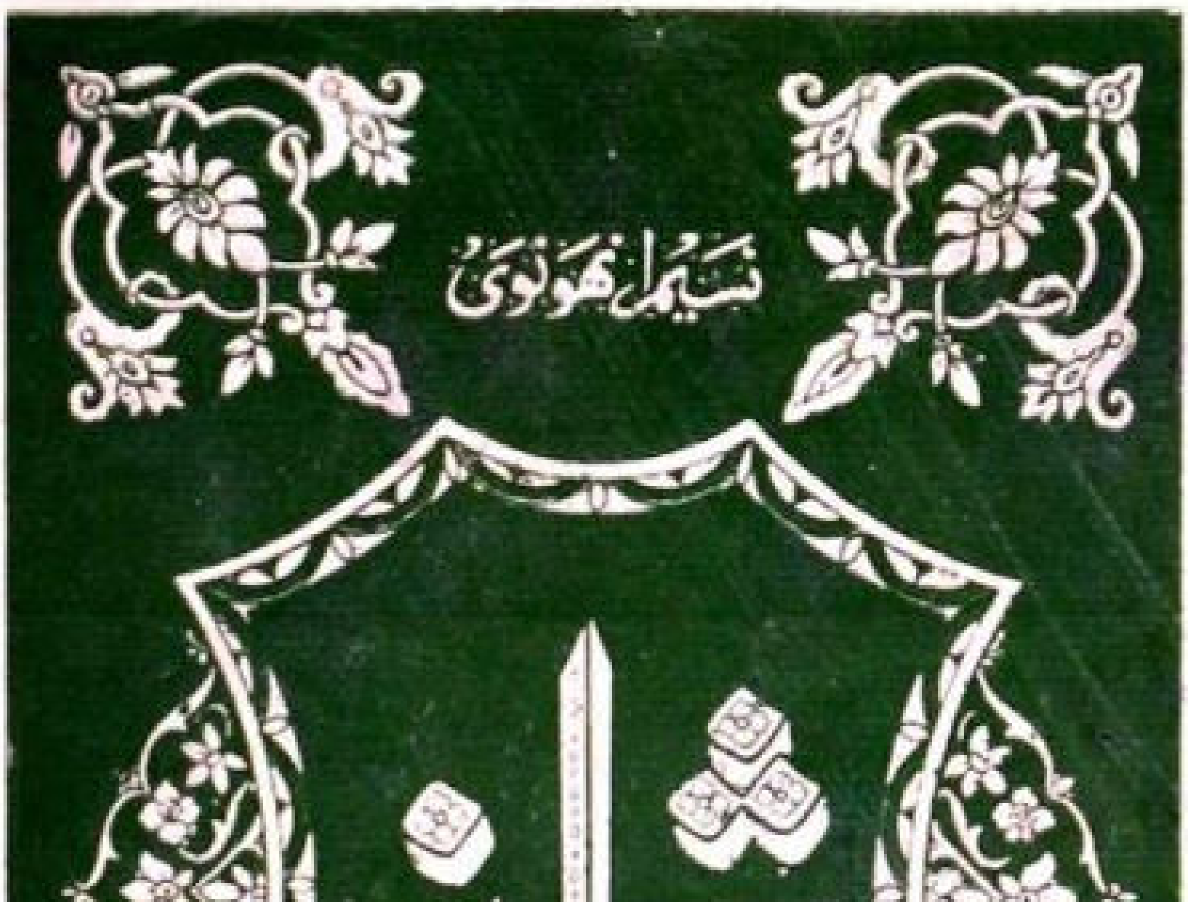
زیبا نے اپنی مختصر سی زندگی میں دنیا کے کتنے ہی اتار چڑھاؤ دیکھے تھے ان تجربات کے تحت اس نے ماہ رخ اور اردوان کو بہت سی نصیحتیں کیں مرنے سے ایک روز قبل چہیتی بہن کو قریب بلایا اور حیات کی بے ثباتی کا ذکر کر کے

فردوسی

رازدارانہ طریقہ پر کہنے لگی کہ اس کی تجہیز و تکفین اہل اسلام کے طور پر کی جائے اور فردوسی کی قبر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ ماہ رخ اس وصیت پر متعجب ہوگئی۔ اس پر زیبا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا کہ گو اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہے مگر درحقیقت وہ مرتا ہے فردوسی کے مسلک پر قائم ہے زندگی میں اس کو فردوسی سے منسلک ہونے کا موقع نہیں ملا تو مرنے کے بعد ہی یہ آرزو پوری کر دی جائے تاکہ اس کا نام فردوسی کے نام سے جدا نہ رہے۔

باغ فردوسی کے قبرستان میں ایک عرصہ تک تین قبروں کی علامتیں نظر آتی رہیں۔ فردوسی کے ایک پہلو میں نوشابہ دوسرے میں زیبا رخ کے مرقدوں کا پتہ چلتا رہا۔ مگر آخر کار دو قبریں امتداد زمانہ سے مٹ گئیں اور صرف فردوسی کا مزار ظاہری صورت میں باقی رہ گیا۔ قبر کے نشانات رہے یا نہ رہے لیکن بات کہنے میں رہ گئی کہ فردوسی یوں کتنا ہی بدنصیب کیوں ہو مگر محبت کے معاملہ میں اس کی قسمت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی میں جن دو عورتوں کو چاہا ان میں ایک شاہنامہ کی محرک اور دوسری اس کی مبلغ ہوئی۔ فردوسی کے نام کی بقا ان کے کرداروں کی رہین منت ہے۔

وحشی محمود آبادی
مقبرہ گولہ گنج۔ لکھنؤ
۱۷ اپریل ۱۹۵۶ء



Rs. 5/-